قرارداد مقاصد سے اسلامی قانون تک

ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی

طاہر سنز

Marfat.com

Marfat.com

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ (الاعراف ۵۴)
(خبردار خلق اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے)

قرارداد مقاصد
سے
اسلامی قانون تک

مصنفہ

پروفیسر ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی پی ایچ - ڈی

تعارف: جناب (جسٹس) حمود الرحمٰن
مقدمہ: جناب مہدی علی صدیقی

ناشر
طاہر سنز
اردو بازار ——— کراچی

Marfat.com

(جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں)

پہلا ایڈیشن ———— اپریل ۱۹۸۱ء

تعداد ———— ایک ہزار

ناشر ———— طاہر سنز اردو بازار کراچی

پریس ———— یورپ پرنٹنگ پریس. کراچی

قیمت ———— ۳۰ روپے

باہتمام ———— عثمان غنی طاہر

طاہر سنز

اردو بازار ———— کراچی

Marfat.com

انتساب

- الحاج خواجہ ناظم الدین مرحوم (وزیر اعظم پاکستان)
جنہوں نے ۱۹۵۲ء میں قرار دادِ مقاصد پر مبنی اسلامی دستور کا مسودہ تیار کرایا
- مولوی تمیز الدین خاں مرحوم (صدر مجلس دستور ساز پاکستان)
جنہوں نے ۱۹۵۴ء میں گورنر جنرل کی جانب سے مجلس دستور ساز کی برطرفی کے حکمنامے کو عدالتِ عالیہ میں چیلنج کیا۔
- چوہدری محمد علی صاحب (وزیر اعظم پاکستان)
جنہوں نے ۱۹۵۶ء میں ملک کو اسلامی آئین دیا اور اسے اسلامی جمہوریہ بنایا۔
- مولانا ظفر احمد انصاری صاحب
جنہوں نے قرار داد مقاصد کی منظوری سے لے کر آج تک اسلامی دستور کی تدوین کے ہر مرحلے کو عبور کرنے میں ماہرانہ رہنمائی کی۔
- مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
جنہوں نے اسلامی تحریک کی رہنمائی کی، اسلامی دستور کی تیاری کے لئے عوامی مہم چلائی اور پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے اپنی آخری سانس تک جدوجہد کی۔

اس مملکت خداداد پاکستان اور یہاں بسنے والے مسلمانوں کے عظیم محسن ہیں۔
ہم اپنی یہ فرومایہ تصنیف ان محسنوں کے اسمائے گرامی سے معنون کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں بے حساب اجر عطا فرمائے۔ آمین

Marfat.com

Marfat.com

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۱	معروضات مصنف	۱
۲	تعارف جناب (جسٹس) حمود الرحمٰن	۴
۳	مقدمہ جناب مہدی علی صدیقی	۱۱
۴	تمہید	۱۷
	باب اوّل	
۴	قرارداد مقاصد — عوامی جدوجہد کی پہلی کامیابی	۲۸
۵	۱۹۵۰ء کی دستوری رپورٹ اور اس کا استرداد	۳۱
۶	۱۹۵۲ء کی دستوری رپورٹ — عوام کی تاریخی فتح	۴۶
۷	۱۹۵۴ء کا دستوری مسودہ اور اسمبلی کی برطرفی	۴۹
۸	۱۹۵۶ء کا دستور — عوامی امنگوں کا مظہر	۵۵
۹	۱۹۵۸ء کا مارشل لاء اور دستوری ڈھانچے کا انہدام	۶۲
۱۰	۱۹۶۲ء کا دستور اور اسلام وجمہوریت کی پامالی	۶۳

Marfat.com

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۱۱	گول میز کانفرنس اور اس کی سبوتاژ کاری	۷۰
۱۲	۱۹۶۹ء کا مارشل لا اور دستوری ڈھانچے کا انہدام	۸۱
۱۳	۱۹۷۰ء کے عام انتخابات اور علاقہ واریت کی بالادستی	۸۴
۱۴	بھٹو و یحییٰ کی مجیب سے محاذ آرائی	۹۳
۱۵	چھ نکاتی فارمولے سے عوامی لیگ کی دست برداری	۱۱۵
۱۶	شیخ مجیب الرحمٰن کی گرفتاری اور حوادث مابعد	۱۱۷
۱۷	۱۹۷۱ء کا مارشل لا اور بھٹو کا اپنے منشور سے انحراف	۱۳۰
۱۸	۱۹۷۲ء کا عبوری دستور ـ جمہوریت سے انحراف	۱۳۴
۱۹	قرارداد لاہور کی مضحکہ خیز تاویل	۱۴۷
۲۰	۱۹۷۳ء کا دستور اور اس کے نفاذ سے گریز کے نتائج	۱۵۳
۲۱	آئین میں پے در پے ترامیم ـ آئینی مفاہمت کے ساتھ بدعہدی	۱۶۸
۲۲	۱۹۷۷ء کے عام انتخابات اور بھٹو کے خلاف عوامی تحریک کا آغاز	۱۷۳
۲۳	۱۹۷۷ء کا مارشل لاء ـــــ ایک ناگزیر اقدام	۱۸۱
۲۴	آئینی مسائل ـــــ منزل بہ منزل	۱۸۷
۲۵	اسلامی قانون کا نفاذ ـــــ ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل	۲۰۴
	باب دوم	
۲۶	اسلامی نظام کی راہ میں رکاوٹیں۔	۲۱۰
۲۷	فرقہ پرستی	۲۱۱
۲۸	فقہی اختلافات کی حدود ـ قدیم فقہی مجموعوں کی تحدیدات	۲۱۷
۲۹	صوبہ پرستی	۲۲۶
۳۰	صوبائی خودمختاری میں اضافے کا مسئلہ	۲۳۲

Marfat.com

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
۲۴۱	صوبائی خودمختاری کے مضمرات	۳۱
۲۵۱	کراچی صوبہ کا مطالبہ	۳۲
۲۵۸	بڑی طاقتیں	۳۳
	باب سوم	
۲۶۴	مذہبی رہنماؤں کا کردار	۳۴
۲۶۹	سیاسی جماعتوں کا کردار	۳۵
	باب چہارم	
۲۸۴	پاکستان ناگزیر تھا	۳۶
۲۹۷	پاکستان ناگزیر ہے	۳۷
۲۹۹	کتابیات	۳۸

Marfat.com

Marfat.com

معروضاتِ مصنّف

پاکستان صرف ایک خطۂ ارض نہیں بلکہ دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کا مرکزِ کشش بھی ہے۔ حرمین اور القدس کے بعد دنیا کے مسلمان جس خطۂ زمین کے لیے تڑپ محسوس کرتے ہیں وہ ہمارا وطن عزیز ہی ہے کیونکہ اس نے، اپنی بہت سی خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اپنی زندگی کے نہایت مختصر دور میں بڑے بڑے تاریخ ساز کردار انجام دیے ہیں۔ اس نے تاریخ میں پہلی بار دنیا کے مسلمان ممالک کو ایک مرکز پر مجتمع کیا ہے۔

مسلمان ملکوں کے اس اتحاد نے سامراجی ممالک کی گرفت ان کی گردنوں کے گرد ڈھیلی کر دی ہے اور ایک خوشگوار مستقبل کا دروازہ ان پر وا کر دیا ہے۔ اس خوشگوار مستقبل کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے پاکستان عالم اسلام کی سب سے بڑی ضرورت ہے جس کے بغیر مسلمان ممالک ترقی و خوشحالی کے وہ ثمرات حاصل نہیں کر سکتے جو اس باہمی اتحاد کے بعد انہیں حاصل ہونے ہیں۔ تنہا یہ ضرورت اس امر کی متقاضی ہے کہ پاکستان ایک مضبوط اور متحد سیاسی وجود کی حیثیت سے قائم و دائم رہے۔

مگر بدقسمتی سے تنگ نظر اور نادان عناصر ابتدا سے اس کے وجود سے کھیل رہے ہیں پچھلے چند برسوں میں ان کی معاندانہ سرگرمیوں نے فی الواقعی اسے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ مشرقی پاکستان کا سقوط اسی نوع کے عناصر کی مذموم کوششوں کا شاخسانہ تھا۔ مگر اس سانحے کے باوجود بین الاقوامی برادری میں پاکستان کی ضرورت کم نہیں ہوئی ہے۔ آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ یہ ملک جتنا کچھ بھی اب رہ گیا ہے، قائم و دائم رہے۔

اس کا قائم و دائم رہنا فوج اور پولیس کے توپ و تفنگ کا محتاج نہیں بلکہ اس امر کا محتاج ہے کہ قوم اس کی اہمیت کو جانے اور سمجھے اور اس امر سے شعوری طور پر آگاہ ہو کر اس کا وجود عالمی سیاست کے پس منظر میں مسلمان اقوام کی کتنی اشد ضرورت ہے۔ خود اس کے حدودِ ارض

Marfat.com

میں سانس لینے والوں کے لئے بھی یہ کسی مثالی خطۂ امن سے کم نہیں جس میں خیبر سے کراچی تک ہر متنفس اپنے پڑوسی ملکوں کے کروڑوں باشندوں کے مقابلے میں آسودگی اور امن وعافیت کی زندگی سے بہرہ ور ہے۔ کوئی یہاں بھوک اور فاقے سے دم توڑتا دکھائی نہیں دیتا۔ کسی کی عزت وآبرو غیر محفوظ نہیں۔ کسی کے دین وایمان کو کوئی اندیشہ نہیں۔ کسی کو مراسم عبودیت بجالانے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ انسان کو اور کیا چاہیئے؟

اس کتاب کی تصنیف کی غائت نام ونمود کا حصول نہیں۔ داد وستد بھی اس کی تصنیف کا مقصد نہیں بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ اہلِ وطن کو پاکستان کی ملکی اور بین الاقوامی قدر وقیمت سے آگاہ کیا جائے تاکہ اہلِ وطن اسے کوتاہ بینوں اور نادانوں کی صرزلوں سے بچانے کی فکر کریں اور وطنِ عزیز ایک مضبوط و مستحکم ملک کی حیثیت سے قائم ودائم رہ سکے لہٰذا اللہ تعالےٰ سے صمیمِ قلب سے دعا ہے کہ وہ مصنف کی شکستہ وریختہ تحریریں اس کے قارئین کے لئے تاثیر دے تاکہ وہ مقصد حاصل ہو سکے جس کی خاطر یہ کتاب ضبطِ تحریر میں لائی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب میں آئینی تنازعات اور سیاسی حوادث کے تحلیل وتجزیے کے سلسلے میں بہت سے ایسے واقعات بیان کیے گئے ہیں جواب سے پہلے منظرِ عام پر نہیں آئے تھے یا جو بہت کم لوگوں کے علم میں تھے۔ انہیں ضبطِ تحریر میں لانے سے پہلے ان کی صحت وواقعیت کا حتی الامکان پوری طرح اطمینان کر لیا گیا ہے اور قارئین کے اطمینانِ خاطر کے لئے ان کے ماخذ وسند کے حوالے بھی درج کردیے گئے ہیں۔ کوئی واقعہ اگر ایک ہی تاریخ میں ملک کے تمام روزناموں میں شائع ہوا ہے تو ایسی صورت میں کسی مخصوص روزنامے کا حوالہ دینے کے بجائے تاریخ درج کردی گئی ہے تاکہ قاری جس اخبار کے ذریعے چاہے شرح صدر حاصل کرلے۔ ہاں ایسے واقعات کہ جن سے ہر خاص وعام آگاہ ہے حوالے درج کرنے سے احتراز کیا گیا ہے کیونکہ یہ کتاب پی ایچ۔ ڈی کا کوئی مقالہ نہیں ہے۔ حوالوں کی بھرمار قاری کے تسلسلِ مطالعہ میں خلل ڈالتی ہے۔

اس کتاب میں بعض سیاسی شخصیتوں کی "مخالفت" میں جو کچھ رقم کیا گیا ہے اس کا مقصد ان کی کردار کشی نہیں بلکہ واقعہ نگاری ہے۔ اور یہ واقعہ نگاری اس حد سے تجاوز کرنے نہیں دی گئی ہے جو کسی زیر بحث آئینی تنازعے یا سیاسی حادثے کے اسباب وعلل کے تعین کے لیے ضروری تھی ورنہ جن سیاسی شخصیتوں

Marfat.com

نے وطن عزیز کی سیاست میں تخریبی کردار ادا کیا ہے ان کی تخریب کاری کے واقعات ان سے بدرجہا زیادہ ہیں جتنے ان سطروں میں بیان کیے گئے ہیں۔ تاہم اگر کوئی بات بالکل غلط یا خلافِ واقعہ ثابت کر دی جائے تو وہ زیرِ نظر کتاب سے بلا تامل حذف کر دی جائے گی۔

اس کتاب کی تصنیف سے لے کر طباعت تک کے مختلف مراحل میں مصنّف کو متعدد بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کا تعاون حاصل کرنا پڑا ہے جس کے بغیر اسے مکمل کرنا ممکن نہ تھا۔ اس سلسلے میں مَیں پروفیسر مسلم سجاد صاحب کا ممنون ہوں جو اس کتاب کی تصنیف کا سببِ اوّل بنے۔ جناب مہدی علی صدیقی صاحب، ریٹائرڈ جج و پرنسپل اسلامیہ لا کالج کراچی، جناب خالد ایم۔ اسحٰق سابق ایڈوکیٹ جنرل سندھ اور جناب پروفیسر عبد الغفور احمد صاحب سابق سکریٹری جنرل پاکستان قومی اتحاد کا ممنون ہوں جنہوں نے مسودے پر نظر ڈالی اور اسے بہتر بنانے کے لئے مفید مشورے دیے۔ ادارۂ معارف اسلامی (اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ) کراچی کے سکریٹری جناب سید منور حسن کا مشکور ہوں جنہوں نے معارف کے کتب خانے سے استفادہ کرنے کی فراخدلانہ اجازت مرحمت فرمائی۔ اپنے ناشران طاہر سنز کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کی طباعت میں دلچسپی لی اور اپنے کالج کے شعبے کے رفقا جناب مرزا البشیر بیگ اور جناب محمد معین الدین کا کا احسان مند ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تصنیف سے لے کر طباعت تک ہر مرحلے میں میری معاونت کی۔ میں ڈاکٹر بلقیس جہاں اسسٹنٹ پروفیسر جغرافیہ کا ممنون ہوں جنہوں نے منسلکہ جغرافیائی نقشہ تیار کیا۔

مصنّف

کراچی

۳۰، نومبر ۱۹۸۰ء

Marfat.com

تعارف

جناب (جسٹس) حمود الرحمٰن

بی۔ اے، ایل ایل۔ بی (لندن)

بیرسٹر ایٹ لاء

ریٹائرڈ چیف جسٹس آف پاکستان

۱۔ معاصر دور کے واقعات پر قلم اٹھانا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ امکان رہتا ہے کہ معاصر واقعات سے مصنّف کی قربت اس کے مشاہدے کو دھندلا دے اور اس حقیقت پسندی کی راہ میں، جو ذاتی تعصبات اور ذہنی رکاوٹوں سے پاک ہو اور جو حقائق کی تعبیر کے لیے درکار ہوتی ہے، حائل ہو جائے۔

اپنی کتاب "قرار دادِ مقاصد سے اسلامی قانون تک" میں ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن نے ان خطرات کی، جن سے پاکستان کو اپنی زندگی کے سفر میں اب تک گزرنا پڑا ہے، تشخیص کی جرأت مندانہ کوشش کی ہے۔ مجھے اس کتاب کے مسودے کے مطالعے کا موقع ملا ہے اور میں اس شاندار کوشش پر ان کو مبارکباد دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

۲۔ جیسا کہ کتاب سے ظاہر ہوتا ہے، مصنف کا نظریہ یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کے پس منظر میں پاکستان (کا وجود میں آنا) ناگزیر تھا اور اس کا قائم رہنا بھی ناگزیر ہے۔ بشرطیکہ یہ ایک اسلامی مملکت کی حیثیت سے قائم رہے جہاں کے باشندے اپنی زندگیوں کو اسلامی قوانین کے سانچے میں ڈھال سکیں۔

وہ ان سارے نشیب و فراز کا سبب جن سے پاکستان کو گذرنا پڑا ہے، گذشتہ

Marfat.com

حکومتوں کے پاکستان کو ایک ایسی مملکت بنانے سے جس میں اسلامی قوانین نافذ ہوں، انحراف کو قرار دیتے ہیں۔

۳۔ کچھ ضرور نہیں کہ ہر شخص ان سے اتفاق کرے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جن نشیب و فراز سے پاکستان کو گذرنا پڑا ہے وہ مختلف عوامل کے مجموعی اثرات کا نتیجہ ہوں لیکن مسئلے کے جس پہلو کو ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن نے اجاگر کیا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا نقطۂ نظر قابلِ لحاظ ہے۔ فاضل مصنف نے پاکستان میں دستور سازی کی تاریخ کی مدد سے جس میں اسلامی دستور کی تیاری کی راہ میں حائل کی جانیوالی رکاوٹوں، مجلس دستور ساز کی من مانی اور غیر قانونی تنسیخ اور ایسے وقت میں جبکہ اسلامی دستور واقعتاً بنایا جا چکا تھا، مارشل لار کے نفاذ اور نتیجتہً خود دستور کی تنسیخ کے واقعات شامل ہیں، قابلِ ستائش طریقے پر اپنا نقطۂ نظر قائم کیا ہے۔

۴۔ کتاب کا پہلا حصہ جس میں سیاسی واقعات کے تاریخی رُخ کو پیش کیا گیا ہے بڑی حد تک بے نقص ہے۔ اس میں مفید معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ ان معلومات کو مناسب طریقے پر بہ ترتیب زمانہ پیش کیا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے ان واقعات سے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ بعض اعتبار سے قابلِ بحث خیال کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں قاری خود فیصلہ کر سکتا ہے۔ (مثلاً) یہ سوال قابلِ بحث ہے کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد عوامی لیگ کے چھ نکات قابلِ گفت و شنید رہے تھے یا نہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ انتخابات کے بعد عوامی لیگ یا اس کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ کسی ایک نکتہ سے بھی دست بردار ہو سکتے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ وقت کے گذرنے کے ساتھ چھ نکات میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس مرحلے پر پہنچ کر شیخ مجیب اور ان کی عوامی لیگ اپنی اکثریت کے سامنے بے بس نہیں ہو چکی تھی؟

Marfat.com

۵۔ یہ تاریخی تجزیہ بہرحال ہمیں اُس دور کے اہم سیاسی واقعات کا قابلِ تحسین اور صحیح جائزہ فراہم کرتا ہے۔ جس محنت اور جانفشانی سے اس قدر مفید تاریخی حقائق کی جمع آوری کی گئی ہے وہ بلاشبہ لائقِ صد ستائش ہے۔ ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن نے ان حقائق کی جمع آوری کر کے اور اس کو عام قاری کے لیے اس قدر لائقِ مطالعہ انداز میں پیش کر کے قوم کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ مستقبل کے مؤرخ کے لیے بھی یہ کتاب کارآمد ثابت ہوگی۔

۶۔ کتاب کے بقیہ دو حصے پاکستان کے مسائل اور سیاسی پارٹیوں کے کردار سے بحث کرتے ہیں۔ پاکستان کو توڑنے میں سیاسی پارٹیوں کا جو کردار رہا ہے اس پر مصنف کی تنقید ناروا نہیں ہے۔ ان پارٹیوں کے بوئے ہوئے نااتفاقی اور افتراق کے بیج انحلال کا ہی رجحان پیدا کر سکتے ہیں اور ملک کے اتحاد کو یا جتنا کچھ اب یہ باقی رہ گیا ہے، صرف پارہ پارہ کر سکتے ہیں۔ فاضل مصنف نے خوب کیا ہے کہ اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ پاکستان کو متحد رکھنے والی قوت صرف اسلام ہے۔ اسی میں اس کی نجات ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ پاکستان کا قیام محض تاریخ کا حادثہ نہ تھا اور نہ محض سیاسی فتح بلکہ یہ اس برصغیر کے مسلمانوں کی اپنے جداگانہ وجود کو باقی رکھنے کی شدید خواہش کا نتیجہ تھا۔ یہ بات اُس وقت تک ممکن نہ تھی جب تک مسلمان اپنے لیے ایک جداگانہ وطن نہ بناتے جہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں اور جہاں قرآن و سنت کے احکام پر عمل ہو رہا ہو۔

۷۔ (لہٰذا) ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن قابلِ ستائش ہیں کہ انہوں نے پاکستان میں رونما ہونے والے سیاسی واقعات کو بہترین طریقے پر پیش کیا ہے۔ ملک کے مسائل اور تقاضوں کو اجاگر کیا ہے، تخریبی قوتوں سے خبردار کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اتحاد میں قوت مضمر ہے اور یہ کہ اتحاد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے

Marfat.com

جب پاکستان میں اسلامی طرزِ معاشرت و حکومت ہو۔ یہ کتاب نہ صرف مفید معلومات بہم پہنچاتی ہے بلکہ قاری کو دعوتِ فکر دیتی ہے کہ وہ اُن زخم خوردہ واقعات پر غور و فکر کرے جن سے اس ملک کو گذرنا پڑا۔ کتاب کا طرزِ نگارش جاذب ہے اور توقع ہے کہ عام کتب بین کے لیے یہ دلچسپ ثابت ہوگی اور اُسے ان لوگوں کی حمایت کے لیے آمادہ کرے گی جو ملک کی سالمیت کو برقرار رکھنے میں کوشاں ہیں اور خواہشمند ہیں کہ یہ صحیح خطوط پر ترقی کرے۔ میں اس کتاب کی سفارش اور تعریف کرنے میں کسی قسم کا تامل محسوس نہیں کرتا۔

PREFACE

Mr. (Justice) Hamoodur Rahman
B.A., LL.B. (London)
Barrister-at-law
Retired Chief Justice of Pakistan

1. Writing about contemporary events is by no means an easy task, because the author's close association with these events is likely to cloud his vision and may well prevent him from the objectivity that is desirable in the evaluation of data free from personal prejudices and inhibitions. Dr. Hafizur Rehman has in his book "Qarardade Maqasid se Islami Qanoon tak" made this bold attempt to evaluate the hazards through which Pakistan has had to pass in its journey so far. I have had the advantage of reading the manuscript of this book and must compliment him on his splendid effort.

2. His thesis appears to be that in the context of the history of the Indo-Pak sub-continent, Pakistan was inevitable and that its remaining in existence will be equally inevitable if it exists as an Islamic State wherein the people inhabiting it can order their lives according to Islamic laws. He traces all the vicissitudes through which it has had to pass to the recalcitrance of the previous regimes to make Pakistan an Islamic state governed under the Islamic Laws.

3. One may or may not agree with him. The vicissitudes of Pakistan may have been due to the cumulative effects of a number of factors but the aspect sought to be high-lighted by Dr. Hafizur Rehman cannot be brushed aside. It merits consideration. The learned author has admirably developed his point of view by tracing the history of constitution making in

Pakistan, the hurdles that were placed in the way of making an Islamic constitution, the illegal and arbitrary dissolution of the constituent assembly and the imposition of Martial Law with the consequential abrogation of the constitution itself when an Islamic constitution was, in fact, framed.

4. The first part of the book, which deals with the historical aspect of the political events is by and large unexceptionable. It contains a wealth of useful information conveniently arranged in chronological sequence. Inferences sought to be drawn by the learned author, from these events, however, may appear to be in some respects controversial but the soundness thereof will be a matter for the readers to judge. The question as to whether the six points of the Awami League remained negotiable even after the 1970 elections is debatable. Many seem to take the view that after the elections neither the Awami League nor its leader Sheikh Mujibur Rahman was in any position to give up any one of them. In fact the six points went on increasing as time passed. Had not at that stage Mujib and his Awami League become a slave to their majority?

5. The historical analysis nevertheless furnishes us with an admirable and accurate account of the main political events of the period. The labour and industry devoted to the collection of such useful historical data is highly commendable. Dr. Hafizur Rahman has rendered a great service to the Nation by collecting this data and presenting them in such a readable manner for the general reader. It will also be useful for future historians.

6. The other two parts of the book deal with the problems of Pakistan and the role of the Political parties. The author is not unjustifiably critical of the part played by political parties in the dismemberment of Pakistan. The seeds of dissension and disunity

Marfat.com

sown by them can only help to breed fissiparous tendencies and subvert the unity of the country or what is now left of it. The learned author has done well to emphasise that Islam is the only cementing force in Pakistan and in Islam alone lies the salvation of Pakistan. There can be no two opinions about it. Pakistan was not a mere accident of history nor just a political victory but the outcome of the ardent desire of the Muslims of this sub-continent to maintain their separate identity as Muslims. This they could not do unless they carved out for themselves a homeland wherein the Islamic laws would be in force and the injunctions of the Holy Quran and Sunnah would be followed.

7. Dr. Hafizur Rehman is, therefore, to be complimented for the excellent manner in which he has traced the political developments in Pakistan, highlighted its problems and needs, cautioned against the forces of disruption and indicated that in unity lies strength and that such unity can only be achieved by laying the foundations of an Islamic polity in Pakistan. This book not only furnishes useful information but also invites the reader to ponder upon the traumatic experiences through which this country has had to pass. Written in a readable manner it should prove of interest to the lay reader; it should prove of interest to him and help him to support those who seek to maintain the integrity of the country and see it develop on proper lines. I have no hesitation in commending the book.

مقدّمہ

جناب مہدی علی صدیقی

(ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج، پرنسپل اسلامیہ لا کالج کراچی و مدیر ماہنامہ MESSAGE)

پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد ایک دلچسپ اور طویل داستان ہے۔ اس جدوجہد کے آغاز کا زمانہ متعین کرنا اس لئے مشکل ہے کہ مختلف ذہنوں میں قیام پاکستان کا مقصد ہی معین نہیں۔ ہندوستان میں مسلمان اپنی حکومت کے عروج کے زمانے میں بھی اقلیت میں تھے مگر مسلمان حکمرانوں نے کبھی اسلام کے اصولوں سے بہ بانگ دہل اختلاف کی جرأت نہ کی ماسوائے مغل شہنشاہ اکبر کے جس نے ایک مصنوعی مذہب اور مسلک اختراع کر کے رائج کرنے کی نامحمود کوشش کی اور ایسی کوششوں کا جو حشر ہوا کرتا ہے وہی ہوا۔ مسلمانوں کی حکومت کے اختتام تک شریعت اسلامی کے بنیادی احکام ضرور نافذ تھے مگر جسے ہم اور آپ آج کل اسلامی نظام سمجھتے ہیں اس کا دور تک پتہ نہ تھا۔ بادشاہت خود ایک غیر اسلامی ادارہ ہے اور رہے گا۔ ہمیں شرعی توانین کے بجائے غیر اسلامی قوانین کے مسلّط کئے جانے کا خواہ کتنا ہی صدمہ ہو، بادشاہت کے خاتمے کا کوئی غم نہیں۔ بہر حال تاریخ نے مسلمانانِ ہند کو غلامی کی زنجیروں میں ضرور جکڑ لیا مگر ایک فائدہ ضرور پہنچایا کہ اسلامی نظام کے قیام کے لیے حالات کو سازگار کر دیا۔ انگریزوں کی غلامی اور ہندوؤں کی بالادستی کو مسلمانانِ ہند نے کبھی بہ طیب خاطر قبول نہیں کیا اور ہمارے علماء نے اصلاح معاشرہ کی کوشش کبھی ترک نہ کی۔ یہ صحیح ہے کہ اسلامی نظام کا کوئی واضح تصور عامتہ المسلمین کے ذہنوں میں کبھی موجود نہ تھا مگر کم سے کم اسلامی حکومت یا مسلمانوں کے ہاتھ میں ایک بار پھر زمام حکومت آجانے کی بے پناہ آرزو ہر دانا اور بینا مسلمان کے دل میں موجزن تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی چند ایسے بزرگ ہمیشہ موجود رہے جو اس آرزو کی تکمیل سے زیادہ مسلمانوں کے تزکیۂ نفس اور تہذیب اخلاق کو اپنی مساعی کا مقصد

بنائے ہوئے تھے۔ ان حضرات نے شخصی زندگی میں اخلاق و آداب کی اہمیت پر زور دیا جس سے غیر مسلم بڑی حد تک متاثر ہوتے گئے۔ یہ صوفیائے کرام ہی تھے جنہوں نے ہندوستان میں اسلام کی ترویج اور تبلیغ کی خدمات انجام دیں لیکن اسلامی حکومت کے قیام کی جانب کوئی خاص توجہ نہ کی۔ جن لوگوں نے ان حالات پر غور کیا ہے ان کی رائے ہے کہ اسلامی نظام حکومت کے قیام کی راہ میں جو رکاوٹیں پیش آتی رہیں ان میں ایک بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ اسلام ہندوستان میں صوفیا کے ذریعے سے پھیلا جنہوں نے حکومت، اقتدار اور دنیوی اور اجتماعی ترقی کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا مسلمان خواص اور پھر عوام کو یہ محسوس ہوتا گیا کہ اگر اسلام کی ترقی اور مسلمانوں کی ہمہ جہتی، فلاح اور بہبود مقصود ہے تو انہیں ملک میں اقتدار کے حصول کے بغیر کامیابی نہ ہو سکے گی۔ یقیناً اسلام صوفیائے کرام کا ممنون ہے کہ ان ہی کی سعی اور تبلیغ سے ہندوستان کے غیر مسلم باشندے جوق در جوق حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے گئے لیکن ان بزرگوں کی تعلیمات میں شخصی اخلاق، تواضع، انکسار، فروتنی، قناعت، صبر و رضا اور ایسی خوبیوں پر غیر معمولی توجہ کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کی اجتماعی پستی اور زبردستی کی جانب سے عوام کی توجہ ہٹ گئی اور حکومت اور سلطنت کے چلے جانے پر وہ قانع نظر آنے لگے۔ عام طور پر علم کی کمی نے یہ بھی نقصان پہنچایا کہ ان بزرگوں کی تلقین ہی کو معلومات کا درجہ دیا جانے لگا اور جب خود صوفیا کے بھیس میں فقرا اور سجادہ نشینوں نے عوام کو غلط راستے پر ڈال دیا تو عبادات کی جگہ چلہ کشی، شب بیداری کے وظائف اور اوراد نے، عرس کہ میلاد اور قوالی اور اعراس وغیرہ نے لے لی۔ پہلے صوفیا عالم باعمل ہوا کرتے تھے مگر مسلمانوں کی بدبختی سے دو الگ الگ ادارے قائم ہو گئے یعنی مدارس اور خانقاہیں اور ان دونوں کا حلقہ اثر الگ الگ ہوتا گیا۔ علما نے پھر بھی حکومت کے جانے اور دنیوی پستی کے اسباب پر غور کیا اور اس کے ازالے کی حتی المقدور کوشش کی۔ چنانچہ پوری انیسویں صدی میں جتنی تحریکیں ہندوستان کی آزادی کی غرض سے شروع کی گئی تھیں اور بیسویں صدی کے نصف اول میں پروان چڑھیں ان سب میں علمائے اسلام نے بھرپور حصہ لیا۔ کسی صوفی، کسی سجادہ نشین کسی گروہ مشائخ کو کبھی اس کا خیال نہ آیا کہ اسلام کے عہد زریں میں ہمیشہ دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلنے والے ہی مسلمانوں کو بام عروج پر لے کر گئے تھے اور اسلام کے اسباب زوال میں بے عملی اور گوشہ نشینی کو بہت دخل رہا ہے۔ اس تجزیے سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ مسلمانانِ ہند کی صحیح رہنمائی

Marfat.com

کے لئے صرف علمائے کرام ہی کوشاں رہے۔ زمانے اور تعلیم کی ترقی کے ساتھ ہی نئے ادارے وجود میں آتے گئے جن میں معاشی، سیاسی، تعلیمی اور دوسرے سماجی ادارے شامل تھے۔ انگریزوں کی غلامی میں ہندوستان کی اور قومیں بھی شریک حال تھیں اور آزادی کی کوششوں میں انہوں نے نہایت ہوشیاری سے مسلمانوں کو اپنا آلۂ کار بنانا چاہا۔ ایک حد تک یہ اپنے اپنے نقطۂ نظر کا فرق ہے کہ آزادی کا حصول مقدم تھا یا مسلمانوں کی ہمہ جہتی ترقی کے ساتھ اسلامی نظام کا قیام؟ جو علما اور لیڈر صرف حصول آزادی کو مقدم سمجھتے تھے اور بڑی حد تک ہندوؤں کے ساتھ متحدہ ہندوستان میں اس نعمت سے بھرپور فائدہ حاصل کرنے کا تصور رکھتے تھے انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کا آخر وقت تک ساتھ دیا۔ مگر جن لوگوں نے محسوس کر لیا کہ اس دور آزادی میں جب جمہوریت کے اصول ہی آزادی کی بنیاد ہیں اکثریت کا استبداد بھی مسلمانوں کو زیردست رکھنے کا ارادہ کئے ہوئے ہے تو وہ رفتہ رفتہ مسلمانوں کے لئے ہندوستان ہی میں علیحدہ خطۂ زمین کے حصول کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ یہ خیال اکثریت اور اقلیت کے پس منظر میں، مطالبۂ پاکستان کو مسلمانوں کا جمہوری حق سمجھتا اور گردانتا تھا لیکن جو ژرف نگاہیں ان بیرونی عوامل کے پیچھے ایک اصولی فلسفے کو کارفرما دیکھتی تھیں انہوں نے پاکستان کی بنیادیں دو قومی نظریے پر رکھیں۔ یہ خیال صحیح نہیں کہ یہ نظریہ قائداعظم یا علامہ اقبال کے دماغوں کی پیداوار تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی جسے بہت شروع سے مسلمان زعما نے محسوس کر لیا تھا مگر علیحدہ خطے کے مطالبے کی شکل اقبال کی تجویز نے دی اور اس مطالبے کی تکمیل قائداعظم کی جدوجہد کی منت پذیر ہے۔ دو قومی نظریہ تو بہت پہلے صاف الفاظ میں سرسید نے غالباً علیگڈھ کی تحریک کے زمانے میں ہی پیش کر دیا تھا کہ "ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں ایک ہندو اور دوسرے مسلمان"۔ یقیناً دو قومی نظریہ کو عملی صورت میں اختتام تک پہنچانے کا سہرا علامہ اقبال اور حضرت قائداعظم کے سر ہے مگر اس نظریے کو فکری اور دینی لحاظ سے نہ صرف واضح بلکہ مستحکم کرنے کا فریضہ بلاشرکتِ غیرے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے انجام دیا۔ یہ صحیح ہے کہ بادی النظر میں ان کا یہ کام قیام پاکستان کے بعد جاذبِ توجہ بنا لیکن جن لوگوں نے مولانا محترم کی کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی کشمکش" کے ہر دو حصص یکے بعد دیگرے پڑھے ہیں وہ تسلیم کریں گے کہ بنیادی فلسفۂ پاکستان کو ان کی تحریروں سے صحیح وضاحت ملی اور

Marfat.com

تقویت نصیب ہوئی۔ انہوں نے یقیناً تحریک پاکستان کو لے کر اٹھنے والی مسلم لیگی قیادت کے اسلامی شیون سے انحراف پر سخت گرفت کی لیکن کسی بھی نوبت پر دو قومی نظریہ اور اسلامی حکومت کے قیام سے اختلاف نہیں کیا اور اس تقدیر میں کہ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے اور کن خطوط پر پاکستان میں قائم ہونی چاہیئے ان کی تحریریں اور تقریریں، بہ الفاظ دیگر ان کی پوری تحریک، تمام ایسی تحریکوں میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اس تحریک کو قیام پاکستان کے بعد ہی سے لادینی سیاست نے دبانے اور ہر نوبت پر زک دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ زیر نظر کتاب اسی کشمکش کی داستان بیان کرتی ہے۔ اس میں ان تمام مرحلوں کا تفصیل سے ذکر ہے جن سے اسلامی نظام کی تحریک گزری ہے اور ان عوامل سے جو اس جد وجہد میں کارفرما رہے، سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ فکری سطح پر بھی ان مشکلات کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے جو اسلامی نظام کے تصور کو عوام کے ذہن نشین کرانے میں اس نظام کے لئے کام کرنے والوں کو پیش آتی رہی ہیں۔ صرف فہرست ابواب اور ابواب کے عنوانات کے دیکھنے سے ہی قاری کو اندازہ ہو جائے گا کہ فاضل مصنف نے اس تمام داستان کو اس کتاب میں سمیٹ کر پیش کر دینے کی کوشش میں کس قدر محنت کی ہے۔ مجھے خاص طور پر اس کتاب کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ مصنف کے ذہن میں اسلامی نظام کا جو تصور ہے وہ بنیادی طور پر وہی ہے جو عام طور پر زبان زد عام اس فقرہ میں ادا ہوتا ہے کہ اسلام ایک نظریۂ حیات یا ضابطۂ حیات ہے۔ یہ فقرہ مسلمان اپنے مذہب کی ہمہ جہتی کی کیفیت کو ظاہر کرنے کے لئے اور دوسرے مذاہب سے ممیز کرنے کے لئے بولتے تو رہتے ہیں لیکن بغیر غور و فکر کے کہ اس کے کیا مضمرات ہیں، یہ رواجی تصور حقیقت سے کس قدر دور ہے اس کا اندازہ اس کتاب کو پڑھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نظام اسلام کا قیام تقاضا کرتا ہے کہ اللہ کی حاکمیت کو نہ صرف ایمان لا کر اور عبادت کر کے تسلیم کیا جائے بلکہ صرف اسی کے کلام اور اس کے رسول کی حدیث اور عمل کو دنیوی قانون کا سرچشمہ تسلیم کر کے صدق دل سے قبول کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی ہر اس قانون اور ضابطے کی پیروی سے انکار کیا جائے جو کسی اور کے احکام اور اقتدار پر مبنی ہو۔ قرارداد مقاصد سے آج تک جتنی دستوری جد وجہد رہی وہ اسی غرض سے رہی کہ اسلام کو نظام زندگی کی حیثیت سے اسلامی قانون کی شکل میں ملک میں نافذ، جاری اور ساری کیا جائے۔

Marfat.com

اس سلسلے میں دو دلچسپ حقیقتیں رہ رہ کر سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسلامی نظام کی مخالفت زیادہ تر تعلیم یافتہ طبقے کی ہی جانب سے ہوتی رہی جنہوں نے بعض مواقع پر اس کا بھی خیال نہ کیا کہ اس طرح وہ خود اسلام کو بھی ہدفِ تنقید بنا رہے ہیں۔ دوسری، واقعہ یہ ہے اور یہ بڑی ستم ظریفی تھی کہ اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کے لئے قدرت نے سرزمین وہ عطا کی جہاں فقط روائتی اسلام کا دور دورہ تھا۔ مشرقی پاکستان میں ایک طبقہ اور مغربی پاکستان میں معدودے چند ہی زعما اسلامی نظام کے صحیح مضمرات سے واقف تھے۔ چنانچہ خیال فرمایئے کہ منیر رپورٹ میں اسلام اور اسلامی نظام کے ساتھ جو ظلم کیا گیا وہ ایک نہایت ہی ذہین اور تعلیم یافتہ شخصیت کے دماغ کی پیداوار تھا۔ ان ہی حضرت نے اعلیٰ عدالتی اصولوں کا جس طرح مذاق اڑایا وہ تمیزالدین خاں بنام حکومتِ پاکستان کے فیصلے سے ظاہر ہے اور وہ ہنوز یہ ثابت کرنے پر سارا زورِ قلم اور ذہنی صلاحیت صرف کر رہے ہیں کہ حضرت قائد اعظم پاکستان کو اسلامی حکومت نہیں صرف مسلمانوں کی حکومت بنانا چاہتے تھے۔ گویا یہ کوئی دلیل اس امر کی ہے کہ مسلمانوں کو جہاں اقتدار حاصل ہو وہاں ماخذِ قانون قرآن وسنت کے علاوہ کچھ اور ہو سکتا ہے اور کسی دوسرے نظام قانون کی پیروی حرام نہیں ہے ؏

برین عقل و دانش بہ باید گریست

ذرا سوچنے کی بات ہے کہ اگر نظریۂ پاکستان کا جزو اعظم نظامِ اسلام نہیں تو پھر کسی علیحدہ مملکت کے مطالبے کی بنیاد ہی کیا باقی رہتی ہے؟ خدا کا شکر ہے کہ عوام اسلام سے اتنی بے پناہ محبت رکھتے ہیں کہ وہ رفتہ رفتہ نظام اسلامی کے مضمرات کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتے جائیں گے اور ان دانشوروں سے لاکھ درجہ افضل ہیں جن کی عقلیں لادینی علم اور مغربی تہذیب کی خیرہ کن روشنی سے چکاچوند ہو کر تقریباً اندھی ہو چکی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ اور اسی قسم کے حضرات اسلامی نظام کے اور خصوصاً اسلامی قانون کے نفاذ کے اس قدر شدید مخالف کیوں ہیں؟ دراصل مذہب کا اعتقادی اور عباداتی پہلو صرف اخلاق اور اقدار کی تہذیب کرتا ہے مگر قانون کی گرفت زندگی کے ہر شعبے اور انسانی عمل کے ہر پہلو پر مکمل اور مضبوط ہوتی ہے اور اس میں کسی غیر معتبر تاویل اور فرار کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اسلامی قانون کے نفاذ سے حاکمیت صرف اللہ

Marfat.com

کی رہ جائے گی اور یہی دنیوی اقتدار کے پرستاروں کو بہر قیمت گوارہ نہیں۔

مجھے طولِ کلام اور موضوع سے کسی قدر ہٹ جانے کی معذرت کے ساتھ یہ عرض کرنا باقی ہے کہ اس کتاب میں جس تفصیل اور ترتیب سے اسلامی نظام اور قانون کے نفاذ کی جدوجہد کا بیان ہے وہ مجھے ابھی تک اردو کی کسی اور کتاب میں پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ فاضل مصنّف ایک سائنس داں ہیں۔ طبع سلیم اور ذوقِ صحیح رکھتے ہیں۔ یہ کتاب تحریک اسلامی سے ان کی وابستگی کا بیّن ثبوت ہے۔ میں اُن کی عرق ریزی اور معاملہ فہمی کو خراج تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اپنے اصل موضوع کے بیان میں انہوں نے بہت سی ایسی معلومات فراہم کردی ہیں جو سیاسی اور دستوری جزئیات تک پر مشتمل ہیں اور شاید کہیں اور بہ مشکل یکجا ملیں گی۔ امید ہے کہ یہ کتاب اس موضوع کے طلبا اور عام قاری کو یکساں مطمئن کر سکے گی۔

Marfat.com

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

تمہید

پاکستان کا قیام ناگزیر تھا۔ اسے بننے سے روکا نہیں جا سکتا تھا اور یہ خواص کی نہیں بلکہ عوام کی مرضی سے قائم ہوا۔ مسلمان زعماء نے مستقبل میں آزاد ہونے والے ہندوستان میں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے کئی امکانی حل پیش کئے۔ حل پیش کرنے والے سب کے سب مسلمانوں کے مخلص رہنما تھے۔ مگر مسلمان قوم نے ان کے پیش کردہ تمام حلوں میں سے پاکستان کے قیام کو پسند کیا اس لئے کسی کی جانب سے جبر و دباؤ کے بغیر یہ مطالبہ بہت تھوڑے عرصے میں مسلمان قوم کے دلوں کی دھڑکن اور ان کی آرزو بن گیا۔ مسلمان اس کے لیے جان و مال قربان کرنے اور اپنا مولد و مسکن ترک کرنے پر بھی تیار ہو گئے۔ بعض مسلمان زعماء پاکستان سے کم تر درجے کے تحفظات کو بھی قبول کرنے پر تیار تھے بلکہ ان میں سے بہت سے اس مطالبے کو قابل ترجیح سمجھنے کے باوجود اسے ممکن الحصول نہیں سمجھتے تھے۔ مگر مسلمان قوم نے یہ ملک بنوا کے دکھا دیا۔ تاریخی جبریت اسی کو کہتے ہیں۔ یہ تاریخی حوادث کا لازمی اور ناگزیر نتیجہ ہوا کرتی ہے جسے رونما ہونے سے روکنا ممکن نہیں ہوتا۔

پاکستان کے قیام سے دو بہت بڑے فائدے حاصل ہوئے۔ اس خطۂ ارض کے مسلمانوں کو ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے مقابلے میں فروغ اور ترقی کا بے مثال موقع نصیب ہوا۔ تعلیم میں، تجارت میں، صنعت میں، عدالت میں بینکاری میں، صحافت و انشاپردازی میں، طب و دواسازی میں، درآمدات و برآمدات

Marfat.com

ہیں ، افواج میں، سیاست وسفارت میں اور دیگر شعبوں میں انہیں جس قدر عروج حاصل ہوا اور ان شعبوں کے ذریعے جس قدر خوشحالی یا آسودگی حاصل کرنے کا موقع ملا اس کا تصور بھی اُن کے احاطۂ خیال میں نہ آسکتا تھا اور آج یہ بات پورے شرح صدر کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ پاکستان کا مسلمان ہندوستان کے مسلمان سے بدرجہا بہتر حالت میں زندگی گذار رہا ہے بلکہ ہندوستان کے دیگر باشندوں سے بھی زیادہ آسودہ حال ہے۔

دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس کے قیام سے عالم اسلام کو، اسلام کا نام لینے اور اسلام کو سربلند کرنے کے لئے حوصلہ ملا۔ مسلمان ممالک کا اتحاد ایک آرزو کے دائرے سے نکل کر ایک جیتی جاگتی حقیقت بن گیا۔ آج دنیا کے ۴۲ مسلمان ممالک اپنا ایک جداگانہ بین الاقوامی پلیٹ فارم رکھتے ہیں ورنہ مسلمان تو وہ ضرور ہوتے مگر عرب وعجم کے گروہوں اور دھڑوں میں منقسم ہوتے۔

اتنے بڑے بڑے فائدے حاصل کرنے کے باوجود اس ملک کے زمام کاروں نے اس کے ساتھ اس باغباں کا سا طرز عمل اختیار کیا جو اپنے باغ کے پیڑوں میں سیرابی کا عمل عین ایسے مرحلے میں روک دے جب پیڑ نے پھل دینے شروع کر دیئے ہوں۔ اس کی اس تغافل پسندی سے پیڑ کے پتے اور اس کی ٹہنیاں سوکھنے لگ گئی ہوں اور یہ کیفیت دیکھ کے کم فہم اور سطح بیں یہ سمجھنے لگ جائیں کہ پیڑ کی عمر طبیعی یہیں تک تھی یا زمین اس کے لئے موافق نہیں تھی۔

شجر پاکستان کی آبیاری سرچشمۂ اسلام سے ہوئی تھی مگر بدقسمتی سے پاکستان کو ایسے باغبان نہ ملے جو اس ضرورت کو جانتے اور سمجھتے۔ سیاسی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ پاکستان کو مخلص اور لائق قیادت نہ ملی۔ ایسی قیادت جو اسے خلق خدا کی امانت سمجھتی اور اسے دارالاسلام بناتی۔ اس کام کی طرف سے بدترین قسم کی غفلت برتی گئی۔ اسلام کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ملک میں ایک نظریاتی خلا پیدا ہوگیا جسے گذشتہ تہائی صدی سے صوبہ پرستی، مذہبی تفرقہ پسندی اور لادینیت پُر کر رہی ہے اور یہ سب پاکستان کی اسلامی اساس کو کمزور کئے دے رہی ہیں۔

Marfat.com

اسلام کے ساتھ مخاصمت یا اغماض و تغافل کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف اس بات کو تسلیم کرنے میں انیس[۱۹] ماہ لگا دیئے گئے کہ ملک کی نظریاتی اساس اسلام ہوگی۔ اس دوران کوشش اس امر کی کی جاتی رہی کہ انگریزی دور کے ۱۹۳۵ کے ایکٹ کو ہی جزوی تبدیلیوں کے ساتھ برقرار رکھا جائے۔ جب یہ کوشش نہ چلی تو ناچار ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد پاس کی گئی جس کے ذریعے اس امر کا اقرار کیا گیا کہ ملک کا آئین قرآن و سنت کے مطابق ہوگا۔

اس قرارداد کو منظور کرنے کے بعد پیہم کوشش کی جاتی رہی کہ جو آئین بنے وہ اس قرارداد کے بموجب نہ ہو بلکہ لادینیت پر مبنی ہو۔ پاکستان کے ایک دردمند اور مخلص وزیر اعظم الحاج خواجہ ناظم الدین مرحوم نے ۱۹۵۲ء میں قرارداد مقاصد پر مبنی اسلامی آئین کا مسودہ تیار کرایا تو انہیں وزارت عظمٰی کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ ان کے بعد آنے والے وزیر اعظم نے عوامی دباؤ سے مجبور ہو کر ان ہی کی سفارشات کے بموجب دستور تیار کرایا تو دستور ساز اسمبلی کو برطرف کر کے اس کام کو برباد کر دیا گیا۔ پھر چودھری محمد علی صاحب نے اس مسودے پر مبنی دستور بنایا تو اسے کام کرنے نہیں دیا گیا اور مارشل لا نافذ کر کے اسے منسوخ کر دیا گیا۔

۱۹۵۸ء کے مارشل لا کے ذریعے پارلیمانی جمہوریت کے اس ڈھانچے کو ہی توڑ دیا گیا جس پر اس دستور کی تدوین عمل میں آئی تھی۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۹ء تک ملک پر بے آئین حکمرانی قائم رہی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات نے ملک کو بے آئینی سے آئین کی طرف لوٹنے کا موقع فراہم کیا۔ اس موقع پر ملک کے حکمراں نے ایک مفاد پرست سیاست داں کے ساتھ مل کر ملک کی اکثریتی سیاسی جماعت — عوامی لیگ — کے ساتھ محاذ آرائی اختیار کی اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ عوامی لیگ ملک کا آئین چھ نکاتی فارمولے کی بنیاد پر بنانا چاہتی ہے۔ اس نے اس فارمولے کو اگر ترک نہ کیا تو اسے اقتدار کا حق دار بننے نہیں دیا جائے گا۔ یہ ایک صریح فریب کاری تھی جو اس ملک کے ساتھ کی گئی کیونکہ عوامی لیگ چھ

Marfat.com

نکات ترک کرنے پر صدق دل سے آمادہ تھی ۔ اسے ترک کرنا بہ ہمہ وجوہ خود اس کے مفاد کا تقاضہ بن چکا تھا ۔ اس نے اپنی دست برداری بصورت قرطاس وقلم حکومت کے حوالے کر دی مگر اسے پردۂ اخفا کے پیچھے چھپا دیا گیا اور اقتدار کی آئینی طور پر حق دار اس جماعت پر علیحدگی پسندی کا الزام دھر کے آئین سازی کا راستہ اور اقتدار کی منتقلی کا دروازہ بند کر دیا گیا ۔

جائز حقداروں کے ہاتھ میں اقتدار کی منتقلی روکنے کا نتیجہ خون ریزی کی صورت میں رونما ہوا جس نے بالآخر ملک کو دولخت کر دیا ۔

اس محاذ آرائی کے دوران رونما ہونے والے واقعات و شواہد نے یہ حقیقت منکشف کی کہ یہ ساری جنگ جو ملک کے اتحاد و استحکام کے نام پر لڑی جا رہی تھی پس پردہ طور پر ملک کو توڑنے کی خاطر تھی ۔

۱۹۷۱ء کے حوادث نے ملک کو آدھا کر دیا اور اس آدھے ملک پر ایک بے آئین اور مستبد حکومت قائم کر دی ۔ ۱۹۷۲ء میں ایک عبوری آئین بنایا گیا مگر وہ بھی اپنی روح اور عمل کے اعتبار سے شخصی فرماں روائی کا نظام تھا ۔ جمہوریت سے وہ اتنا ہی متغائر تھا جتنا سابقہ بے آئین نظام حکمرانی تھا ۔

۱۹۷۱ء کے بعد کے یہ سب حوادث ایک منتخب حکومت کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوئے ۔ اسلام تو رہا ایک طرف' پارلیمانی جمہوریت کی بحالی بھی خواب و خیال نظر آنے لگی ۔ پھر بدقت تمام ۱۹۷۳ء کا آئین بنا ۔ یہ آئین وفاقی پارلیمانی نظام کے قیام شہری حقوق، صوبوں اور مرکز کے مابین اختیارات کی تقسیم اور دیگر امور میں بہت قابل قدر دستاویز تھا ۔ اسے نفاذ میں آنے کا موقع ملتا تو بڑے صحت مند نتائج برآمد ہو سکتے تھے ۔ کم سے کم اتنا تو ضرور ہوتا کہ مرکز اور صوبوں کے مابین کشاکش ختم ہو جاتی ۔ مگر اسے ۲۴ گھنٹے سے زیادہ نافذ نہیں رہنے دیا گیا ۔ اس دوران ملک میں عملاً شخصی فرماں روائی قائم رہی ۔ یہ صورت حال ۱۹۷۷ء تک برقرار رہی ۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک ۔ ۳۰ سال کی یہ مدت ایک صدی کی ایک تہائی مدت ہے ۔ تہائی صدی تک ملک کا سیاسی نظام اسلام سے محروم رہا ۔ یعنی اسلامی خطوط پر معاشرے کی تعمیر کا کام رکا رہا ۔ ۳۰ سالوں میں ایک نئی نسل تیار ہوگئی ۔ یہ نئی نسل اسلامی نظام کی برکات کو سمجھنے کے معاملے میں ایسی تاریکی میں رہی جیسے کوئی بچہ کسی تاریک غار میں پیدا ہوا ہو اور اسے کچھ پتہ نہ ہو کہ دنیا اور اس کی جگمگاہٹ کیا چیز ہوتی ہے لہذا اس کے ذہن نے تاریکی میں پائی جانے والی خباثتوں ۔ صوبہ پرستی اور لادینیت کو ہی روشنی سمجھ لیا اور اس کے لئے اپنے دل و دماغ کے دریچے وا کر دیئے ۔

آئین کے مسلمہ تقاضوں کو نظر انداز کرنے سے اور مستبد شخصی فرمان روائی مسلط کرنے سے نت نئے آئینی مسئلے نمودار ہوتے چلے گئے ۔ بنیادی حقوق کے تحفظ کا مسئلہ وفاقی پارلیمانی جمہوریت کے قیام کا مسئلہ وزیر اعظم کے اختیارات کی تحدید کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ اور ان مسائل میں حکومت اور عوام کے مابین ایک آویزش اور کشاکش شروع ہوگئی ۔ اس دوران حکومتیں متعدد بار بدلیں مگر تقریباً ہر حکومت کا طرز عمل ان مسائل میں ایک سا رہا ۔ اس لئے کشمکش بھی یکساں طریقے پہ جاری رہی ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج حکومت اور عوام دو مستقل بالذات متحارب گروہ بن چکے ہیں ۔ بعض سیاسی جماعتوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور بعض ایسے مسائل جن سے عوام نا آشنا تھے انہیں اہم بنا کر ان کے ذہن پر مسلط کر دیئے ہیں ۔ اور ان کی مدد سے اس باہمی محاذ آرائی کو سنگین تر کر دیا ہے ۔

پاکستان کی آج تک کی آئینی تاریخ اسی کش مکش اور محاذ آرائی کا نام ہے ۔

ملک میں ۱۹۷۱ء کے بعد قائم ہونے والی حکومت پہلی منتخب حکومت تھی ۔ اس لئے جمہوریت کی بحالی کی سب سے زیادہ توقعات اس سے وابستہ کی گئیں مگر اس حکومت نے عوام کو بحیثیت مجموعی سب سے زیادہ مایوس کیا ۔ اس کا انداز بے حد استبدادی اور جابرانہ تھا ۔ اور آئین اور اس کے تحفظات اس کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ رکھتے تھے ۔ حکمراں کی انانیت پسند ذہنی رَو ملک

Marfat.com

کا قانون تھی۔ اس لئے عوام سب سے زیادہ اس دور میں ستائے گئے اور جو لوگ ستائے جانے کی زد میں نہ آئے وہ بے یقینی اور عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا ہوئے۔ اس لئے جب ۱۹۷۷ء کے انتخابات کا اعلان ہوا تو عوام اسے اکھاڑ پھینکنے کے لئے یکجان ہو گئے۔ حکمران طبقے نے یہ رنگ دیکھا تو تبدیلی حکومت کے اس آئینی راستے میں رکاوٹ بن کے کھڑا ہو گیا اور انتخابات میں دھاندلیوں کا طوفان کھڑا کر کے پھر سے اقتدار اپنے قبضے میں لے لیا۔ بپھرے ہوئے عوام نے اس کوشش کی سخت مزاحمت کی۔ ناچار مصالحت و مفاہمت کی میز بچھائی گئی مگر مفاہمت کو پس پردہ طور پر، خوں ریزی کے ذریعے ناکام بنانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ ملک کو ایک خوں ریز خانہ جنگی کی دہلیز پر پہنچا دیا گیا۔

ناچار فوج نے مداخلت کی۔ دونوں فریقوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا اور ملک کو خانہ جنگی سے بچایا۔ یہ ایک ناگزیر اقدام تھا۔ یہ اقدام بظاہر خلاف آئین تھا۔ مگر حقیقتاً آئین سے بالاتر۔ ملک کا وسیع تر مفاد اس کا متقاضی تھا۔ عدالت نے بھی اس اقدام کو سند جواز عطا کیا۔

موجودہ حکومت "عاشقان جمہوریت" کی نگاہ میں ایک غیر جمہوری حکومت ہے۔ اس سے جس کا جتنا جی چاہے اختلاف کرے۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے برسر اقتدار آنے کے بعد ایک ۲۸ سال پرانی دستاویز —— قرار داد مقاصد —— کو جس پر سابقہ حکمرانوں کی غفلت اور بے توجہی کی گرد جم گئی تھی طاق نسیاں سے اتارا اور اس کی گرد صاف کی ہے۔ اس کی بنیاد پر اسلامی قانون کی تدوین اور نفاذ کا کام شروع کیا ہے۔ اگر کوئی بدگمان طبیعت ہے تو موجودہ حکمرانوں کی نیت پر جتنا جی چاہے بدگمانی کرے مگر عمل کے بارے میں کسی بدگمانی کی گنجائش نہیں جو کام کیا جا رہا ہے وہ اسلام کی واضح اور مسلّمہ تعلیمات پر مبنی ہے۔ مستند فقہا اور ماہرین قانون کے ذریعے سارا کام کرایا جا رہا ہے۔ متجدّدین کی خدمات حاصل نہیں کی گئی ہیں۔ کوئی نیا اسلام

تصنیف نہیں کیا جارہا ہے۔ سابقہ حکمراں تو نیت کے بھی خراب تھے اور عمل کے بھی بد اطوار۔ انہوں نے اسلام کو یا تو نظر انداز کیا یا اس کا نیا ایڈیشن تصنیف کرانا چاہا۔

بہرکیف؛ اس وقت جو کام کیا جارہا ہے وہ عین مقصود و مطلوب تو ہے مگر اس کی راہ میں کئی سنگ ہائے گراں حائل ہیں۔ انہیں دور کرنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر اسلامی قانون کے نفاذ کا کام آسان ثابت نہ ہوگا۔ صوبہ پرستی نے قوم کی معتدبہ تعداد کے ذہنوں پر ڈیرہ جما لیا ہے اور اس نے پاکستان کے جواز پر سے ان کے اعتماد کو متزلزل کر دیا ہے۔ مذہبی فرقہ پرستی نے اسلام کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے۔ ہر فرقہ صرف اپنی فقہ کو اسلام سمجھتا ہے اور اسے نافذ کرانے کے لئے جنگ آزما ہے۔ یہ حقیقت اسے دکھائی نہیں دیتی کہ اسلامی قانون کا نفاذ، خواہ وہ کسی بھی فقہ کے بموجب عمل میں آرہا ہو، پہلے سے نافذ العمل کسی فقہ کو بے دخل کرنے کی خاطر عمل میں نہیں لایا جا رہا، بلکہ نظام کفر کو بے دخل کرنے کی خاطر کیا جارہا ہے۔ یہ کام تو اس قدر مسعود و مبارک ہے کہ خواہ کسی بھی فقہ کے بموجب ہو ہر فرقے کے لوگوں کو صدق دل سے خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ مگر ان میں اتنی وسعت نظری کہاں؟ بڑی طاقتیں اسے ٹکڑے کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔ یہ سب بڑی بڑی رکاوٹیں ہیں جو اسلامی نظام کی راہ میں حائل ہیں۔ ملک اگر محفوظ اور اس کے عوام اگر متحد و ہم خیال نہ رہے تو یہ کوشش کس طرح بارآور ہو سکے گی؟ ان سب دشواریوں کو دور کرنا ضروری ہے۔

پاکستان میں بسنے والی قوم کی غالب اکثریت مسلمان ہے اور غیر مسلموں کی تعداد اتنی مختصر ہے کہ مسلمانوں کو اپنے فکر و عمل کے دائرے میں ان کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہاں کے مسلمان اسلام کے لئے خدمات انجام دینے کے لئے یکجان نہیں ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

Marfat.com

مسلمان ہونے کے باوجود ان کی قوت مختلف دھڑوں میں منقسم کیوں ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ قیادت اگر لادینی ہو تو لوگ بلا تفریق مسلک اس کے مقتدی بن جاتے ہیں لیکن قیادت اگر دینی ہو تو مسلک کا اختلاف ایسی قیادت کی اقتداء کرنے میں عذر بن جاتا ہے؟ کیا فی الواقعی فقہی اختلافات کی موجودگی اس کی وجہ ہے یا اس کی وجہ علماء کرام اور مذہبی رہنماؤں کی تنگ نظری ہے؟ یا اس کی وجہ کچھ اور ہے؟

صوبائی خود مختاری کا مسئلہ بعض حلقوں کی طرف سے ایک بار پھر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اس مطالبے کے حاملین کا نظریہ یہ ہے کہ پس ماندہ صوبوں کی ترقی کے لئے صوبائی خود مختاری میں اضافہ ضروری ہے لہذا دفاع، خارجہ پالیسی اور کرنسی کے ماسوا تمام محکمے صوبوں کے حوالے کر دیئے جائیں۔ صوبائی خود مختاری یعنی مرکز اور صوبوں کے مابین اختیارات کی تقسیم کا مسئلہ دنیا میں پہلی بار صرف پاکستان کو درپیش نہیں ہوا۔ ہر وفاقی ملک میں آئین بناتے وقت یہ مسئلہ درپیش ہوتا رہا ہے اور اسے وفاقی آئین کے مسلمہ تقاضوں کے بموجب خوش اسلوبی کے ساتھ حل کر دیا گیا۔ یہ کہیں بھی ہنگامہ پروری اور ایجی ٹیشن کا موجب نہیں بنا مگر ہمارے ملک کے بعض سیاسی رہنما یہ مسئلہ جلسے جلوسوں میں کھڑے ہو کے نعرہ بازوں اور تماشہ بینوں سے ہاتھ اٹھوا کے طے کرانا چاہتے ہیں۔ پیچیدہ آئینی مسئلے طے کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہوا کرتا۔ اگر آئینی مسئلے طے کرنے کا بھی یہی طریقہ ہے تو آج ہم اپنی یونیورسٹیوں میں سیاسیات کی تعلیم پر لاکھوں روپے کس لئے خرچ کر رہے ہیں؟ اس سے کم رقم میں عامیوں کو اکٹھا کر کے یہ مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ بہر کیف سیاسی لیڈر جیسا کچھ بھی طرز عمل اختیار کریں، ماہرین سیاست کا فرض ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنی ماہرانہ رائے عوام کے سامنے پیش کریں۔ وہ اس امر کا بھی جائزہ لیں کہ اس وقت صوبوں کو جو اختیارات حاصل ہیں ان سے ہمارے سیاسی لیڈر انہیں کتنا فائدہ پہنچا چکے ہیں۔ اس امر کا بھی جائزہ لیں کہ جن صوبوں میں صوبائی انتظامیہ

Marfat.com

سرداروں یا جاگیرداروں کے زیر اثر ہے۔ ان میں عوام کی فلاح وبہبود صوبائی انتظامیہ کے اختیارات میں اضافہ کرنے میں مضمر ہے یا کمی کرنے میں؟

پارلیمانی جمہوریت کا ڈھانچہ اور اسے چلانے کے لئے سیاسی جماعتوں کا نظام ہم نے برطانیہ سے سیکھا ہے۔ یہ دونوں چیزیں وہاں کامیابی سے چل رہی ہیں۔ مگر ہمارے یہاں ناکام دکھائی دیتی ہیں۔ ایشیا اور افریقہ کے دیگر ملکوں نے بھی اسی طرح سے جمہوریت کا ڈھانچہ اور سیاسی جماعتوں کا نظام کسی نہ کسی یورپی ملک سے مستعار لیا ہے۔ مگر ان ملکوں میں بھی جمہوریت اور سیاسی جماعتوں کا نظام اسی طرح ناکام ہے جس طرح ہمارے ملک میں۔ صرف ہندوستان میں اسے کامیاب سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہاں پارلیمانی جمہوریت ۳۰ سال تک بغیر کسی رکاوٹ کے تواتر کے ساتھ چلتی رہی تھی مگر ۱۹۸۰ء کے انتخابات میں کانگرس کی شکست کے بعد جو انتشار و بحران رونما ہوا اس نے یہ حقیقت کھول کر رکھ دی کہ جو چیز کامیابی سے چل رہی تھی وہ پارلیمانی جمہوریت نہ تھی بلکہ محض کانگریس کی دیرینہ مقبولیت اور چند سربرآوردہ لیڈروں کا غیر معمولی اثر و احترام تھا۔ جس دن یہ دونوں چیزیں ختم ہوئیں قیادت کا خلا پیدا ہوگیا اور اس نے پارلیمانی جمہوریت کی کامیابی کا بھرم اٹھا دیا۔

صرف اتنا ہی نہیں کہ ان سب ملکوں میں جمہوریت ناکام دکھائی دیتی ہے بلکہ آزادی سے جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں وہ بھی ان میں سے کسی ملک میں پوری نہ ہو سکیں۔ نظم و ضبط کا وہ معیار بھی برقرار نہ رہ سکا جو سابقہ بدیسی حکمران قائم کر گئے تھے۔ اس صورت حال نے ملک کے تمام سیاسی مفکرین اور زعماء کے سامنے ایک نشان استفہام پیدا کر دیا ہے کہ اس ناکامی کی وجوہات کیا ہیں؟ کیا جمہوریت ہمارے مسائل کا حل نہیں ہے۔ یا ہم اسے چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتے؟

اس نوع کے تمام نکات میں مندرجہ ذیل دو نکتے سب سے اہم ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ہمیں لائق قیادت کس طرح نصیب ہو؟ یہ صرف پاکستان کا نہیں بلکہ دنیا کے

ہر ملک کی ضرورت ہے ۔ جن ملکوں میں ملوکیت نہیں ہے وہاں اس کے لئے پرچہ رائے دہی کو قیادت کے حصول کا ذریعہ بنایا گیا ہے ۔ ہم نے بھی اپنے ملک میں اسے بہت اہمیت دی ہے ۔ ایوب خان کے خلاف جن دو نکات پر جنگ لڑی گئی ان میں سے ایک بالغ رائے دہی کے نظام کی بحالی کا مطالبہ تھا ۔ ۱۹۷۰ء میں یہ نظام بحال ہو گیا مگر اس کے بموجب ہمیں جو قیادت ملی وہ لائق قیادت ثابت نہ ہو سکی ۔ اس قیادت نے پہلے تو پاکستان کو آدھا کر دیا اور پھر اس آدھے پاکستان پر ایک مستبد حکومت قائم کر دی ۔

یہ تو نقصان کا صرف ایک پہلو ہے ۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ قوم کے چوٹی کے افراد ۔ عظیم المرتبت ماہرین قانون ، بلند پایہ ماہرین تعلیم ، مسلّم الثبوت ماہرین مالیات اور اعلیٰ درجے کے منصوبہ بند ، منتظم اور سیاسی مفکر اسمبلیوں میں پہنچنے سے محروم رہے اور یہ سرفرازی عام طور پر درجہ اسفل کے افراد کے مقدر میں آئی ۔ اس نوع کا نتیجہ اس سے پہلے کے تمام انتخابات میں رونما ہوا ۔ اس خرابی کی آخر وجہ کیا ہے ؟ بالغ رائے دہی کے طریقے کی خرابی ؛ یا چوٹی کے افراد کا سیاست سے گریز ؟ یا انتخابات کے ذریعہ قیادت کے حصول کے طریقے کی ناکامی یا نظام جمہوریت یا کچھ اور ؟ یہ صورت حال صرف پاکستان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ایشیا کے تقریباً ہر ملک میں اسی طرح سے قیادت نچلے درجے کے افراد کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے اس لئے یہ مسئلہ بنیادی غور طلب امور میں سے ہے جس کا جواب اچھی قیادت کے حصول کے لئے تلاش کیا جانا ضروری ہے ۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ پاکستان صرف اپنی تخلیق کے لیے اسلام کا محتاج نہ تھا بلکہ اپنے وجود کے تحفظ کے لئے بھی اسلام کا محتاج ہے ۔ اس کا تحفظ محض کسی وفاقیت یا پارلیمانی جمہوریت یا چند آئینی ترمیمات میں مضمر نہیں ہے بلکہ سرچشمۂ اسلام سے سیرابی حاصل کرنے میں مضمر ہے ۔ وفاقیت یا پارلیمانی جمہوریت

کی اہمیت صرف اس قدر ہے کہ یہ وحدانی اور صدارتی طرز حکومت کے مقابلے میں ہمارے لئے ایک ایسا انتظامی ڈھانچہ ہے جس سے ہم مانوس ہیں لہٰذا ملک کا انتظام اسی ڈھانچے پر استوار کرکے بہتر طور پر چلا سکتے ہیں۔ اس کام کے لئے ایسی قیادت مطلوب ہے جو لائق بھی ہو اور صالح بھی ہو۔ گویا قیادت کا معیار اہلیت زیادہ اہمیت کا حامل مسئلہ ہے۔ محض طریقۂ انتخاب پر زور دینے سے ہم اپنی جمہوریت پسندی کی داد تو ضرور حاصل کرلیں گے مگر لائق اور صالح قیادت حاصل نہ کرسکیں گے۔ لہٰذا طریقۂ انتخاب میں ایسی اصلاح ہونی ضروری ہے۔ جو ہمیں مطلوبہ قیادت فراہم کرسکے۔

زیر نظر کتاب کی تصنیف کا مقصد ان ہی بنیادی امور کا جائزہ لینا ہے۔ پاکستان کے وسیع تر مفاد کو ذہن میں رکھ کے کوشش کی جارہی ہے کہ قرارداد مقاصد کی منظوری سے لے کر آج تک کے ایسے امور کا جو آئین سازی سے متعلق تھے اور جو اسلامی نظام کے قیام کے لئے منفی یا مثبت اہمیت رکھتے تھے یا رکھتے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے اور مذکورہ بالا آئینی اور سیاسی مسائل کے بارے میں کچھ گذارشات پیش کی جاسکیں۔ اسلامی نظام کی راہ میں حائل دشواریوں کی نشان دہی کی جائے اور پاکستان کے وجود پر نئی نسل کے اعتماد کو مستحکم کیا جائے۔

یہ کام اس وجہ سے بہت ضروری ہے کہ ہماری حیثیت ان لوگوں کی سی ہے جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے ایک کشتی بنائی ہو اور ساحل کو چھوڑ کر کشتی کا سفر اختیار کیا ہو۔ ایسی کشتی کی حفاظت اس میں سوار ہر شخص کا فرض ہے ورنہ ہماری غفلت سے کشتی کو نقصان پہنچ گیا تو ہم ان لوگوں سے بد تر حالات سے دوچار ہوں گے جو آج ساحل پر کھڑے ہیں۔ اس کے برعکس ہم نے کشتی کی حفاظت کی تو یاران ساحل کے لئے قابل رشک بن جائیں گے۔

Marfat.com

باب اوّل

قرارداد مقاصد ــ عوامی جدوجہد کی پہلی کامیابی

پاکستان بننے کے بعد آئینی تبدیلیوں کے میدان میں کرنے کا پہلا کام یہ تھا کہ اس امر کا اعلان کیا جاتا کہ پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی مملکت بنایا جائے گا۔ یہ کام اس وجہ سے ضروری تھا کہ برطانوی عہد میں برصغیر میں ۱۹۳۵ء کا ایکٹ (دستور) نافذالعمل تھا۔ یہ ایک شہنشاہی آئین تھا۔ پاکستان کو ایک آزاد اسلامی مملکت بنانے کے لئے اس ایکٹ کی جگہ پر ایک نیا دستور بنانا اولین آئینی ضرورت تھا۔ بھارت نے بھی ایک نئے آئین کی تدوین کی اس ضرورت کو محسوس کیا۔ اس نے آزادی کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ برطانوی آئین کی جگہ نیا آئین بنانا شروع کیا اور اسے دو سال کے اندر مکمل کر کے نافذ کر دیا مگر پاکستان کے قیام کے بعد نظر آنے لگا کہ ارباب حکومت اس کام کی اہمیت سے گریزاں یا غافل ہیں۔ وہ اسے کافی سمجھتے ہیں کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں صرف اتنی ترمیمات پر اکتفا کریں جس سے برطانوی حکومت کی چھاپ اس آئین پر سے ختم ہو جائے۔ اس کے بعد یہی ایکٹ پاکستان کا مستقل دستور ہو۔ مگر یہ پاکستان کے مقصد سے بدعہدی اور گریز کی صورت تھی۔ اس اندیشے کو اس ملک میں سب سے پہلے مولانا شبیر احمد عثمانی رح اور مولانا ابوالاعلےٰ مودودی رح نے محسوس کیا۔ مولانا مودودی نے اس اندیشے کی بنا پر اپریل ۱۹۴۸ء میں کراچی میں ایک جلسہ عام منعقد کیا اور اس میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ حکومت کم سے کم اس بات کا اعلان کر دے کہ پاکستان کو اسلامی مملکت بنایا جائے گا۔

مولانا کا مطالبہ چار نکات پر مبنی تھا[۱] انہوں نے اس جلسے کے بعد اس مطالبے کے حق میں ایک ملک گیر تحریک شروع کی اور ملک کے طول و عرض میں جلسے کر کے اس مطالبے کے حق میں قرار دادیں منظور کرا کے حکومت کو بھجوائیں۔

حکومت مطالبۂ نظام اسلامی سے گھبرا گئی۔ اس نے مطالبے کا زور توڑنے کے لئے مولانا مودودی کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ ان دنوں پاکستانی فوج اور پاکستانی رضاکار کشمیر کو بھارت کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے کشمیر میں جہاد میں سرگرم کار تھے۔ مولانا کی ذات سے نہایت گمراہ کن طور پر یہ بات منسوب کی گئی کہ وہ جہادِ کشمیر کو حرام ٹھیراتے ہیں۔ مولانا کی ذات سے منسوب کردہ من گھڑت فتوے کی اطلاعاتی اداروں کے ذریعے خوب تشہیر کی گئی۔ اس سے مولانا کی ذات کو کچھ نہ کچھ نقصان تو ضرور پہنچا کہ کچھ لوگ ان سے بدگمان ہو گئے۔ مگر اس سے زیادہ نقصان جہاد کے محاذ پر خود پاکستان کو پہنچا۔ بہر کیف یہ پروپیگنڈہ بھی انہیں اپنی مہم سے نہ روک سکا تو ۴ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو مولانا مودودیؒ میاں طفیل محمد اور مولانا امین احسن اصلاحی کو گرفتار کر کے ملتان سینٹرل جیل میں بند کر

---

[۱] چار نکاتی مطالبے کا مکمل متن یہ ہے:۔

۱۔ پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور حکومت پاکستان کی کوئی حیثیت اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی مرضی اس ملک میں پوری کرے۔

۲۔ پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہے۔

۳۔ وہ تمام قوانین جو اسلامی شریعت کے خلاف اب تک جاری رہے ہیں منسوخ کئے جائیں گے اور آئندہ کوئی قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو شریعت کے خلاف ہو۔

۴۔ حکومت پاکستان اپنے اختیارات ان حدود کے اندر رہ کر استعمال کرے گی جو شریعت نے مقرر کر دی ہیں۔

دیا گیا جہاں وہ ۱۹ ماہ تک مقیّد رہے۔ مولانا اور ان کے رفقاء کی گرفتاری کے بعد بھی نظام اسلامی کا مطالبہ جاری رہا۔ اور ملک بھر سے اتنی بھاری تعداد میں مراسلے اور محضر نامے حکومت کے پاس بھیجے گئے کہ حکومت کو اس کا ریکارڈ رکھنے کے لئے علیحدہ سے اسٹاف مقرر کرنا پڑا۔

حکومت کے اندر مولانا شبیر احمد عثمانی نظام اسلامی کے لئے کوشاں رہے انہیں اندرونی محاذ پر لادینی خیالات رکھنے والے ارباب حکومت سے سخت اور مایوس کن مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلامی نظام کے لئے ملک گیر دباؤ کے آگے آخر کار حکومت کو سپر انداز ہونا پڑا اور طے ہوا کہ دستور ساز اسمبلی میں ایک قرارداد اس مضمون کی منظور کی جائے گی کہ ملک کا آئین اسلامی تعلیمات کے مطابق ہوگا۔ قرار داد کا مضمون تصنیف کرنے کی ذمہ داری مولانا شبیر احمد عثمانی کے سپرد کی گئی۔ اسے اسمبلی میں پیش کرنے سے پہلے خیال کیا گیا کہ مولانا مودودی کی رضامندی حاصل کر لی جائے چنانچہ قرار داد کا مسودہ مولانا کے پاس جیل میں بھیجا گیا۔ مولانا نے جب اس پر اطمینان کا اظہار کر دیا تو قرار داد ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو دستور ساز اسمبلی پاکستان میں منظور کروائی گئی۔ اس قرار داد میں اس امر کا اقرار کیا گیا تھا کہ حاکمیت اللہ تعالٰی کی ہے لہٰذا پاکستان کا آئین اسلام کے مطابق ہوگا اور مسلمانان پاکستان کو اس لائق بنایا جائے گا کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اسلام کی تعلیمات کے مطابق بسر کریں[1]

---

[1] قرار داد مقاصد کا مکمل متن درج ذیل ہے۔

"چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلا شرکت غیرے حاکم مطلق ہے اور اس نے جمہور کی وساطت سے مملکت پاکستان کو اختیار حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لئے نیابتاً عطا فرمایا ہے اور چونکہ یہ اختیار حکمرانی ایک مقدس امانت

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

اس قرار داد کی منظوری کے بعد ملک بھر میں اطمینان اور مسرت کا اظہار کیا گیا کیوں کہ اس کی منظوری کے بعد سے پاکستان کی مملکت نظری طور پر ایک اسلامی مملکت بن گئی تھی۔ اس قرار داد کی حیثیت مملکت کے لئے وہی تھی جو کسی غیر مسلم کے لئے اسلام قبول کرنے میں کلمہ کی ہوتی ہے۔

۱۹۵۰ء کی دستوری رپورٹ اور اس کا استرداد

اس کے بعد کا مرحلہ دستور سازی کا تھا۔ قرار داد مقاصد کے بموجب اسلامی

(بہ پچھلے صفحہ کا حاشیہ مسلسل)

ہے لہٰذا جمہور پاکستان کی نمائندہ یہ مجلس دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد اور خود مختار مملکت پاکستان کے لئے ایک دستور مرتب کیا جائے۔

(الف) جس کی رو سے جملہ حقوق و اختیارات حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے۔

(ب) جس میں اصول جمہوریت وحریّت ومساوات ورواداری اور عدلِ عمرانی کو جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔

(ت) جس کی رُو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جو قرآن مجید اور سنت رسول میں متعین ہیں، ترتیب دے سکیں۔

(ث) جس کی رو سے اس امر کا قرار واقعی انتظام کیا جائے کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبوں پر عقیدہ رکھ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔

(ج) جس کی رو سے وہ علاقے جو اب پاکستان میں داخل ہیں یا شامل ہو گئے ہیں اور

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خطوط پر دستور مرتب کرنے کے لئے حکومت نے قرآن وسنت کے ماہرین پر مشتمل تعلیمات اسلامی بورڈ تشکیل دیا۔ اس میں مولانا ظفر احمد انصاری، مفتی محمد شفیع اور دیگر بلند پایہ علماء شامل کئے گئے۔ ایک اور کمیٹی بنائی گئی جس کی سپرد یہ کام ہوا کہ وہ اسمبلی میں پیش کرنے کے لئے دستور کا مسودہ مرتب کرے اور اسلامی تعلیمات کے بورڈ کی سفارشات کو اس طریقے پر سموئے کہ دستور کا خاکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو۔ دستور کا مسودہ تیار کرنے والی یہ کمیٹی بنیادی اصولوں کی کمیٹی کہلائی۔ اس کا مرتب کردہ دستوری مسودہ ۷ ستمبر ۱۹۵۰ء کو منظر عام پر آیا۔ حکومت کی طرف سے دعویٰ

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ مسلسل)

ایسے دیگر علاقے جو آئندہ پاکستان میں داخل یا شامل ہو جائیں ایک وفاق بنائیں جس کے ارکان مقرر کردہ حدود اربعہ و متعینہ اختیارات کے تحت خود مختار ہوں۔

(ح) جس کی رو سے بنیادی حقوق کی ضمانت کی جائے اور ان حقوق میں قانون و اخلاق کے ماتحت مساواتِ حیثیت و مواقع، قانون کی نظر میں برابری، عمرانی اقتصادی اور سیاسی عدل، اظہار خیال، عقیدہ، دین، عبادت اور ارتباط کی آزادی شامل ہو۔

(خ) جس کی رو سے اقلیتوں اور پس ماندہ و پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا قرار واقعی انتظام کیا جائے۔

(د) جس کی رو سے وفاق کے علاقوں کی صیانت، اس کی آزادی اور اس کے جملہ حقوق کا جن میں اس کے بحر و بر اور فضا پر سیادت کے حقوق شامل ہیں، تحفظ کیا جائے۔ تاکہ اہل پاکستان فلاح و خوشحالی کی زندگی بسر کر سکیں اور اقوام عالم کی صف میں اپنا جائز و ممتاز مقام حاصل کر سکیں اور امن عالم کے قیام اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود میں کما حقہ اضافہ کر سکیں۔

Marfat.com

کیا گیا کہ کہ" اس رپورٹ کی تیاری کے بعد اسلامی ریاست کا نصب العین پورا ہو گیا۔ مگر پاکستان کی ملت اسلامی اسے دیکھ کر سخت مایوس ہوئی کیونکہ وہ سرتا پا سیکولر طرز کا دستوری خاکہ تھا۔ اسلام کے متعلق اس کے اندر سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ ہر مسلمان کے لئے قرآن کی تعلیم لازمی ہوگی۔ اس میں تعلیمات اسلامی بورڈ کی ایک بھی سفارش کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ دوسری افسوسناک بات یہ تھی کہ اس میں شہریوں کے لئے اتنی شہری آزادیاں بھی تجویز نہیں کی گئی تھیں جتنی کی ضمانت ایک عام قسم کے جمہوری ملک میں دی جاتی ہے۔ دستوری مسودہ میں لکھا گیا تھا کہ صدر مملکت جب چاہے اسمبلی سے پوچھے بغیر ہنگامی حالت کا اعلان کر سکتا ہے اور ہنگامی حالت کا اعلان کرکے، تحریر، تقریر، اجتماع اور نقل وحرکت کی آزادی حکومت سلب کر سکتی ہے۔ صدر مملکت صوبائی گورنر، وزرا اور ارکان اسمبلی قانون اور عدالت کے دائرے سے باہر ہیں۔ حکومت جب چاہے نقص امن کے اندیشے کے تحت کسی کو بھی گرفتار کر سکتی ہے۔ بڑے سرکاری افسران کے خلاف بھی صدر مملکت کی منظوری کے بغیر کوئی مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔ حبس بے جا کے خلاف حکومت کی مرضی کے بغیر ہائیکورٹ سے رجوع نہیں کیا جا سکتا وغیرہ وغیرہ۔

اس سے بھی زیادہ خراب بات یہ تھی کہ دستور میں ترمیم کے لئے اس قدر کٹھن راستہ تجویز کیا گیا تھا کہ دستور میں ترمیم کرنا جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہو سکے گا۔ جب آپ ان کے تجویز کردہ طریقہ کار کو خود ملاحظہ فرمائیں وہ طریقہ کار رپورٹ کی دفعہ ۱۳۴ میں یوں مذکور ہے۔

"اگر کسی ایوان (ایوان عام یا ایوان بالا) کی ایک تہائی یا ایک تہائی سے زیادہ ممبروں کی طرف سے نوٹس موصول ہو جس میں اس امر کی اجازت طلب کی گئی ہو کہ دستور میں ترمیم کے سلسلے میں ان کی تحریک کو تمام صوبوں میں گشت کرایا جائے اور اس پر غور کیا جائے۔ اگر

Marfat.com

اسے اکثریت کی طرف سے منظور کر لیا جائے تو اسے دوسرے ایوان کے پاس غور کے لئے بھیجا جائے جب دوسرا ایوان بھی اس کی اجازت دے دے تو اسے اس ایوان کے صدر کی جانب سے جس ایوان میں یہ تحریک پیش کی گئی تھی صوبوں میں بھیج دیا جائے۔ ہر صوبائی مقننہ کا صدر جس کے پاس یہ تجویز بھیجی جائے اپنے ایوان کا فیصلہ اس ایوان کے صدر کے پاس بھیج دے جس کی طرف سے یہ تجویز بھیجی گئی ہو۔ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے فیصلے کا انحصار اکثریت رائے پر منحصر ہوگا۔ اگر صوبوں کی اکثریت تجویز کے حق میں رائے دے تو اسے دوبارہ اس ایوان کے ایجنڈے پر رکھا جائے جس میں یہ تجویز (ابتداءً) پیش کی گئی تھی۔ اگر اس ایوان کی دو تہائی اکثریت کی حاضری اور ووٹ دینے سے یہ تجویز منظور ہو جائے تو اسے دوسرے ایوان میں ایسی ہی منظوری کے لئے روانہ کر دیا جائے۔ اگر دوسرا ایوان بھی ایسی ہی اکثریت سے منظوری دے دے تو ترمیم کی منظوری مکمل ہو جائے گی۔"

ترمیم کے اس طریقہ کار کے کٹھن ہونے کا احساس خود کمیشن کے ارکان کو بھی اس قدر تھا کہ انہوں نے اس کی تمہید میں یہ واضح کرنا ضروری خیال کیا کہ "کمیشن کا یہ نظریہ ہے کہ دستور کی ترمیم کے طریقے کو مشکل بنا دیا جائے۔" اس طرح مستقبل میں اس دستور کی اصلاح کا راستہ ہی مسدود کر دیا گیا تھا۔

یہ رپورٹ جب منظر عام پر آئی تو ہر طبقہ خیال کا آدمی چیخ اٹھا۔ اخبارات نے بھی زبردست صدائے احتجاج بلند کی جن میں زمیندار، جنگ، امروز، پاکستان ٹائمز، پاکستان آبزرور، غرض کہ سب ہی تھے۔ علمائے کرام بھی اس رپورٹ کو دیکھ کر تڑپ اٹھے کیونکہ یہ دستوری مسودہ ان تمام اوصاف سے خالی تھا جس کا اسے قرارداد مقاصد کے زیر اثر حامل ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ علمائے کرام میں سے مولانا ظفر احمد عثمانی ،

Marfat.com

مولانا احتشام الحق تھانوی اور مولانا محمد اسمٰعیل وغیرہ نے اس پر سخت غم و غصے کا اظہار کیا۔

عوام اور علمائے کرام کو تعلیمات اسلامی بورڈ کے رویئے پر بھی حیرت تھی کیونکہ یہ مسودہ حکومت کے دعوے کے بموجب تعلیمات اسلامی بورڈ کی سفارشات کے بموجب تیار کیا گیا تھا۔ جس بات نے بورڈ کے رویئے کی طرف سے عوام کی بدگمانیوں کو تقویت پہنچائی وہ بورڈ کے ارکان کی خاموشی تھی۔ چنانچہ لوگ سمجھنے لگے کہ یہ دستوری سفارشات تعلیمات اسلامی بورڈ کی سفارشات کے بموجب تیار کی گئی ہیں اور بورڈ کے ارکان کو ان تجاویز سے اتفاق ہے۔

ناچار بورڈ کے ارکان نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو ایک مشترکہ بیان کے ذریعے اپنے موقف کی وضاحت کی اور کہا کہ "ہم نے جو سفارشات پیش کی تھیں وہ قرآن وسنت کے مطابق تھیں۔ مگر ان سفارشات کے ردوبدل کا اختیار بنیادی اصولوں کی کمیٹی کو تھا لہٰذا اس سے عوام کو جو شکایات ہیں اس کے لئے وہ ان سے رجوع کریں۔ جہاں تک ہمارا معاملہ ہے ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں تمام مسلمان ہیں اور اس امر کے لئے مضطرب ہیں کہ پاکستان کا آئین قرارداد مقاصد کے تقاضوں کے مطابق خالص اسلامی اصولوں کی بنیاد پر مرتب کیا جائے۔ (جنگ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۰ء)۔

مگر ۲۸ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو حکومت کے دو مرکزی وزرا نے (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) ایک مشترکہ پریس کانفرنس میں یہ فقرہ کہہ کر تعلیمات اسلامی بورڈ کی سفارشات کے بارے میں پھر مغالطہ پیدا کر دیا کہ:

"بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے تعلیمات اسلامی بورڈ کی سفارشات پر اچھی طرح غور کر کے اپنی رپورٹ پیش کی ہے۔ اور یہ رپورٹ نہ غیر اسلامی ہے اور نہ قرارداد مقاصد کے خلاف۔"

مفتی محمد شفیع مرحوم نے اخبارات کے ذریعے اس دعوے کی تردید فرمائی اور

فرمایا کہ اگر ان وزراء کرام کے جملے کے معنی یہ ہیں کہ " اس رپورٹ کو تعلیمات اسلامی بورڈ کی سفارشات کے مطابق مرتب کیا گیا ہے تو یہ صریح جھوٹ ہے۔ اس رپورٹ کو تعلیمات اسلامی بورڈ کی سفارشات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے"۔

بورڈ نے عامۃ المسلمین کا خلجان دور کرنے کے لئے اس امر کی کوشش کی کہ ان کی رپورٹ بھی شائع ہو جائے۔ مگر انہیں اس کی اجازت نہیں دی گئی۔

اس رپورٹ پر سب سے جامع تنقید مولانا ابوالاعلی مودودی نے کی انہوں نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو لاہور میں بمقام موچی دروازہ ایک جلسہ عام منعقد کیا اور اس میں اس رپورٹ کے تمام مضمرات کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا۔ مولانا نے اسے ایک مستبد اور مطلق العنان حکومت کا دستور قرار دیا اور فرمایا کہ

> "اس میں حکومت پر کوئی ایسی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی ہے کہ قرآن کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرنا اور منکرات کو مٹانا اس کا فرض ہوگا۔ صرف اس بات کو کافی سمجھا گیا کہ مسلمانوں کے لئے قرآن کی تعلیم لازمی ہوگی"۔

ان کی یہ مبسوط تقریر بعد میں تیس صفحات پر محیط کتابچہ کی صورت میں شائع ہوئی۔ حکومت کی طرف سے اس نوع کا سیکولر اور مطلق العنانی کا حامل دستوری مسودہ مرتب کرنے کا محرک درحقیقت یہ بات تھی کہ جب ہمارے حکمرانوں نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت حاصل ہونے والے لامحدود اختیار حکمرانی کا مزہ چکھا تو ان کی نیت خراب ہو گئی اور انہوں نے کوشش اس امر کی کی کہ نئے دستور میں سارے کے سارے اختیارات ان کے ہاتھ میں برقرار رہیں جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ نے انہیں دے رکھے تھے۔

اس رپورٹ کی مخالفت انتظامی نقطہ نظر سے بھی کی گئی۔ مرکز اور صوبوں کے مابین اختیارات کی جو تقسیم ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں تجویز کی گئی تھی، وہ برقرار رکھی گئی تھی۔ اس پر مشرقی پاکستان کو اعتراض تھا کیونکہ قیام پاکستان کے بعد ملک کے دونوں بازوؤں کے مابین ایک ہزار میل چوڑا ایک جغرافیائی

Marfat.com

خط حائل تھا۔ اس کی وجہ سے اپنی معروضات ڈھاکہ سے دارالسلطنت کراچی تک پہنچانے اور وہاں سے احکامات منگوانے میں بڑی تاخیر ہونے لگی تھی۔ اس لئے ان کا مطالبہ تھا کہ ان کے صوبائی اختیارات میں اضافہ کیا جائے۔ یہ ایک معقول مطالبہ تھا۔ اگر صوبائی اختیارات میں اضافہ کسی وجہ سے مناسب نہ تھا تو کوئی متبادل انتظام کیا جانا ضروری تھا۔ مگر رپورٹ میں اس سلسلے کی طرف سے چشم پوشی برتی گئی تھی۔

اس رپورٹ کے خلاف ملک کے طول وعرض سے اس قدر شدید ردِعمل کا اظہار کیا گیا کہ حکومت اسے واپس لینے پر مجبور ہوگئی اور وعدہ کیا گیا کہ ازسرِنو دستوری خاکہ مرتب کیا جائے گا۔ اس رپورٹ کی سب سے شدید مخالفت چونکہ علماء کرام کی طرف سے کی گئی تھی اس لئے آئندہ ان کی تنقید کا منہ بند کرنے کے لئے ارباب حکومت کی جانب سے یہ طعنہ زنی کی گئی کہ مسلمانوں کے تو بے شمار فرقے ہیں۔ یہ خود کسی بات پر آپس میں متفق نہیں ہوتے۔ ایسی صورت میں کس طرح ایسا دستوری مسودہ تیار کیا جائے جسے سب فرقے اسلامی سمجھیں۔ یہ درحقیقت علمائے کرام کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ علمائے کرام نے اس چیلنج کو قبول کیا۔ جنوری ۱۹۵۱ء میں مختلف مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے ۳۱ اکابر علماء کا کراچی میں اجلاس منعقد ہوا۔ ان میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، شیعہ غرض یہ کہ پاکستان میں بسنے والے تمام مسلّمہ مکاتب فکر کے نمائندے تھے اور یہ سب جدا جدا دینی جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے جن میں اس وقت کی قابل ذکر جماعتیں، جمعیت علمائے اسلام، جمعیت علمائے پاکستان، جمعیت اہل حدیث جماعت اسلامی وغیرہ سب تھیں۔

ان سب نے کامل اتفاق رائے کے ساتھ اسلامی دستور کے بنیادی اصول تیار کئے۔ یہ بنیادی اصول ۲۲ نکات پر مشتمل ہیں۔ اس میں اسلامی

Marfat.com

ریاست کے نظریۂ اساسی، اسلامی قانون کے ماخذِ اساسی، معروفات کے فروغ اور منکرات کے انسداد میں ریاست کی ذمہ داری، شہریوں کے لئے بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی، بنیادی شہری آزادیوں کے تحفظ، اکتساب رزق کی آزادی، ترقی کے مواقع میں یکسانیت اتحاد عالم اسلامی اور دیگر امور کے لئے رہنما اصول مرتب کئے گئے تھے۔

مختلف فرقوں کے مابین پائے جانے والے اختلافات کو جسے اسلامی دستور کی راہ میں ارباب حکومت کی طرف سے بڑی دشواری قرار دیا جارہا تھا، ۲۲ نکاتی فارمولے کی صرف ایک شق میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ طے کر دیا گیا تھا۔ یہ تاریخ بین المسلمین کا نہایت اہم واقعہ ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس شق کی پوری عبارت ذیل میں رقم کر دی جائے۔ وہ عبارت یہ تھی۔

"مسلّمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی ہوگی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ ان ہی کے قاضی یہ فیصلے کریں۔"

۲۲ نکاتی فارمولے کی تیاری بھی مسلمانوں کی پوری تاریخ کا منفرد واقعہ تھا کیونکہ اسلامی مملکت کے قیام اور اسلامی دستور کی تیاری کے لئے پہلا موقع تھا کہ تمام علماء نے کامل اتفاق رائے کے ساتھ ایک فارمولا تیار کیا تھا۔[1]

---

[1] ۲۲ نکات کا مکمل متن درج ذیل ہے۔

۱۔ اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العزت ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

بہرکیف ابھی دستور کے موجود مسائل طے نہیں ہوئے تھے کہ ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ یہ مسئلہ بنگلہ کو سرکاری زبان بنانے کا تھا۔ ایک معصوم اور بے خطا سی بات اس مسئلے کو کھڑا کرنے کا موجب بنی۔ وزیر اعظم بننے کے بعد خواجہ ناظم الدین مرحوم مشرقی پاکستان تشریف لے گئے۔ وہاں انہوں نے ریڈیو پر خطاب کیا۔ اپنی تقریر

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

۲۔ ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہوگا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے گا نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جائے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

۳۔ یہ ملک کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اصول و مقاصد پر مبنی ہوگا جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطہ حیات ہے۔

۴۔ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن و سنت کے بنائے ہوئے معروفات کو قائم کرے، منکرات کو مٹائے اور شعائر اسلامی کے احیاء و اعلاء اور مسلمہ اسلامی فرقوں کو ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری تعلیم کا انتظام کرے۔

۵۔ اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانان عالم کے رشتۂ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیاد پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملت اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے

۶۔ مملکت بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہوگی جو اکتساب رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں، یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعیٔ اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں منجملہ اور باتوں کے انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ اب انگریزی کے بجائے اردو ملک کی سرکاری زبان ہوگی ۔ زبان کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے وقت انہیں اس امر کا غالباً اچھی طرح اندازہ نہ تھا کہ بنگلہ کو سرکاری زبان بنوانے کے خواہشمند افراد کا ٹولہ جو ۱۹۴۸ء میں نہایت کمزور اور دبا دبا سا تھا، اب قوت اور مضبوطی حاصل کر چکا ہے ۔ چنانچہ اس گروہ کے افراد نے زبان کے بارے میں وزیر اعظم کے فرمودات پر بڑا شدید ردعمل ظاہر کیا اور اردو کے ساتھ بنگلہ کو بھی سرکاری

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

۷ ۔ باشندگان ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعت اسلامیہ نے ان کو عطا کئے ہیں ۔ یعنی حدود قانون کے اندر تحفظ جان ومال و آبرو، آزادئ مذہب و مسلک، آزادئ عبادت، آزادی ذات، آزادئ اظہار رائے، آزادی نقل و حرکت، آزادی اجتماع، آزادئ اکتساب رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی اداروں سے استفادے کا حق ۔

۸ ۔ مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کے سند جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمیٔ موقعٔ صفائی و فیصلۂ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی ۔

۹ ۔ مسلّمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی ۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا ۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ ان ہی کے قاضی یہ فیصلے کریں ۔

۱۰ ۔ غیر مسلم باشندگان مملکت کو حدود قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی ہوگی اور انہیں اپنے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

زبان بنانے کا مطالبہ پیش کر دیا۔ یہ مطالبہ پیش کرنے والے وہ لوگ تھے جو اپنی کوتاہی قد کی وجہ سے قومی سیاست میں کوئی بلند مرتبہ حاصل کرنے کے لائق نہ تھے

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

شخصی معاملات کے فیصلے اپنے مذہبی قانون یا رسم ورواج کے مطابق کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

۱۱۔ غیر مسلم باشندگان مملکت سے حدود شریعیہ کے اندر جو معاہدات کیے گئے ہوں ان کی پابندی لازمی ہوگی اور جن حقوق شہری کا ذکر دفعہ نمبر ، میں کیا گیا ہے ان میں غیر مسلم باشندگان ملک اور مسلم باشندگان ملک برابر کے شریک ہوں گے۔

۱۲۔ رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین، صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

۱۳۔ رئیس مملکت ہی نظم مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا۔ البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو کسی فرد یا کسی جماعت کو تفویض کرسکتا ہے۔

۱۴۔ رئیس مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی یعنی وہ ارکان حکومت اور منتخب نمائندگان جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

۱۵۔ رئیس مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کو کلاً یا جزواً معطل کرکے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

۱۶۔ جو جماعت رئیس مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہی کثرت رائے سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

۱۷۔ رئیس مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

۱۸۔ ارکان و عمال حکومت اور شہریوں کے لئے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا۔ اور دونوں

(باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

اس لئے سیاست میں اثر و نفوذ حاصل کرنے کے لیئے آسان نسخہ ان کی نگاہ میں یہ تھا کہ وہ علاقائی مسئلے کو لے کر اٹھ کھڑے ہوں کیونکہ ایسی صورت میں انہیں اپنے علاقے کے لوگوں کی طرف سے اندھی تقلید حاصل ہونے کا قوی امکان موجود تھا۔ ہندوؤں

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

یہ عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔

۱۹۔ محکمہ عدلیہ، محکمہ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

۲۰۔ ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکت اسلامی کے اساسی اصول مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

۲۱۔ ملک کے مختلف ولایات و اقطاع مملکتِ واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ انتظامی علاقوں کی ہوگی جنہیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکزی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا۔ مگر انہیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا

۲۲۔ دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

اس بائیس نکاتی دستاویز کو اتفاق رائے سے تیار کرنے والے علماء کرام کے جو مختلف فقہی مکاتب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسمائے گرامی یہ ہیں۔

۱۔ مولانا سید سلیمان ندوی
۲۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔
۳۔ مولانا بدر عالم
۴۔ مولانا احتشام الحق تھانوی
۵۔ مولانا شمس الحق افغانی
۶۔ مولانا عبدالحامد بدایونی
۷۔ مولانا مفتی محمد شفیع
۸۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی

باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

Marfat.com

ں بھی یہی خواہش تھی کہ مشرقی پاکستان سے علاقائی نوعیت کے مسائل اٹھیں تاکہ ملک کے دونوں بازوؤں کے مابین تنازعہ کشیدگی اور محاذ آرائی پیدا ہو اور پاکستان کی وحدت کو نقصان پہنچے۔ چنانچہ اس مطالبے کے پیش ہوتے ہی وہ کھل کر آگے آ گئے اور بنگلہ کو سرکاری زبان بنانے کے لئے جب تحریک شروع ہوئی تو جلسوں جلوسوں اور مظاہروں میں پیش پیش رہنے لگے۔ ان دنوں ہندو مشرقی پاکستان کی کل آبادی کا کم و بیش ایک چوتھائی تھے۔ ان میں بھی بڑی تعداد تعلیم یافتہ اور مقتدر لوگوں کی تھی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تو وہ اکثریت میں تھے۔ ان کی ٹھوس اور مضبوط تائید سے لسانی تحریک کے علاقہ پرست لیڈروں کو بڑی قوت بہم پہنچی۔ مشرقی پاکستان کے مسلمان عوام کو ابتدا میں اس مسئلے سے کوئی دلچسپی نہ تھی کیونکہ وہ بنگلہ زبان کو صرف مقامی یا صوبائی زبان سمجھتے تھے۔ اسے سرکاری زبان بنانے کا تصور ان کے حاشیہ

پچھلے صفحہ کا حاشیہ

۹۔ مولانا خیر محمد
۱۰۔ مولانا مفتی محمد حسن
۱۱۔ پیر محمد امین الحسنات
۱۲۔ مولانا محمد یوسف بنوری
۱۳۔ حاجی محمد امین
۱۴۔ مولانا عبدالصمد سربازی
۱۵۔ مولانا اطہر علی
۱۶۔ مولانا حبیب الرحمٰن
۱۷۔ علامہ راغب احسن
۱۸۔ پیر ابو جعفر محمد صالح
۱۹۔ مولانا محمد علی جالندھری
۲۰۔ علامہ داؤد غزنوی
۲۱۔ علامہ جعفر حسین مجتہد
۲۲۔ علامہ کفایت حسین مجتہد
۲۳۔ مولانا محمد اسمٰعیل
۲۴۔ مولانا حبیب اللہ
۲۵۔ مولانا احمد علی
۲۶۔ مولانا محمد صادق
۲۷۔ مولانا عبدالخالق
۲۸۔ مولانا شمس الحق فرید پوری
۲۹۔ مولانا مفتی صاحب داد
۳۰۔ مولانا ظفر احمد انصاری
۳۱۔ پیر ہاشم جان سرہندی

Marfat.com

خیال میں بھی نہ آسکتا تھا۔ کیونکہ یہ زبان اب سے پہلے کبھی سرکاری زبان نہیں رہی تھی۔ اگر اسے بننا ہوتا تو پہلے مغربی بنگال میں بنتی کیونکہ بنگلہ زبان وادب پر تفوق و برتری ہندو دانشوروں کو حاصل تھی اور ان کی اکثریت مغربی بنگال میں رہتی تھی۔

ہندوؤں کی معاندانہ تائید کے زور پر علاقہ پرست لیڈروں نے بڑا زور دکھانا شروع کر دیا اور اس مطالبے کو ایک تحریک کی شکل دے دی۔ مولانا بھاشانی جنہیں اب تک کوئی جانتا نہ تھا اسی تحریک کے زور پر لیڈر بنے۔ مجیب الرحمٰن کو بھی سیاست میں داخل ہونے کے لئے یہی تحریک موزوں نظر آئی۔ بد قسمتی سے فضل الحق اور سہروردی صاحب مرحوم بھی اس تحریک کے ہمنوا بن گئے کیونکہ قائد اعظم اور قائد ملت کے معتوب ہوجانے کی وجہ سے خود مشرقی پاکستان کے عوام نے انہیں اپنی نظروں سے گرادیا تھا۔ یہ دونوں حضرات سیاست میں دوبارہ ابھرنے کے خواہشمند تھے۔ ان کی نگاہ میں اب کامیابی کا آسان تر نسخہ یہی تھا کہ وہ علاقائی مسائل لے کر آگے بڑھیں۔

اپنی سیاست بحال کرانے کے لئے ان دونوں بزرگوں کا یہ علاقہ پرستانہ طرز فکر پاکستان کے مفاد کے لئے نہایت بے رحمانہ طرز عمل ثابت ہوا جس سے پے در پے ملک کو نقصان پہنچتا چلا گیا یہاں تک کہ آنے والے برسوں میں مشرقی پاکستان علاقہ پرستی کی علامت بن گیا۔ اور وہاں کی مٹی میں صرف علاقہ پرست لیڈر شپ نمو پانے لگی۔ قومی لیڈر شپ کے لئے پنپنا مشکل ہوگیا۔ بہرکیف بنگلہ کو سرکاری زبان بنانے کے لئے جو تحریک اٹھی اس نے تشدد کی راہ اختیار کرلی۔ ڈھاکہ کی ضلعی انتظامیہ نے صورت حال پر قابو پانے کے لئے ۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کو گولی چلا دی جس سے چند افراد ہلاک ہو گئے۔ فائرنگ کا یہ اقدام تحریک کے لئے آبحیات بن گیا۔ مظاہرین کی ایک بڑی تعداد جیلوں میں بند کر دی گئی۔ گرفتار شدگان میں تعلیم یافتہ ہندوؤں کی ایک معتدبہ تعداد تھی۔ یہ گرفتاریاں ان کے لئے نعمت غیر مترقبہ

Marfat.com

ثابت ہوئیں۔ انہوں نے جیل میں اسیری کے دوران نوجوان اور خام ذہن کے مسلمان بنگالی طلبہ کو بنگلہ قوم پرستی کا نشہ پلا پلا کر مدہوش کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب وہ جیلوں سے رہا ہوئے تو صرف بنگالی تھے۔ نہ مسلمان اور نہ پاکستانی۔ انہیں اپنے ہندو معلّموں سے یہ پوچھنے کا کبھی بھول کے کبھی خیال نہ آتا تھا کہ بنگلہ اگر سرکاری زبان بننے کی مستحق ہے تو وہ اسے مغربی بنگال کی سرکاری زبان کیوں نہیں بناتے؟

بہرکیف ان کی رہائی کے بعد بنگلہ کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ روز بروز مقبول ہوتا چلا گیا۔ وہاں کے ان پڑھ عوام نے خود اپنے بچوں کے اس تحریک کی حمایت میں آگے آگے دیکھا تو بتدریج وہ بھی اس تحریک کے ہمنوا بنتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ یہ تحریک ۱۹۵۴ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی شکست کا موجب بن گئی۔

جب دستور سازی کا کام پھر سے شروع ہوا تو دستوری مسائل میں ایک اہم مسئلہ کا اضافہ ہو چکا تھا۔

۱۹۵۲ء کی دستوری رپورٹ۔ عوام کی تاریخی فتح

۷ ستمبر ۱۹۵۰ء کی بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ واپس لینے کے بعد تقریباً ۲۲ ماہ تک حکومت کی طرف سے مکمل خاموشی رہی۔ عملاً اس کا مفہوم یہ تھا کہ حکومت ۱۹۳۵ء کا ایکٹ ہی مسلط رکھنا چاہتی ہے۔ یہ صورت حال اسلام پسند حلقوں کی طرف سے ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی حکومت کو جھنجھوڑنے کے لئے آگے بڑھے۔ انہوں نے ۸ مئی ۱۹۵۲ء کو کراچی میں ایک جلسہ عام کیا اس میں انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ سال کے اختتام تک وہ دستور سازی کا کام مکمل کرلے۔ انہوں نے آٹھ نکات پر مشتمل رہنما اصول بھی پیش کئے جن پر مطلوبہ دستور تیار کیا جاسکتا تھا۔ یہ آٹھ نکاتی مطالبہ ۲۲ نکاتی فارمولے سے مختلف کوئی چیز نہ تھا۔ بلکہ اس کی تلخیص تھا۔ اس میں اس امر کا بھی مطالبہ کیا گیا تھا کہ دستور میں ہر شخص کی بنیادی ضروریات زندگی یعنی غذا، لباس، مکان، علاج اور تعلیم کی فراہمی کی ضمانت دی جائے۔

اس تقریر کے بعد مولانا نے اسلامی دستور کی تیاری کے لئے ملک گیر مہم شروع کی پاکستان کے طول و عرض میں جلسے کئے گئے۔ اور اس مطالبے کی حمایت میں دستخطی مہم بھی شروع کی گئی۔ پاکستان کے قریئے قریئے سے لاکھوں کی تعداد میں محضر نامے حکومت کے پاس بھیجے گئے۔

نہیں کہا جاسکتا کہ ان مطالبوں کا اثر تھا یا حکومت کا جذبہ فرض شناسی کہ جولائی ۱۹۵۲ء میں حکومت نے دستوری مسودہ مرتب کرنے کے لئے ایک دوسری کمیٹی بنائی۔ یہ بھی بنیادی اصولوں کی کمیٹی کہلائی اور اس نے دستوری مسودہ مرتب کرنے کا کام شروع کردیا۔

اس مہم کے دوران قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تحریک چلی۔ مولانا

Marfat.com

اس مطالبے کے منوا تھے۔ چنانچہ آٹھ نکاتی مطالبے میں نویں نکتے کا اضافہ کیا گیا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ تاکہ پاکستان کی کلیدی اسامیوں پر ان کے تسلط کا سدباب ہو سکے اور وطن عزیز ان کی فتنہ سامانیوں سے محفوظ ہو جائے۔

بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے جب اپنی رپورٹ تیار کر لی تو حکومت کی جانب سے اس کی رپورٹ ۲۲ نومبر ۱۹۵۲ء کو منظر عام پر لانے کا اعلان کیا گیا۔ اس اندیشے کے پیش نظر کہ یہ رپورٹ بھی اسلام پسند حلقوں کی طرف سے مسترد نہ کر دی جائے، حکومت کی جانب سے کوشش کی گئی کہ شائع کرنے سے پہلے چند مقتدر علماء کرام کی سند قبولیت حاصل کر لی جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت مولانا سلیمان ندوی مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا دین محمد اور چند دیگر علمائے کرام کو حکومت نے مدعو کیا اور حالات کی نزاکت کا واسطہ دے کر ان سے خواہش کی گئی کہ وہ اس رپورٹ پر اپنا اطمینان ظاہر کر دیں۔ رپورٹ اپنی اسلامی دفعات کے اعتبار سے اس لائق نہ تھی کہ اس پر اطمینان ظاہر کیا جاتا۔ چنانچہ منت و سماجت کے باوجود علمائے کرام میں سے کوئی اسے سند قبولیت عطا کرنے کو تیار نہ ہوا۔

اس اندیشے کے تحت کہ مبادا یہ رپورٹ علمائے کرام کے عدم اطمینان کے باوجود شائع کر دی جائے اور پھر حکومت اپنی انانیت کے سبب اسے واپس لینے پر تیار نہ ہو، نومبر میں ملک بھر میں ہفتہ دستور اسلامی منایا گیا اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کراچی میں ۳۰ نومبر ۱۹۵۲ء کو ایک جلسہ عام منعقد کر کے حکومت کو متنبہ کیا کہ اگر دستوری مسودہ علمائے کرام کے ۲۲ نکات کے مطابق نہ ہوا تو اسے حکومت کے منہ پر دے مارا جائے گا۔ حکومت اس انتباہ سے بہت خوف زدہ ہوئی اور اس نے رپورٹ کی اشاعت ایک ماہ کے لئے ملتوی کر دی۔ اس ایک ماہ کی مہلت میں ردوبدل کر کے رپورٹ کو بہتر بنایا گیا اور اس میں صراحت کے ساتھ یہ بات شامل کی گئی کہ ملک کا دستور قرآن و سنت کے مطابق ہو گا۔ کسی قانون کے اسلامی ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنے کے لئے علماء کرام کا ایک

بورڈ مقرر کیا جائے گا۔ حکومت اس امر کی کوشش کرے گی کہ کوئی شخص غذا، لباس مکان، علاج اور تعلیم سے محروم نہ رہنے پائے۔ صدر ریاست مسلمان ہوگا۔ اور اس کا متقی ہونا ضروری ہوگا۔ عدلیہ کو انتظامیہ سے علیحدہ رکھا جائے گا۔ کورٹ فیس بند کر دی جائے گی۔ صدر ریاست اور ارکان اسمبلی اس امر کا حلف لیں گے کہ وہ پبلک اور پرائیویٹ زندگی میں قرآن وسنت کے پابند ہوں گے۔ قرآن کی تعلیم لازمی ہوگی۔ مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کے لئے ایک منصفانہ معیار قائم کیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

حکومت نے رپورٹ ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو شائع کی۔ علماء کرام ۱۱ جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں ایک بار پھر جمع ہوئے اور اٹھارہ جنوری تک اس پر غور و خوض کیا۔ اس اجلاس میں صرف وہ علمائے کرام مدعو تھے جنہوں نے ۲۲ نکاتی فارمولا مرتب کرنے میں حصہ لیا تھا۔ انہوں نے رپورٹ کو بنیادی طور پر ۲۲ نکاتی فارمولے سے بہت قریب پایا۔ یہ ۱۹۵۰ء کی رپورٹ سے ہزار درجہ بہتر تھی مگر اس میں بہت سی خامیاں بھی تھیں۔ علمائے کرام نے ان خامیوں کو دور کرنے کے لئے اپنی تجاویز مرتب کر کے حکومت کو بھیجیں۔ ان سفارشات میں اس بات پر زور دیا گیا کہ حکومت جن منکرات کو مٹانا چاہتی ہے ان کے لئے مدت کا تعین کر دے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ۳۰ جنوری ۱۹۵۳ء کو لاہور میں ایک جلسہ عام میں اس رپورٹ کی سفارشات پر سیر حاصل تقریر کی۔ اس کی خوبیوں کی تعریف کی۔ اس کی خامیوں کی نشاندہی کی۔ اس کی اصلاح کے لئے علماء کرام کی سفارشات کی وضاحت کی اور حکومت کے اس رویے کی تعریف کی کہ اس نے پچھلی رپورٹ کے برعکس اس میں علمائے کرام کی سفارشات کو سمونے کی کوشش کی ہے۔

عوام کے دیگر حلقوں نے بھی رپورٹ پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ چنانچہ دستورساز اسمبلی نے رپورٹ پر غور و خوض شروع کر دیا۔

اس زمانے میں ملک کے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین تھے۔ وہ نہایت دیندار

Marfat.com

اور خدا ترس انسان تھے۔ دستوری مسودے کو اسلامی رنگ دینے میں ان کی خواہش اور کوشش کو بھی بڑا دخل تھا جب کہ گورنر جنرل غلام محمد اسلامی دستور کے سخت مخالف تھے۔ انہیں اسمبلی میں اس قسم کا دستور بنایا جانا گوارا نہ ہوا۔ چنانچہ انہوں نے نا اہلی کا الزام دھر کے ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء میں خواجہ ناظم الدین کو وزارت عظمیٰ کے عہدے سے برطرف کر دیا اور محمد علی بوگرہ کو جو امریکہ میں سفیر تھے بلا کر وزیر اعظم بنا دیا۔ یہ نہایت غیر آئینی اقدام تھا کیونکہ پارلیمانی طرز حکومت میں صدر مملکت محض آئینی سربراہ ہوتا ہے۔ وزیر اعظم کی برطرفی اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتی۔ قوم اور ملت کو بے چارگی کے ساتھ غلام محمد کے اس اقدام کو برداشت کرنا پڑا۔

محمد علی بوگرہ کو لانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسلامی دستور سے گریز کا راستہ تلاش کریں۔ چنانچہ اس سے گریز کی راہ انہوں نے تلاش کر لی اور وہ یہ تھی کہ دستور سازی کا کام "سردست" روک دیا جائے اور کام چلانے کے لئے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں ضروری ترمیمات کر کے اسے عارضی دستور کی حیثیت سے اختیار کر لیا جائے۔ یہ اسکیم جب منظر عام پر آئی تو عامۃ المسلمین حکومت کی پس پردہ بدنیتی کو بھانپ گئے اور انہوں نے اس کی زبردست مخالفت کی۔ ملک کے طول و عرض میں جلسے ہوئے، جن میں کہا گیا کہ ملک کا نظام پہلے ہی سے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت چل رہا ہے لہٰذا عارضی دستور بنانے کی ضرورت نہیں۔ جو دستور بنے وہ مستقل دستور بنے اور ۱۹۵۲ء والی سفارشات کے بموجب ہو۔

۱۹۵۴ء کا دستوری مسودہ اور اسمبلی کی برطرفی

ناچار محمد علی بوگرہ نے دستور سازی کا سلسلہ پھر سے شروع کیا یہاں تک کہ ۱۹۵۴ء کے وسط تک دستور سازی کی دو خواندگیاں مکمل ہوگئیں۔ صرف تیسری خواندگی

باقی رہ گئی جو صرف چند ہفتوں کا کام تھی۔ اس کے نفاذ کے لئے ۲۵ دسمبر ۱۹۵۴ء کی تاریخ مقرر کر لی گئی تھی۔ اگر دستور مکمل ہو جاتا تو پھر ملک میں عام انتخابات ہوتے اور نئی حکومت تشکیل پاتی۔ غالب امکان تھا کہ غلام محمد اور ان کے قبیل کے افراد دوبارہ برسر اقتدار نہ آسکیں گے۔ یہ اندیشہ غلام محمد اور ان کے ہم خیال لوگوں کو گوارہ نہ تھا۔ چنانچہ دستور سے گریز کے لئے ایک دوسری تدبیر تلاش کی گئی۔ سہروردی صاحب مرحوم ان دنوں زیورچ میں زیر علاج تھے۔ فکری اعتبار سے وہ بالکل سیکولر انسان تھے۔ اسلامی دستور انہیں بھی پسند نہ تھا چنانچہ کراچی کے ایک انگریزی روزنامے کے مدیر' زیڈ۔ اے سلہری صاحب سہروردی صاحب کے پاس زیورچ بھیجے گئے۔ ان کے مشورے پر سہروردی صاحب نے زیورچ سے ایک اخباری بیان جاری کیا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ موجودہ دستور ساز اسمبلی غیر نمائندہ ہے لہذا اسے توڑ دیا جائے اور نئی اسمبلی بنائی جائے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ اسمبلی سات سال سے کام کر رہی تھی مگر اس پورے عرصے میں سہروردی صاحب نے اسے غیر نمائندہ قرار نہیں دیا اور اب جبکہ وہ دستور سازی کا کام مکمل کر چکی تھی اسے غیر نمائندہ کہا گیا اور اسے توڑنے کا مطالبہ کیا گیا۔ یہاں سے ایک نئی بدقسمتی کا آغاز ہوا جس نے اسلامی دستور کے سلسلے میں اب تک کی ہوئی تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا۔

اس مطالبے کی حمایت میں چند چھوٹی چھوٹی آوازیں اور بھی اٹھوائی گئیں اور ان آوازوں کو بہانہ بنا کر اسمبلی توڑ دینے کا ارادہ کر لیا گیا۔ اس سازش کے خالق گورنر جنرل غلام محمد اور ان کے معاون کار اسکندر مرزا تھے۔ محمد علی بوگرہ اس سازش سے بے خبر تھے۔ وہ ان دنوں امریکہ گئے ہوئے تھے۔ انہیں دورہ مختصر کر کے واپس آنے کی ہدایت کی گئی۔ ۲۳، اکتوبر کو رات کے ۹ بجے محمد علی بوگرہ کراچی ائیرپورٹ پر اترے تو انہیں گھر جانے نہیں دیا گیا بلکہ سیدھے گورنر جنرل ہاؤس پہنچایا گیا۔ وہاں اسکندر مرزا نے بند کمرے میں بٹھا کر انہیں اس بات پر

Marfat.com

بالجبر مجبور کیا کہ وہ ریڈیو پر دستور ساز اسمبلی توڑنے کا فرمان پڑھ کر سنائیں اور گورنر جنرل غلام محمد کی مرضی کے مطابق نئی کابینہ تشکیل دیں۔

محمد علی بوگرہ کو یہ صورت حال پسند نہ تھی مگر حالت جبر میں گوارہ کرنی پڑی۔ وہ روتے ہوئے گورنر جنرل ہاؤس سے باہر نکلے اور بند گاڑی میں ریڈیو اسٹیشن لے جائے گئے جہاں انہوں نے محولہ بالا تقریر پڑھ کر سنائی۔ کابینہ برطرف کر دی گئی۔ اس کی جگہ پر نئی کابینہ بنائی گئی۔ اس میں اسلام پسند وزراء کو شامل کرنے سے بطور خاص گریز کیا گیا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور جناب اے کے بروہی وغیرہ نئی کابینہ میں شامل نہیں کئے گئے۔ اسکندر مرزا اور سہروردی نے اپنے کارناموں کا انعام حاصل کیا۔ اول الذکر وزیر داخلہ اور موخر الذکر وزیر قانون بنائے گئے ایوب خان وزیر دفاع بنائے گئے۔ کابینہ میں ان کی شرکت سے اندازہ ہوا کہ غلام محمد کی پس پردہ قوت دراصل وہی ہیں۔ دستور ساز اسمبلی کے توڑ دیئے جانے پر ملک میں سوگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی کیونکہ اس واقعہ نے دستور سازی کی سات سالہ کوشش کو بیک جنبش قلم خاک میں ملا دیا تھا۔

دستور ساز اسمبلی کے صدر (اسپیکر) مولوی تمیزالدین خان تھے۔ انہوں نے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا اور اسمبلی کو بحال کرانے کے لئے عدالت سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب اس ارادے کا علم ارباب حکومت کو ہوا تو انہیں بلا کر دھمکایا گیا کہ وہ اپنی عافیت چاہتے ہوں تو اس ارادے سے باز رہیں۔ مگر وہ اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم رہے اور سندھ چیف کورٹ (موجودہ سندھ ہائیکورٹ) میں اسمبلی کی برطرفی کے خلاف ۸ نومبر کو آئینی درخواست (رٹ) داخل کر دی۔ سندھ چیف کورٹ کے فل بنچ نے جس کے صدر جناب (ریٹائرڈ) جسٹس کانسٹنٹائن اور ارکان میں جناب جسٹس بچل، جناب جسٹس ویلانی، جناب جسٹس محمد بخش میمن اور جناب جسٹس حسن علی آغا تھے، مقدمے کی سماعت کی۔ مدعی کی جانب سے جناب آئی۔ آئی۔ چندریگر اور مدعا الیہ کی جانب سے اٹارنی جنرل جناب منشی فیاض علی نے مقدمے کی پیروی کی۔

Marfat.com

سندھ چیف کورٹ نے متفقہ فیصلے کے ذریعے اسمبلی کی تنسیخ کا فیصلہ کالعدم قرار دے دیا اور اسمبلی بحال کر دی۔ اس فیصلے سے ملک بھر میں مسرت کی لہر دوڑ گئی مگر حکومت نے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کر دی۔ وہاں بھی فل بنچ نے جس کے صدر جناب جسٹس محمد منیر تھے اور ارکان میں جناب جسٹس ایس۔ اے رحمان، جناب جسٹس محمد شریف، جناب جسٹس محمد اکرم اور جناب جسٹس اے۔ آر کارنیلئس تھے، مقدمے کی سماعت کی۔ سپریم کورٹ میں چیف کورٹ کا فیصلہ بحال نہ رہ سکا اور اسمبلی کی برطرفی فیصلہ کن حیثیت اختیار کر گئی۔

۲۴۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو جو دستور ساز اسمبلی توڑی گئی تھی اس کی جگہ مئی ۱۹۵۵ء میں نئی دستور ساز اسمبلی بنائی گئی مگر اسمبلی توڑنے کا اقدام ملک کے لئے دور رس نقصانات پیدا کرنے کا موجب بنا۔ ایک نقصان یہ ہوا کہ دستور سازی کی ۷ سالہ کوشش پر، جو اب کامیابی سے ہمکنار ہونے والی تھی، پانی پھر گیا دوسرا نقصان مقدمے بازی کے نتیجے میں رونما ہوا کہ ملک ایک بدترین قسم کے آئینی بحران میں مبتلا ہو گیا۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بلا اختصار احوال بیان کیا جائے۔

دستور ساز اسمبلی توڑے جانے کے خلاف اسمبلی کی صدر مولانا تمیز الدین خاں نے سندھ چیف کورٹ میں جو درخواست داخل کی اس میں عدالت سے استدعا کی گئی تھی کہ گورنر جنرل کو دستور ساز اسمبلی توڑنے کا اختیار حاصل نہیں لہذا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کی شق ۲۲۳ الف کے تحت عدالت عالیہ آئینی حکمنامہ (WRITS OF MANDAMUS) جاری کر کے اسمبلی کو بحال کر دے اور ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی شق نمبر ۱۰ کے تحت حکمنامہ (WRIT OF QUOWARANTO) جاری کر کے نئی کابینہ کی تشکیل کو کالعدم قرار دے۔ واضح رہے کہ یہ دونوں قوانین پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے جولائی ۱۹۵۴ء میں منظور کئے تھے۔ دفعہ ۲۲۳ الف ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں اس کی دفعہ ۲۲۳ کے نیچے ایک اضافی شق کی حیثیت سے شامل کی گئی تھی جس میں عدالت عالیہ کو (WRIT OF MANDAMUS) جاری کرنے

Marfat.com

کا اختیار دیا گیا تھا۔ جبکہ کابینہ کے وزراء کی اہلیت کے بارے میں ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی شق نمبر ۱۰ کی عبارت تبدیل کر کے نئی عبارت شامل کی گئی تھی۔

حکومت کے وکیل نے اس کے جواب میں یہ موقف اختیار کیا کہ مذکورہ بالا دونوں آئینی شقیں غیر قانونی ہیں کیونکہ اسمبلی نے ان کو پاس کرنے کے بعد گورنر جنرل کی منظوری حاصل نہیں کی ہے۔

دونوں فریقوں کا موقف سننے کے بعد عدالت نے مولوی تمیز الدین خان کی درخواست متفقہ طور پر منظور کر لی۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں کہا کہ دستور ساز اسمبلی کے بنائے ہوئے قوانین پر گورنر جنرل کی منظوری حاصل کرنا ضروری نہیں اور یہ کہ گورنر جنرل کو اسمبلی توڑنے کا اختیار نہیں۔ چنانچہ عدالت نے حکمنامہ مینڈیمس WRIT OF MANDAMUS جاری کر کے اسمبلی بحال کر دی اور WRIT OF QUOWRRANTO جاری کر کے کابینہ کی تشکیل کالعدم قرار دے دی۔

حکومت نے اس فیصلے کے خلاف فیڈرل کورٹ (موجودہ سپریم کورٹ) میں اپیل داخل کر دی اور وہی موقف اختیار کیا جو سندھ چیف کورٹ میں کیا تھا۔ سپریم کورٹ نے ۲۱ مارچ ۱۹۵۵ء کو اپیل منظور کر لی اور اپنے فیصلے میں کہا کہ دفعہ ۲۲۳ الف کی منظوری گورنر جنرل سے نہیں لی گئی ہے لہٰذا اس کی قانونی حیثیت نہیں اور اس قانون کے تحت رٹ جاری کرنا سندھ چیف کورٹ کے دائرہ اختیار (JURISDICTION) سے باہر ہے۔

فیڈرل کورٹ کا فیصلہ آنے کے بعد حکومت نے ایک احمقانہ حرکت کی۔ اس نے دستور ساز اسمبلی کے پاس کئے ہوئے ایسے دیگر قوانین پر بھی جن کی گورنر جنرل سے منظوری حاصل نہیں کی گئی تھی اس فیصلے کو منطبق کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے قوانین جن کی کل تعداد ۴۴ تھی غیر قانونی ہو گئے۔

اس اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے شمار ایسے اقدامات اور کام جو دستور ساز اسمبلی

کے بنائے ہوئے قانون کے بموجب انجام دیئے گئے تھے اور دیئے جارہے تھے یک لخت غیر قانونی ہوگئے۔ مثلاً اسٹیٹ بنک آف پاکستان کا قیام غیر قانونی ہوگیا کیونکہ اس بنک کے قیام کے قانون کی دستور ساز اسمبلی نے گورنر جنرل سے منظوری نہیں لی تھی اسٹیٹ بنک کے جاری کئے ہوئے سکّے، نوٹ اور دیگر تمام کام غیر قانونی ہوگئے اسی طرح سے صوبائی اسمبلیاں، جن کے انتخابات دستور ساز اسمبلی کے قانون کے تحت ہوئے تھے، غیر قانونی ہوگئیں۔ ان اسمبلیوں کے بنائے ہوئے قوانین غیر قانونی ہوگئے۔ ان قوانین کے تحت چلائے جانے والے مقدمات غیر قانونی ہوگئے۔ عدالتوں کی دی ہوئی سزائیں غیر قانونی ہوگئیں۔ یہاں تک کہ فیڈرل کورٹ کا عدالت عظمےٰ ہونا غیر قانونی ہوگیا کیونکہ پریوی کونسل کے بجائے فیڈرل کورٹ کو عدالت عظمےٰ بنانے کے قانون کی گورنر جنرل سے منظوری نہیں لی گئی تھی۔ ان سب میں سب سے ہولناک بات یہ تھی کہ خود دستور ساز اسمبلی کا وجود غیر قانونی بن گیا تھا کیونکہ متعدد بار اس نے آئینی ترمیمیں کرکے اپنے ارکان کی تعداد میں کمی وبیشی کی تھی اور ان ترمیموں پر بھی گورنر جنرل کی منظوری حاصل نہیں کی گئی تھی۔ مختصر یہ کہ حکومت نے فیڈرل کورٹ کی تعبیرات کا دائرہ بلاضرورت غیر ضروری حدود تک وسیع کرکے ملک میں شدید ترین قسم کا آئینی بحران پیدا کر دیا حالانکہ فیڈرل کورٹ نے ان امور کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دیا تھا۔ حکومت ان مسائل کو نہ چھیڑتی تو کوئی بحران پیدا نہ ہوتا۔ بہرکیف ان قوانین کے جواز وعدم جواز کو چھیڑنے کے بعد اس نے خود ہی اس بحران کو حل کرنے کی راہ بھی تلاش کی۔ وہ یہ تھی کہ گورنر جنرل گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۴۲ کے تحت ایمرجنسی پاور استعمال کرکے بذریعہ آرڈیننس ان قوانین کی گذشتہ تاریخ (RETROSPECTIVE EFFECT) سے منظوری دیں چنانچہ اسمبلی کے پاس کئے ہوئے اس قسم کے ۴۴ قوانین میں سے، جن کی منظوری حاصل نہیں کی گئی تھی ۳۵ قوانین کی گورنر جنرل نے ۲۷ مارچ ۱۹۵۵ء کو منظوری دے دی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ منظوری دیئے جانے والے قوانین کی اس فہرست

میں WRITS OF MANDAMUS کے قانون کو شامل نہیں کیا گیا۔ پھر یہ مسئلہ فیڈرل کورٹ میں گیا کہ آیا گورنر جنرل کو گذشتہ تاریخ سے قوانین کو منظور کرنے کا اختیار ہے یا نہیں۔ [1] عدالت نے اس اقدام کو خلاف قانون قرار دیا۔ حکومت مخمصے میں پھنس گئی اس نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی دفعہ ۲۱۳ کے تحت فیڈرل کورٹ سے مشورہ (REFERENCE) طلب کیا کہ ان قوانین کو قانونی حیثیت دینے کے لئے کیا کیا جائے؛ عدالت نے مسئلے کی نزاکت کی بنا پر نظریہ ضرورت کے تحت رائے دی کہ ان قوانین کی صرف عارضی مدت کے لیئے گذشتہ تاریخ سے منظوری دی جاسکتی ہے بشرطیکہ اس کے بعد نئی دستور ساز اسمبلی بنائی جائے جو ان قوانین کی منظوری دے۔

۱۹۵۶ء کا دستور ـــــ عوامی امنگوں کا مظہر

فیڈرل کورٹ کے مشورے کے بموجب مئی ۱۹۵۵ء میں نئی اسمبلی بنائی گئی۔ اسے عام انتخابات کے ذریعے منتخب کرانا اس وقت ممکن نہ تھا اس لئے یہ طریقہ

---

[1] یہ مسئلہ یوسف پٹیل اور دیگران نامی مدعیان کی جانب سے عدالت عظمیٰ میں اٹھایا گیا کیونکہ مدعیان کو غنڈہ ایکٹ کے تحت سزا دی گئی تھی۔ اس سزا کے خلاف مدعیان نے عدالت عظمیٰ (فیڈرل کورٹ) سے رجوع کیا اور وہاں یہ موقف اختیار کیا کہ انہیں غنڈہ ایکٹ کے جس قانون کے تحت سزا دی گئی ہے، اس کی، ان کے ارتکاب جرم سے پہلے تک دستور ساز اسمبلی نے گورنر جنرل سے منظوری نہیں حاصل کی تھی۔

گورنر جنرل نے اس قانون کی محولہ بالا ۳۵ قوانین کے ساتھ گذشتہ تاریخ سے، مدعیان کے ارتکاب جرم کے بعد منظوری دی ہے لہٰذا کسی جرم کے ارتکاب پہ سزا دینے کے لئے گذشتہ تاریخ سے کوئی قانون منظور نہیں کیا جاسکتا۔

تلاش کیا گیا کہ صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کے ووٹوں کے ذریعے صوبائی اسمبلی کے ارکان میں سے دستور ساز اسمبلی کے لئے ارکان منتخب کئے جائیں چنانچہ اس طریقے کے مطابق اسی (۸۰) ارکان پر مشتمل اسمبلی بنائی گئی اور ۷ جولائی ۱۹۵۵ء سے اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔

نئی دستور ساز اسمبلی کی ہیئت ترکیبی سابقہ اسمبلی سے اس اعتبار سے نہایت مختلف تھی کہ اس میں ہندو اور ہندو نواز عناصر کا تناسب بہت زیادہ تھا۔ اپریل ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان اسمبلی کے انتخابات میں جگتو فرنٹ نے مسلم لیگ کو بہت بڑی طرح شکست دی تھی۔ ۳۰۹ (غالباً) ارکان پر مشتمل وہاں کی صوبائی اسمبلی میں مسلم لیگ کے صرف دس، گیارہ ارکان منتخب ہو سکے تھے باقی ماندہ ارکان جگتو فرنٹ کے تھے۔ اس میں اکثریت عوامی لیگی اور علاقہ پرست ارکان کی تھی جو سیکولر بھی تھے اور ہندو نواز بھی۔ ہندو بھی کافی تعداد میں تھے۔ چنانچہ دستور ساز اسمبلی میں وہاں سے اسی قسم کے ارکان منتخب ہو کر آئے۔ ان میں شیخ مجیب الرحمان، حسین شہید سہروردی، اے۔ کے فضل الحق، عطاالرحمٰن خان، ابوالمنصور احمد، ابوحسین سرکار وغیرہ شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ انہیں اسلامی دستور کب گوارا ہو سکتا تھا۔ مغربی پاکستان کی اسمبلیوں سے بھی بدقسمتی سے اسی قسم کے بہت سے لوگ منتخب ہو گئے جن کے سرخیل مشہور کانگرسی لیڈر ڈاکٹر خان صاحب تھے۔

ان دنوں ملک کے وزیر اعظم چوہدری محمد علی تھے۔ وہ اگرچہ نہایت مخلص مسلمان تھے۔ اسلامی دستور کے دل سے خواہاں تھے مگر اسمبلی کی ہیئت ترکیبی میں یہ ناموافق تبدیلی ان کے کام کی راہ میں سخت رکاوٹ تھی۔ مشرقی پاکستان سے منتخب ہو کر آنے والے ارکان نے ایک اور مسئلے کا بھی اضافہ کر دیا تھا۔ وہ یہ کہ وہ زیادہ صوبائی خودمختاری کے خواہاں تھے۔ ان دشوار گذار حالات میں دستور بنانا سخت مشکل کام تھا مگر چوہدری صاحب کا تدبّر اور ان کی صلاحیت کام آئی۔ انہوں نے ان سب مشکلات پر قابو پا لیا اور ایک دستوری مسودے پر سب کو متفق کر دیا یہاں تک

Marfat.com

کر مشرقی پاکستان کے ارکان کو اس بات پر بھی آمادہ کر لیا کہ وہ آبادی میں زیادہ ہونے کے باوجود دستور ساز اسمبلی میں مغربی پاکستان کے برابر نشستیں قبول کر لیں گے۔

دستور کو غالب طور پہ اسلامی رنگ دیا گیا۔ قرارداد مقاصد دستور کا سنگ بنیاد بنا اور دستور میں قرار پایا کہ مملکت کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہوگا۔ سربراہ مملکت مسلمان ہوگا۔ قرآن وسنت کے منافی تمام قوانین کو منسوخ کر دیا جائے گا۔ موجودہ قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق تبدیل کر دیا جائے گا۔ قوانین کو تبدیل کرنے کے لئے راہ عمل مرتب کرنے کی غرض سے دستور کے نفاذ کے ایک سال کے اندر اندر اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی جائے گی جو پانچ سال کے اندر اندر اس کام کو مکمل کرنے کی پابند ہوگی۔ مسلمانوں کو اس لائق بنایا جائے گا کہ وہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق زندگی گذار سکیں۔ قرآن کی تعلیم لازمی ہوگی۔ اسلامی اخوت کو فروغ دیا جائے گا۔ زکوٰۃ ، وقف ، اور مساجد کا انتظام کیا جائے گا۔ مسلم ممالک سے قریبی تعلقات قائم کئے جائیں گے۔ ہر شہری کو تحریر و تقریر اجتماع ، انجمن سازی ، آمدورفت اور مذہبی عبادات کی بجا آوری کی آزادی ہوگی غلامی اور جبری محنت ممنوع ہوگی۔ ہر شخص کو بنیادی ضروریات زندگی یعنی غذا، لباس، مکان، علاج اور تعلیم فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ عصمت فروشی قماربازی، شراب نوشی اور منشیات خوری ممنوع ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔

صرف ایک مسئلہ تھا جس پہ تصفیہ نہ ہوسکا کہ طریقہ انتخاب کیا ہو؟ جداگانہ یا مخلوط؟ دستور سازی کو تعطل سے بچانے کے لئے دستور کی دفعہ نمبر ۱۴۵ میں طے کیا گیا کہ اس کا فیصلہ بعد میں صوبائی اسمبلیوں کے مشورہ سے دستور ساز اسمبلی (قومی اسمبلی) میں کیا جائے گا۔ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا جو چوہدری محمد علی کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں دستور ساز اسمبلی نے انجام دیا تھا۔ چنانچہ پورے ملک میں دستور سازی کی تکمیل پہ بے پناہ مسرت کا اظہار کیا گیا اور ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو جس روز دستور کا نفاذ عمل میں آیا ملک بھر میں جشن منایا

Marfat.com

گیا اور چراغاں کیا گیا۔

اس زمانے میں گورنر جنرل اسکندر مرزا تھے۔ انہیں ہی اسلامی جمہوریہ پاکستان کا پہلا صدر بنایا گیا۔ ملک کی بدقسمتی کہ چوہدری محمد علی کو وزیر اعظم رہنا نصیب نہ ہوا۔ مخالفین نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ انہوں نے استعفےٰ دے دیا ورنہ اس کے بعد اسلامی قانون کے نفاذ کا کام تیزی سے شروع کر دیا جاتا۔ ان کے استعفےٰ دینے کے بعد سہروردی صاحب وزیر اعظم بنا دیئے گئے۔ اسکندر مرزا تو سیکولر قسم کے آدمی تھے ہی سہروردی صاحب بھی ان سے کم نہ تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی قانون کی تدوین کا اور اسلامی نظام کے نفاذ کا جو کام اب شروع کیا جانا چاہیئے تھا ان سے ان دونوں نے پہلو تہی کی۔ اسلامی نظام کے نفاذ سے ان دونوں کے گریز کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اسلامی نظریاتی کاؤنسل، جسے آئین کے مطابق ایک سال کے اندر قائم ہو جانا چاہیئے تھا ایک سال مکمل ہونے پر بھی قائم نہ کی۔ سال ختم ہونے کے ایک دن پہلے اس کے صرف صدر کا تقرر عمل میں لایا گیا۔

دستور سازی کے بعد پہلا کام یہ تھا کہ ملک میں عام انتخابات کرائے جائیں جو ملک میں اب تک نہیں ہوئے تھے۔ حکومت انتخابات سے گریز کرنا چاہتی تھی مگر شدید عوامی دباؤ کی بنا پر حکومت نے فروری ۱۹۵۹ء میں انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد سے ملک کی سیاسی جماعتیں انتخابات کی تیاریوں میں لگ گئیں۔

انتخاب سے پہلے طریقۂ انتخاب کا مسئلہ طے ہونا تھا۔ اس کے بارے میں دستور کی شق نمبر ۱۴۵ میں جو قرار پا چکا تھا اس کے بموجب پہلے یہ مسئلہ صوبائی اسمبلیوں میں علیحدہ علیحدہ طور پر پیش کیا گیا۔ ون یونٹ بن چکا تھا اس لئے یہ مسئلہ مغربی اور مشرقی پاکستان کی اسمبلیوں میں زیر غور آیا۔ مغربی پاکستان کی اسمبلی نے جداگانہ انتخاب اپنانے کی قرار داد منظور کی مگر مشرقی پاکستان کی

Marfat.com

اسمبلی نے مخلوط انتخاب کے حق میں رائے دی۔ وجہ ظاہر تھی کہ ۱۹۵۴ء کے صوبائی انتخابات میں وہاں مسلم لیگ کو شکست دے کر سیکولر، علاقہ پرست اور ہندو نواز عناصر منتخب ہو کر اسمبلیوں میں پہنچے تھے۔ ایک تو انہیں دو قومی نظریے سے کوئی ذہنی لگاؤ نہ تھا دوئم وہ ہندوؤں کے زیر اثر تھے۔ لہذا ان سے اسی قسم کے فیصلے کی توقع تھی۔

اس کے بعد یہ مسئلہ قومی اسمبلی (سابقہ نام دستور ساز اسمبلی) میں پیش ہونا تھا مشرقی پاکستان کے بیشتر ارکان تو مخلوط انتخاب کے حق میں تھے ہی، مغربی پاکستان سے کانگرسی لیڈر ڈاکٹر خان صاحب اور اسکندر مرزا اس کی وکالت میں پیش پیش تھے۔ " اندیشہ " مغربی پاکستان کے عوام کی طرف سے تھا کہ وہ مخلوط انتخاب کے حق میں فیصلہ نہ ہونے دیں گے۔ اس " اندیشے " سے بچنے کے لئے قومی اسمبلی کا اجلاس ڈھاکہ میں طلب کیا گیا۔ اس دوران ملک کی اسلام پسند جماعتوں نے جن میں مسلم لیگ۔ جماعت اسلامی اور نظام اسلامی پارٹی پیش پیش تھی، جداگانہ انتخاب کے حق میں زبردست تحریک چلائی، جلسے کئے، مضامین شائع کئے اور مظاہرے کئے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس موضوع پر ایک مبسوط مقالہ قلمبند کیا جس میں مخلوط انتخاب کے نقصانات سے قوم کو آگاہ کیا۔ انہوں نے اس وقت کے وزیر اعظم حسین شہید سہروردی صاحب کے اس دعوے کو بھی چیلنج کیا کہ مشرقی پاکستان کی اکثریت مخلوط انتخاب کی حامی ہے۔ مولانا نے کہا کہ سہروردی صاحب مشرقی پاکستان کے جس شہر میں چاہیں جلسہ عام کرکے اس موضوع پر مباحثہ کرلیں پھر جلسے سے استصواب کرایا جائے مگر سہروردی صاحب نے اس چیلنج کو قبول کرنے سے گریز کیا۔ مولانا مودودی اور سردار عبدالرب نشتر اور دیگر زعماء اس اجلاس سے قبل ڈھاکہ پہنچے تاکہ وہاں جلسہ کرکے وہاں کے عوام کو مخلوط انتخاب کے مضمرات سے آگاہ کرسکیں۔ ان دنوں مشرقی پاکستان میں حکومت جگتو فرنٹ کی تھی اور شیخ مجیب الرحمٰن حکومت کے ایک با اثر وزیر

Marfat.com

تھے۔ وہ اور ان کی پوری حکومت مخلوط انتخاب طے کرانے کا تہیہ کئے بیٹھی تھی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی پلٹن میدان میں جلسہ عام سے خطاب کرنے والے ہیں اور اس سے پہلے ایک جلوس بھی نکلے گا تو مجیب الرحمٰن نے دوستانہ حیثیت میں پروفیسر غلام اعظم کو جو مشرقی پاکستان کی جماعت اسلامی کے سیکریٹری جنرل تھے، متنبہ کیا کہ وہ جلوس اور جلسے کے ارادے سے باز آجائیں ورنہ حکومت اس کو روکنے کے لئے فورس استعمال کرے گی مگر جماعت اس انتباہ سے خوف زدہ نہ ہوئی اور اس نے ایک بڑا جلوس نکالا۔ مجیب الرحمٰن نے اس پر زبردست لاٹھی چارج کرایا۔ مولانا عبدالرحیم اور جماعت کے دیگر قائدین زخمی ہوئے۔ جلوس منتشر کر دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلسہ نہ ہو سکا اور مولانا مودودی خطاب نہ کر سکے۔

بہرکیف ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو قومی اسمبلی میں سہروردی صاحب نے طریقۂ انتخاب کا بل پیش کیا۔ ان کی جانب سے اس بل کی طرف داری کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ مخلوط کابینہ کے وزیر اعظم تھے۔ ان کی وزارت عظمیٰ ہندو ارکان اسمبلی کی حمایت کے دم سے قائم تھی۔ اگر وہ بل کی حمایت نہ کرتے تو ہندو ان کی حمایت واپس لے لیتے اور یہ بات انہیں کسی قیمت پر گوارہ نہ تھی۔ بل پیش کرنے سے پہلے اسمبلی کی عمارت کو سنگینوں کے پہرے میں لے لیا گیا۔ ارکان اسمبلی کو خوف زدہ کیا گیا۔ اسکندر مرزا خود ڈھاکہ گئے اور وہاں پہنچ کے انہوں نے اسمبلی کے ارکان پر زور دیا کہ وہ بل کی حمایت میں ووٹ دیں۔ انہوں نے اس بل کی حمایت میں ووٹ حاصل کرنے کے لئے ارکان کے ساتھ دھمکی آمیز رویہ بھی اختیار کیا۔

یہ بل جس طریقے پر اسمبلی میں پیش کیا گیا وہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ اسمبلی کے اجلاس کے دوران زیر بحث مسئلے کو چھوڑ کر اچانک التوا کا اعلان کر دیا گیا اور پھر یکایک مخلوط انتخاب کا بل پیش کر دیا گیا۔ یہ طرز عمل کسی بل کو اسمبلی میں

Marfat.com

زیرِ غور لانے کے مروجہ پارلیمانی قاعدے کے سراسر منافی تھا۔ پھر اس پر بحث کے لئے مناسب وقت بھی نہیں دیا گیا۔ صرف ڈیڑھ دو گھنٹے بحث ہوئی۔ اس بحث میں زیادہ تر ہندو ارکان کو حصہ لینے کا موقع دیا گیا۔ پھر اسے اسمبلی سے پاس کرا دیا گیا۔ یہ بل جس شکل میں منظور کیا گیا وہ اپنے مضمرات کے اعتبار سے مخلوط انتخاب سے بھی بدتر تھا۔ طے کیا گیا کہ مشرقی پاکستان کی صوبائی اسمبلی مخلوط طریقہ انتخاب کے ذریعے اور مغربی پاکستان کی جداگانہ انتخاب کے ذریعے منتخب کی جائے گی۔ قومی اسمبلی میں مشرقی پاکستان کے نمائندے مخلوط طریقے پر اور مغربی پاکستان کے نمائندے جداگانہ طریقے پر منتخب کئے جائیں گے۔ بظاہر یہ مفاہمت کی راہ تھی مگر اس نے نظریاتی اعتبار سے پاکستان کی وحدت کو دو دھڑوں میں تقسیم کر دیا تاہم چھ ماہ بعد اپریل ۱۹۵۷ء میں اس بل میں ترمیم کی دی گئی جس کے بموجب پورے ملک کے لئے مخلوط طریقۂ انتخاب کی منظوری دی گئی۔

انتخاب کے مسئلے نے جس بنا پر اتنی اہمیت اختیار کی ان میں سے ایک یہ تھی کہ یہ پاکستان کا نظریۂ اساسی تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مخلوط انتخاب اپنے اندر بڑے خطرناک عملی مضمرات رکھتا تھا۔ اس طریقے کے بموجب انتخابات منعقد کرانے کا مطلب یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں جہاں ہندو کل آبادی کا تقریباً ایک چوتھائی تھے وہاں مسلمان امیدوار منتخب ہونے کے لئے ہندوؤں کے رحم وکرم پر ہوں۔ ہندو من حیث المجموع جسے ووٹ دیتے وہی منتخب ہو سکتے تھے اور ظاہر ہے کہ ان کا ووٹ اسلام پسند جماعتوں کے بجائے ایسی جماعتوں یا امیدواروں کے حق میں جاتا جو اسمبلی میں ان کی مرضی کے تابع رہنا پسند کرتے۔ ہندو بھی اسی فائدے کی امید میں مخلوط انتخاب کے حامی تھے اور وہاں کی سیکولر جماعتیں بالخصوص عوامی لیگ بھی اس بنا پر مخلوط انتخاب کی حامی تھی کیونکہ اسے قوی امید تھی کہ اسلام پسند جماعتوں کے مقابلے میں وہ ہندوؤں کے ووٹوں کی حقدار بن جائے گی۔ بہرکیف طریقہ انتخاب کا مسئلہ طے ہونے کے بعد سیاسی جماعتیں

Marfat.com

انتخابات کی تیاریوں میں لگ گیئں جو فروری ۱۹۵۹ء میں ہونے والے تھے۔

۱۹۵۸ء کا مارشل لاء اور دستور کی تنسیخ

مگر میجر جنرل اسکندر مرزا جو ان دنوں صدر مملکت تھے انتخابات سے خوفزدہ تھے۔ کیونکہ شدید اندیشہ تھا کہ وہ انتخابات کے بعد صدر نہ بن سکیں گے جبکہ وہ اقتدار کے بے حد حریص تھے اور ان دنوں یہ خبر بہت عام تھی کہ انہوں نے ۱۹۵۶ء کے آئین کی اس شرط پر منظوری دی تھی کہ انہیں ہی صدر مقرر کیا جائے گا۔ دوسری طرف ایوب خان بھی عرصہ سے اسی قسم کی خواہش دل میں پال رہے تھے۔ چنانچہ ان دونوں نے مل کر اقتدار پر قبضہ کرنے کی سازش کی۔ ۸ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو اسکندر مرزا نے دستور منسوخ کر دیا۔ قومی اسمبلی توڑ دی (فیروز خاں نون کی) وزارت برطرف کر دی اور ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر مقرر کر دیا۔ یہ بہت بڑی بدقسمتی تھی جس میں ملک مبتلا ہوگیا اور اس نے انتخابات کے انعقاد کو غیر معینہ مدت کے لئے پس پشت ڈال دیا۔ اس واقعہ کے سلسلے میں اس امر کا تذکرہ غیر ضروری نہ ہوگا کہ اسکندر مرزا نے یہ سب کچھ اپنے اقتدار کی خاطر کیا مگر ہوس اقتدار میں انہوں نے ایک ایسی حماقت کی جو خود ان کے لئے "چاہ کن راہ چاہ در پیش" ثابت ہوئی۔ وہ حماقت دستور کو منسوخ کرنے کی تھی۔ حالانکہ وہ اسی دستور کے بموجب صدر بنے تھے۔ جس شاخ پر وہ بیٹھے تھے اسے خود اپنی کلہاڑی سے انہوں نے کاٹ ڈالا تھا۔ اب اقتدار کی کرسی پر فائز رہنے کے لئے وہ ایوب خاں کی مرضی کے محتاج ہوگئے۔ ایوب خان نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور صرف بیس دن بعد انہیں برطرف کر کے ملک بدر کر دیا۔

دستور کی منسوخی ایک بہت بڑا المیہ تھی کیونکہ یہ دستور بڑی مصیبتوں سے نو سال بعد بنا تھا۔ دستور کی محرومی نے ملک کو مرحوم جسٹس زیڈ۔ ایچ۔ لاری کے

Marfat.com

الفاظ میں ایک ایسی کشتی کے مماثل بنا دیا جو پتوار کے بغیر دریا کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہو۔ ان اقدامات کے ساتھ ساتھ سیاسی جماعتوں پر بھی پابندی عائد کر دی گئی تاکہ کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہ ہو۔

ایوب خان نے اس ملک پر ۴۴ ماہ تک بغیر قانون کے حکمرانی کی۔ انہوں نے برسر اقتدار آنے کے بعد ملک کا پارلیمانی جمہوریت کا ڈھانچہ توڑ دیا۔ بالغ رائے دہی کے بجائے بنیادی جمہوریتوں کا نظام قائم کیا اور اس کے مطابق ۱۹۵۹ء میں ملک بھر سے بنیادی جمہوریتوں کے لئے نمائندے منتخب کرائے۔ ایک سول کابینہ بھی بنائی مگر وہ عوام کے بجائے ان کی ذات کے آگے جواب دہ تھی۔ اسمبلی تو ختم ہو ہی چکی تھی عدلیہ بھی ان کے فرمانوں کے تابع بنا دی گئی۔ پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس کے ذریعے اخبارات کی آزادی سلب کر لی گئی اور متعدد اخبارات کو پریس ٹرسٹ کے ذریعے حکومت کے کنٹرول میں لے لیا گیا۔

۱۹۶۲ء کا دستور اور اسلام و جمہوریت کی پامالی

۴۴ ماہ کے بعد مطلق العنانی کا لیبل اتارنے کے لئے انہوں نے ایک آئین بنایا اور اسے آٹھ جون ۱۹۶۲ء کو نافذ کیا۔ اس آئین کی سفارشات تیار کرنے کے لئے قبل ازیں جناب جسٹس شہاب الدین کی سربراہی میں ۱۹۶۰ء میں ایک آئین کمیشن بنایا گیا تھا۔ کمیشن نے ایک مبسوط سوالنامہ کے ذریعے ملک کے اہل الرائے حضرات اور سیاسی جماعتوں سے آئینی تجاویز طلب کیں۔ اسلام پسند جماعتوں نے لاہور میں مجتمع ہو کر اس مسئلے پر غور و خوض کیا اور آئینی تجاویز مرتب کر کے کمیشن کو ارسال کیں۔ کمیشن نے اپنی آئینی سفارشات صدر ایوب کو پیش کر دیں مگر وہ چونکہ ان کی مرضی کے موافق نہ تھیں لہٰذا مسترد کر دی گئیں۔ پھر دوسرا آئینی مسودہ تیار کرایا گیا اور اسے بذریعہ آرڈیننس نافذ کر دیا گیا۔ یہ آئین ۱۹۵۶ء کے آئین کے

ان تمام اوصاف سے خالی تھا جو اسلامی نقطہ نظر سے اس میں موجود تھیں۔ قرارداد مقاصد کو اس کی بنیادوں میں بھی ڈالا گیا تھا مگر اس بنیاد پر جو عمارت تعمیر کی گئی تھی وہ بالکل سیکولر طرز کی تھی۔ صرف اس امر کا اقرار باقی رہنے دیا گیا تھا کہ کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہ ہوگا اور یہ کہ اسلامیات کی تعلیم لازمی ہوگی۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کی ایسی تمام دفعات جو اسلامی طرز زندگی کے قیام کے لئے مثبت اور ایجابی دفعات کی حیثیت رکھتی تھیں اس آئین کے دروازے سے باہر رکھی گئیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ بنیادی حقوق کو صدر کی مرضی پر موقوف کر دیا گیا کہ وہ جب چاہیں سلب کر لیں۔ یا معطل کر دیں۔

اس آئین کے نفاذ کے بعد ایک قومی اسمبلی بھی بنائی گئی مگر اس کا انتخاب بالغ رائے دہی کے بجائے بنیادی جمہوریت کے ارکان کے ذریعے کرایا گیا۔ اسمبلی کی حیثیت مقننہ کی نہ تھی بلکہ محض صدر کے لئے ایک مشاورتی ادارے کی تھی۔ صدر کی مرضی کے خلاف یہ قانون نہیں بنا سکتی تھی۔ بجٹ پاس نہیں کر سکتی تھی۔ وزرا کا محاسبہ نہیں کر سکتی تھی۔ عدالتیں بھی بے بس بنا دی گئیں تھیں کیونکہ بنیادی حقوق کے خلاف مقدمات کی سماعت کا اختیار ان سے سلب کر لیا گیا تھا۔ ان سب مطلق العنان اقدامات کے جواز کے لئے انہوں نے کنٹرولڈ ڈیماکریسی کی معصومانہ اصطلاح وضع کی تھی۔

۱۹۶۲ء کا آئین جب بنا تو سب کے لئے مایوسیاں پیدا کرنے کا موجب بنا۔ مشرقی پاکستان میں اس پر زیادہ مایوسی اور غم وغصہ پیدا ہوا۔ وہاں کی سیاسی جماعتوں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اعلان کیا کہ وہ اسے منسوخ کرانے کے لئے تحریک چلائیں گی۔ یہ صورت حال نہایت خطرناک تھی۔ مولانا مودودیؒ نے اس کی مضرت رسانی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا کیونکہ تحریک چلانے کا نتیجہ یہ ہو سکتا تھا کہ مارشل لا پھر سے واپس آجائے۔ ایوب خان کو اس کی نزاکت کا احساس دلانا مشکل تھا وہاں کی سیاسی جماعتوں کو گفت وشنید کے ذریعے محاذ آرائی سے روکنا نسبتاً زیادہ

Marfat.com

قرین امکان تھا۔ چنانچہ مولانا مودودیؒ نے سیاسی جماعتوں سے رابطہ پیدا کیا ان کی کل جماعتی میٹنگیں بلائیں اور انہیں اس امر کا احساس دلایا کہ جو آئین ایوب خان نے بنایا ہے وہ اگرچہ امر جائز (DE JURO) نہیں ہے مگر وہ برسر اقتدار ہیں اور اس حیثیت میں اسے نافذ کر چکے ہیں لہذا یہ دستور امر واقعہ (DE FACTO) ضرور ہے۔ امر واقعہ دستور سے گریز کا راستہ تباہی لاتا ہے لہذا امر واقعہ کی حیثیت سے اس دستور کو گوارا کر لیا جائے اور پھر اس میں آئینی جدو جہد کے ذریعے ترمیمیں تجویز کر کے اسے بہتر بنانے کی کوشش کی جائے جیسے اس سے پہلے آئینی جدو جہد کے ذریعے قرار داد مقاصد پاس کرائی گئی یا عارضی دستور کی اسکیم سے ملک کو بچایا گیا یا ۱۹۵۶ء کا آئین بنوایا گیا۔

دیگر جماعتوں سے مذاکرات کے نتیجے میں سیاسی جماعتوں کا ایک اتحاد قائم ہوا جس کا نام متحدہ حزب اختلاف (COP) رکھا گیا۔ اس میں جماعت اسلامی کونسل مسلم لیگ، عوامی لیگ، نظام اسلام پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ) وغیرہ شامل ہوئیں۔ یہ مولانا مودودیؒ کی بہت بڑی کامیابی تھی جس نے مشرقی پاکستان کو محاذ آرائی کے راستے پر گامزن ہونے سے روک دیا۔

آئین کے نفاذ کے بعد ایوب خان مارشل لا کے گھوڑے سے اتر گئے اب انہیں کسی سیاسی جماعت کے گھوڑے کی تلاش تھی جس پر وہ سوار ہوں کیونکہ اسمبلی بنانے کے بعد اسے پارٹی سسٹم پر استوار کرنا مروجہ قاعدے کا لازمی تقاضا تھا۔ ان کی نگاہ انتخاب مسلم لیگ پر پڑی لہذا انہوں نے مسلم لیگ کو ہمنوا بنانا چاہا ان کی اس کوشش میں مسلم لیگ دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ جو گروہ ان کا ہمنوا بنا، کنونشن مسلم لیگ کہلایا اور جو دھڑا ان کے زیر اثر آنے سے گریزاں رہا، کونسل مسلم لیگ کہلایا۔ ایوب خان کنونشن مسلم لیگ کے صدر بن گئے جبکہ کونسل مسلم لیگ متحدہ حزب اختلاف (COP) میں شامل ہو گئی۔

ایوب خان نے اسلام کی کوئی خدمت نہ کی یہ ایک سلبی بات تھی۔ ایجابی

بات یہ تھی کہ انہوں نے بعض ایسے احکام جاری کئے جن کی ہمت انگریز بھی نہ کرسکے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے عائلی قوانین تبدیل کر ڈالے۔ اس کام کے لئے پہلے انہوں نے ایک فیملی لاء کمیشن قائم کیا۔ اس میں ایوب خان کی مرضی کے بموجب تعدد ازدواج، طلاق، خلع، پوتے کی وراثت اور ان جیسے طے شدہ مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا اور ان امور میں مغربی تہذیبی افکار کے زیر اثر اصلاحات اور تبدیلیاں تجویز کی گئیں۔ مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ایوب خان کے نام ایک خط میں انہیں خدا کا خوف دلایا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے نشتر پارک کراچی میں ایک جلسہ عام منعقد کر کے اس موضوع پر نہایت مدلل تقریر فرمائی اور اس کی تمام خامیاں بیان فرمائیں مگر ایوب خان نے ان باتوں کا مطلقاً کوئی اثر نہ لیا اور اسے اپنی قوت مقتدرہ کے زور پر ۲ مارچ ۱۹۶۱ء سے نافذ کر دیا۔

اُن کی حکومت نے صرف اس پر اکتفا نہ کیا کہ اسلامی اصولوں سے انحراف کی بنیاد پر عائلی قوانین نافذ کئے بلکہ بعض دیگر امور میں بھی اسلام کے مسلمہ قوانین اور طے شدہ حلت و حرمت کو بحث و تمحیص کا موضوع بنا دیا۔ اسلامی تحقیقی کونسل کا صدر ڈاکٹر فضل الرحمٰن نام کے ایک صاحب کو بنا دیا گیا جو اسلام کے معاملے میں گمراہی کی حد تک آزاد خیال تھے۔ انہوں نے سود کی حرمت کو مباحثے کا موضوع بنوایا اور ربوٰا کو صرف مہاجن کے سود تک محدود کر کے بنکوں کے سودی کاروبار کے لئے جواز کا دروازہ کھولنا چاہا۔ قربانی کی فرضیت کے بارے میں شک و شبہ پیدا کرنے اور ذبیحہ کے علاوہ جھٹکے کے گوشت کی حلت کی گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی اس نوع کی گستاخیوں سے ملت اسلامی تنگ آگئی اور انہیں برطرف کرنے کا شدید مطالبہ کیا گیا مگر ایوب خان کی حکومت نے کوئی اثر قبول نہ کیا۔ اس کے برعکس ان کی حکومت نے سرکاری قرضے حاصل کرنے کے لئے پرائز بونڈ کی وبا پھیلائی جس نے انعام حاصل کرنے کے لئے قوم کے بچے بچے

Marfat.com

کے دل میں سودی سرمایہ کاری کے لئے لالچ پیدا کر دی ۔ رویت ہلال کے سلسلے میں علماء کرام کے دائرہ کار میں اتنی بے جا مداخلت کی کہ عیدیں دو تاریخوں میں تقسیم ہوگئیں ۔ سرکاری رویت ہلال کے مطابق عید نہ منانے والے علماء کرام مثلاً مولانا احتشام الحق تھانوی ، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اور مولانا اظہر حسین زیدی وغیرہ کو جیل میں بند کرا دیا ۔ اوقاف کا محکمہ قائم کیا مگر اسے علماء کرام کو سرکاری اثر میں لے آنے کے لئے بطور حربے کے استعمال کیا غرضیکہ ان کے دور حکومت میں اسلام نہایت مظلوم رہا ۔

ایوب خان کا دور حکومت چونکہ ایک مطلق العنان طرز حکومت کا دور تھا جس میں جمہوری اداروں کو مسمار یا مفلوج کر دیا گیا تھا اس لئے اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں مطلق العنان طرز حکومت حائل ہو گیا ۔ ظاہر ہے کہ اس طرز حکومت کی موجودگی میں اسلامی نظام کے قیام کی کوشش ثمر آور نہیں ہو سکتی تھی لہٰذا فوری طور پر حل طلب مسئلہ یہ تھا کہ ملک میں جمہوریت واپس لائی جائے کیونکہ ان حالات میں جمہوری اداروں کو بحال کرائے بغیر اسلامی نظام کے قیام کی کوئی جد و جہد ممکن العمل نہ تھی ۔ متحدہ حزب اختلاف (COP) میں شامل ایسی جماعتوں کو بھی جنہیں اسلامی نظام سے دلچسپی نہ تھی جمہوریت کی بحالی ضرور عزیز تھی اس لئے جمہوریت کی بحالی سب کی مشترکہ دلچسپی کا موضوع بنی اور جمہوریت کی بحالی کے لئے مشترکہ جد و جہد کا پروگرام بنایا گیا ۔ ۱۹۶۴ء کے آخر میں بنیادی جمہوریتوں کی دوسری میعاد کے انتخابات کا اعلان کیا گیا ۔ متحدہ حزب اختلاف نے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کے ذریعے ان انتخابات میں حصہ لیا جس میں ان کے امیدواروں کی معتدبہ تعداد منتخب ہوئی ۔

جنوری ۱۹۶۵ء میں ایوب خان نے صدارتی انتخابات کا اعلان کیا ۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ صدر کا انتخاب بنیادی جمہوریت کے ممبروں کے ذریعے ہونا ہے جن

Marfat.com

کی تعداد ملک بھر میں صرف (۸۰) ہزار ہے لہٰذا وہ دھونس کی قوت استعمال کرکے آسانی سے دوبارہ صدر منتخب ہو جائیں گے۔ ان انتخابات میں حزب اختلاف نے جنرل (ریٹائرڈ) اعظم خان کو اپنا امیدوار بنا کر کھڑا کرنے کا ارادہ کیا کیونکہ وہ مشرقی پاکستان کے گورنر رہ چکے تھے اور اس دوران وہاں بیحد مقبول ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ متحدہ حزب اختلاف کی ایک شریک جماعت نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ) درپردہ طور پر ایوب خان سے مل گئی کیونکہ اس جماعت میں غالب اکثریت کمیونسٹوں کو حاصل تھی اور وہ چاہتے تھے کہ صدارت کی کرسی پر ایوب خان ہی براجمان رہیں تاکہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی تحریک اور کمیونزم جو آمریت کے سائے میں ہی فروغ پا سکتا تھا، مزید فروغ حاصل کر سکے لہٰذا اعظم خان کے مقابلے میں کم زور امیدوار سمجھ کر مولانا بھاشانی نے مادر ملت کا نام تجویز کر دیا۔ ان کا منصوبہ تھا کہ اگر ان کی تجویز نہیں مانی گئی تو اس بہانے سے وہ متحدہ حزب اختلاف سے نکل آئیں گے اور اگر مان لی گئی تو مادر ملت اعظم خان کے برخلاف کمزور امیدوار ثابت ہوں گی مگر بھاشانی صاحب کا منصوبہ ناکام ہو گیا کیونکہ متحدہ حزب اختلاف نے ان کی تجویز منظور کر لی اور مادر ملت کو صدارتی امیدوار بنا دیا۔ جب مولانا بھاشانی کی یہ چال ناکام ہو گئی تو وہ بیمار پڑ گئے اور اس طرح مادر ملت کے حق میں انتخابی مہم چلانے سے گریز کا انہوں نے موقع حاصل کر لیا[1]۔ مادر ملت ایک ضعیف العمر خاتون ہونے کے باوجود ایک مطلق العنان

---

[1] متحدہ حزب اختلاف کی مخالفت کرنے میں دو اور وجوہات بھی مضمر رہیں۔ مولانا بھاشانی کو قریب سے جاننے والوں کا کہنا ہے کہ وہ ذاتی وجوہات کی بنا پر مجیب الرحمٰن کے سخت دشمن تھے۔ مجیب الرحمٰن کی جماعت عوامی لیگ چونکہ متحدہ حزب اختلاف (ہ ہ ح) میں شامل تھی اس لئے انہیں اندیشہ تھا کہ اگر متحدہ حزب اختلاف کا امیدوار

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حکمران کے مقابلے میں جمہوریت کی علم بردار تھیں اور قائد اعظم کی ہمشیرہ ہونے کی بنا پر قدر و منزلت کی حامل لہٰذا پوری قوم ان کی پشت پناہی کے لئے کھڑی ہو گئی مگر ووٹ دینے کا اختیار عوام الناس کے بجائے بنیادی جمہوریت کے ارکان کے ہاتھ میں تھا اس لئے ان پر اثر انداز ہو کے ووٹ حاصل کرنے میں ایوب خان کامیاب ہو گئے اور دوبارہ صدر بن گئے۔ صدارت کے منصب پر دوبارہ ان کے تقرر سے قوم بڑی مایوسی میں مبتلا ہو گئی۔ تاہم جمہوریت کی بحالی کی تحریک پھر بھی قائم رہی اور مشترکہ پلیٹ فارم کے ذریعے ہی اس تحریک کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ متحدہ حزب اختلاف کی جگہ پر حزب اختلاف کی جماعتوں کا ایک نیا اتحاد قائم ہوا اور اس کا نام پاکستان تحریک جمہوریت (P.D.M) رکھا گیا۔ اس میں جماعت اسلامی، کاؤنسل مسلم لیگ، نظام اسلام پارٹی، قومی جمہوری محاذ اور عوامی لیگ (نصر اللہ خان گروپ) شامل تھی۔ اس نے جمہوریت کی بحالی کے لئے ایک آٹھ نکاتی فارمولا تیار کیا جس میں اس امر کا مطالبہ کیا گیا کہ ملک میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات کرائے جائیں اور پارلیمانی طرز کی وفاقی حکومت قائم کی جائے۔

پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ

کامیاب ہو گیا تو مجیب الرحمٰن کی مقبولیت اور اثر و رسوخ میں اضافہ ہو جائے گا۔ دوسری وجہ، پروفیسر غلام اعظم کے الفاظ میں یہ تھی اور جو اخبارات میں بھی خاصی عام ہوئی کہ ایوب خاں کی کابینہ کے وزیر جناب ذوالفقار بھٹو سے ان کا ایک خفیہ معاہدہ ہو گیا تھا جس کے بموجب طے پایا تھا کہ صدارتی انتخاب میں وہ (بالواسطہ) ایوب خاں کی حمایت کریں گے۔ اس امر کا دعویٰ خان عبدالولی خان نے بھی کیا ہے (ملاحظہ ہو حمود الرحمٰن کمیشن میں ولی خاں کا بیان) کہ اس مقصد کے لئے بھٹو نے بھاشانی کو نقدی رشوت دی تھی۔

Marfat.com

گول میز کانفرنس اور اس کی سبوتاژ کاری

۲۰ نومبر ۱۹۶۸ء سے ملک بھر میں ایوب خان کے خلاف تحریک شروع کر دی گئی ۔ اوّل اوّل تو انہوں نے اس تحریک اور اس کے مطالبات کو درخور اعتنا نہ سمجھا مگر گذران وقت کے ساتھ یہ تحریک شدت اختیار کرتی چلی گئی ۔ یہاں تک کہ پاکستان تحریک جمہوریت کی اپیل پر ۱۴ فروری ۱۹۶۹ء کو آٹھ (۸) نکاتی مطالبے کی حمایت میں ملک گیر ہڑتال کی گئی ۔ وہ ہڑتال ایسی بے نظیر اور اتنی کامیاب تھی کہ پورے ملک پر قبرستان کا سا سناٹا چھا گیا ۔ پھر ایوب خان کے خلاف سڑکوں پر شدید ترین قسم کے مظاہرے شروع ہو گئے ۔ ان سب باتوں کے باوجود ایوب خان کے طرفدار انہیں باور کراتے رہے کہ یہ محض چند گنے چنے افراد کی ہنگامہ آرائی ہے ۔ یہاں تک کہ ہڑتالوں اور مظاہروں کے بعد بھی انہیں یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ اگر ملک میں ریفرنڈم کرایا جائے تو قوم اُن کا ساتھ دے گی ۔ اپنے خلاف اتنی موثر ہڑتال اور شدت کے مظاہرے دیکھ کر ایوب خان کو آخر کار یقین ہو گیا کہ قوم اب ان کی مخالف ہو چکی ہے اور مصدقہ روایات کے مطابق انہوں نے ریفرنڈم کرانے کا مشورہ دینے والوں کو جواب دیا کہ "سڑکوں پر جو کچھ ہو رہا ہے یہی ریفرنڈم ہے" یہ صورت حال دیکھ کر وہ اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ انہوں نے ۲۱ فروری ۱۹۶۹ء کو ایک نشری تقریر کی جس میں حزب اختلاف کے مطالبات پر غور کرنے کے لئے گول میز کانفرنس منعقد کرانے کا اعلان کیا اور صدارت کے منصب سے دستبردار ہونے کے فیصلے کا اعلان کیا ۔

یہ عوامی جدوجہد کی بہت بڑی کامیابی تھی جس نے ملک میں جمہوریت کی بحالی کا دروازہ کھول دیا تھا مگر ملک کی بدقسمتی کہ کانفرنس کی میز پر بھی اور کانفرنس کے کمرے سے باہر بھی بعض لوگوں کی طرف سے ایسی معاندانہ حرکتیں

کی گئیں کہ قدموں کے نیچے آئی ہوئی منزل پھر سے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مذاکرات کو ناکام بنانے کے لئے چار آدمیوں نے سب سے خطرناک کردار انجام دیا۔ ان میں سے ایک مولانا بھاشانی تھے۔ دوسرے ذوالفقار علی بھٹو، تیسرے مجیب الرحمٰن اور چوتھے یحییٰ خان۔ مولانا بھاشانی اور ذوالفقار علی بھٹو نے کانفرنس کو ناکام بنانے کے لئے پبلک پلیٹ فارم کو استعمال کیا جبکہ مجیب الرحمٰن نے اپنا کردار کانفرنس کی میز پر انجام دیا۔ ان تینوں کو اپنا اپنا کردار ادا کرنے کے لئے اخلاقی اور عملی امداد یحییٰ خاں نے فراہم کی۔

مولانا بھاشانی نے ملک بھر میں گھیراؤ اور جلاؤ کی تحریک شروع کر دی۔ صنعت کاروں اور اہل ثروت کے خلاف اشتعال پیدا کیا اور ان کے کارخانوں میں آگ لگوائی۔ اس مقصد کے لئے وہ کراچی بھی آئے اور یہاں انہوں نے لانڈھی میں مزدوروں کو مشتعل کر کے کارخانوں میں آگ لگوائی۔ مشرقی پاکستان میں لوگوں کو درختوں کے ساتھ کیلوں سے ٹھونک ٹھونک کر ہلاک کرایا اور تخریبی کارروائیوں کے لئے، ایک اطلاع کے مطابق، جس کی بعد میں سرکاری ذرائع نے بھی تصدیق کی، ۳۰ ہزار گوریلے ہندوستان سے درآمد کرائے۔ دوسری طرف ذوالفقار بھٹو نے "ہمیں آئین نہیں چاہیئے، آئین سے پیٹ نہیں بھرتا، ہمیں روٹی چاہیئے" کا نعرہ بلند کیا اور گول میز کانفرنس کا بائیکاٹ کر دیا۔ ان دونوں کی ان اشتعال انگیز کارروائیوں سے ملک بد امنی کی لپیٹ میں آ گیا اور امن و امان کی بحالی کا مسئلہ اولین اہمیت اختیار کر گیا۔

کانفرنس کی میز پر مجیب الرحمٰن نے بھی اسی قسم کا معاندانہ رویہ اختیار کیا حالانکہ ایوب خان نے انہیں جیل سے رہا کر کے کانفرنس میں بلایا تھا۔ انہیں اگرتلہ سازش کیس میں ملوث ہونے کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ اس سازش میں منصوبہ بنایا گیا تھا کہ بھارت کی مدد سے مشرقی پاکستان کو پاکستان سے علیحدہ کر دیا جائے۔ اس مطلوبہ آزاد مملکت کے لئے جھنڈا بھی تیار کر لیا گیا تھا اور ترانہ بھی۔

Marfat.com

باقی تفصیلات بھی طے کر لی گئیں تھیں۔ (واضح ہو کہ اس وقت بنگلہ دیش میں جو جھنڈا سرکاری پرچم کی اور جو ترانہ قومی ترانے کی حیثیت رکھتا ہے وہ وہی ہے جو اگرتلہ سازش کیس کے ملوثین نے تیار کیا تھا)۔ اس سازش کے سرغنہ مجیب الرحمٰن تھے۔ اس پر عمل درآمد سے پہلے ہی سازش پکڑی گئی[1] مجیب الرحمٰن اور سازش میں ملوث دوسرے تمام اہم افراد گرفتار کر لئے گئے۔ ایوب خان نے اس سازش کی تحقیقات کے لئے سپریم کورٹ کے جج جناب جسٹس ایس۔ اے رحمٰن (مرحوم) کی سربراہی میں ایک تحقیقاتی ٹریبونل مقرر کر دیا۔ مجیب الرحمٰن اپنی اس گرفتاری پر سخت متوحش تھے اور انہیں اپنا انجام نہایت بھیانک نظر آنے لگا تھا۔ وہ اس قدر سراسیمہ تھے کہ باخبر حلقوں کی اطلاع کے مطابق وہ معافی نامہ لکھ کر دینے اور سیاست سے ہمیشہ کے لئے دست کش ہونے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ جب گول میز کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا تو حکومت نے مجبوراً مجیب الرحمٰن کو بھی مدعو کیا کیونکہ کانفرنس میں شرکت کرنے والی آٹھ جماعتوں میں سے، خان عبدالولی خان کے الفاظ میں، چار جماعتوں کو جن میں خود ان کی نیشنل عوامی پارٹی، کاؤنسل مسلم لیگ، جمعیت علماء اسلام اور عوامی لیگ شامل تھی، اس بات پر مصر تھیں کہ مجیب الرحمٰن کو شرکت کے لئے ضرور مدعو کیا جائے۔ انہیں اس مسئلے پر اس شدت کے ساتھ اصرار تھا کہ بصورت دیگر وہ کانفرنس میں شرکت پر تیار نہ تھیں جبکہ باقیماندہ جماعتوں کا جن میں جماعت اسلامی، نظام اسلام پارٹی، قومی جمہوری محاذ اور عوامی لیگ (نصر اللہ خاں گروپ) شامل تھی۔ موقف اس کے برعکس تھا

---

[1] یہ سازش بھارتی حکومت کے اشتراک سے تیار کی گئی تھی جس میں بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اور مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ بطور خاص شریک تھے۔ پاکستان آرمی کے متعدد بنگالی افسران بھی اس سازش میں شریک تھے۔ اگر بھارت اس میں برابر کا شریک نہ ہوتا تو پکڑے جانے پر مجیب الرحمٰن اس قدر سراسیمہ نہ ہوتے۔

Marfat.com

ایوب خان کو اول الذکر چار جماعتوں کے دباؤ کے آگے جھکنا پڑا۔ مجیب الرحمٰن کو مدعو کرنے کے لئے پیرول (عارضی رہائی) پر رہا کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ادھر جو لوگ اس امر کے لئے کوشاں تھے کہ کانفرنس ناکام ہو جائے انہوں نے کوشش کی کہ مجیب الرحمٰن پیرول پر رہا ہو کر کانفرنس میں شریک ہونے سے انکار کر دیں اور کانفرنس میں اپنی شرکت کو اپنی مکمل رہائی کے ساتھ مشروط کر دیں مقصد یہ تھا کہ مجیب الرحمٰن جو چھ نکاتی فارمولے کے نقیب تھے، پوری مضبوطی کے ساتھ کانفرنس میں اپنے موقف پر ڈٹ سکیں۔ واضح رہے کہ وہ اپنا چھ نکاتی فارمولا جنوری ۶۶ء میں ہی منظر عام پر لا چکے تھے [۱] اس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ دفاع اور خارجہ پالیسی کے ماسوا تمام محکمے صوبوں کے حوالے کر دیئے جائیں۔ سکہ بھی ملک کے دونوں بازوؤں کا ترجیحاً علیحدہ علیحدہ ہو جس میں مشرقی پاکستان کے سکے پر ڈھاکہ اور مغربی پاکستان کے سکے پر لاہور لکھا ہو۔ بیرونی تجارت بھی علیحدہ علیحدہ ہو۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ چھ نکاتی فارمولے کو ۱۹۴۰ء کی قرار داد لاہور کا عین تقاضا قرار دیا گیا تھا۔ اس فارمولے کی پہلی شق کی تشریح میں یہ عبارت رقم کی گئی تھی کہ:

> "قرار داد لاہور کے بموجب پاکستان کا قیام جداگانہ دو آزاد خود مختار ریاستوں کی شکل میں عمل میں آنا چاہئے تھا جن میں سے ایک ریاست شمال مغربی علاقے یعنی سرحد، پنجاب، سندھ،

---

[۱] چھ نکاتی فارمولا مجیب الرحمٰن نے پہلی بار نیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لاہور میں جنوری ۱۹۶۶ء میں پیش کیا تھا۔ یہ کانفرنس حزب اختلاف کی جماعتوں کی مشترکہ کانفرنس تھی جو معاہدہ تاشقند کے مضمرات پر غور کرنے کے لئے لاہور میں منعقد کی گئی تھی۔ کانفرنس نے اس فارمولے کو پاکستان کی وحدت کے لئے ہلاکت خیز قرار دے کر یکسر مسترد کر دیا تھا

Marfat.com

اور بلوچستان پر مشتمل ہوتی اور دوسری ریاست مشرقی علاقے یعنی بنگال اور آسام پرلے۔

پاکستان کے بننے کے ۱۹ سال بعد پاکستان کی یہ تشریح کہ اسے ایک کے بجائے دو جداگانہ ریاستوں کی شکل میں تشکیل پانا چاہیئے تھا بڑی ہٹ دھرمی کی

لے چھ نکات کا مکمل متن درج ذیل ہے ۔

۱۔ دستور قرار داد لاہور کی بنیاد پر صحیح معنوں میں پاکستان کا وفاق قائم کرے جس میں پارلیمانی نظام حکومت اور مقننہ کو بالادستی حاصل ہو۔ یہ مقننہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست منتخب کی جائے۔

واضح ہو کہ قرار داد لاہور کے بموجب پاکستان کا قیام جداگانہ دو آزاد اور خود مختار ریاستوں کی شکل میں عمل میں آنا چاہیے تھا جن میں سے ایک ریاست شمال مغربی علاقے یعنی سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ہوتی اور دوسری ریاست مشرقی علاقے یعنی بنگال اور آسام پر۔

۲۔ وفاقی حکومت کو صرف دو معاملات میں اختیارات حاصل ہوں۔ دفاع اور امور خارجہ۔ باقی تمام امور وفاق کی تشکیل کرنے والی ریاستوں کی تحویل میں ہوں۔

۳۔ کرنسی کے بارے میں ان دو میں سے کوئی ایک اقدام کیا جائے۔

(الف) دونوں بازوؤں کے لئے دو جداگانہ اور آزادی سے قابل مبادلہ نظام ہائے زر رائج کئے جائیں۔ مشرقی پاکستان کی کرنسی پر ڈھاکہ اور مغربی پاکستان کی کرنسی پر لاہور لکھا ہو۔

(ب) پورے ملک کے لئے کرنسی کا ایک ہی نظام ہو لیکن دستور میں ایسی مؤثر دفعات ہونی چاہیئں جو سرمائے کو مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان جانے سے روک سکیں۔ مشرقی پاکستان کے بنکوں میں علیحدہ

باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

Marfat.com

بات تھی۔ پاکستان کو دولخت کرنے کے لئے قرارداد لاہور سے یہ استنباط بالکل ویسا ہی تھا جیسے کوئی شخص نماز ترک کرنے کے لئے قرآن مجید سے استنباط کرنے کی کوشش کرے۔ قرار داد لاہور کی عبارت میں ہرگز اس قسم کی بات نہ تھی۔ بات

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

زر محفوظ ہو اور مشرقی پاکستان کے لئے علیحدہ مالیاتی پالیسی اختیار کی جائے۔

۴۔ ٹیکس لگانے اور محاصل جمع کرنے کے اختیارات وفاق کی تشکیل کرنے والی ریاستوں کو حاصل ہوں۔ وفاقی مرکز کو ٹیکس لگانے کا اختیار نہ ہو۔ ریاستیں جو ٹیکس وصول کریں گی ان میں سے وفاق کے اخراجات چلانے کے لئے مرکز کو ایک خاص فیصد ادا کی جائے گی۔

۵۔ (الف) دونوں بازو جس قدر زرمبادلہ کمائیں اس کے علیحدہ علیحدہ حسابات ہونے چاہئیں۔

(ب) مشرقی پاکستان جو زرمبادلہ کمائے گا اس پر مشرقی پاکستان کو کنٹرول ہوگا۔ یہی اختیار مغربی پاکستان کی حکومت کو اپنے زرمبادلہ پر ہوگا۔

(ج) وفاقی حکومت کی زرمبادلہ کی ضروریات دونوں ریاستوں کی طرف سے مساوی طور پر یا طے شدہ نسبت سے پوری کی جائیں۔

(د) ملکی مصنوعات ایک بازو سے دوسرے بازو تک کسی ڈیوٹی کے بغیر آزادانہ منتقل کی جاسکیں گی۔

(ھ) دستور وفاقی حکومتوں (یعنی مغربی اور مشرقی پاکستان) کو یہ اختیار دے گا کہ وہ ممالک خارجہ سے لین دین کے تعلقات و تجارتی سفارتیں قائم کرسکیں۔ وہ ان کے ساتھ معاہدات میں شریک ہونے کی بھی مجاز ہوں گے۔

۶۔ مشرقی پاکستان کے لئے علیحدہ ملیشیا فوج قائم کی جائے۔

Marfat.com

صرف اس قدر تھی کہ مطلوبہ مسلم ریاست کے لئے لفظ STATE کے بجائے STATES ٹائپ کیا گیا تھا۔ ۱۹۴۰ء کی لاہور کانفرنس کے شرکاء کا کہنا ہے کہ یہ محض ٹائپ کی غلطی تھی۔ کیونکہ اس قرارداد کی منظوری کے بعد صرف مسلمانوں نے نہیں بلکہ ہندوؤں اور انگریزوں نے بھی اس کا مطلب ایک ہی ریاست سمجھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر قرارداد لاہور کی عبارت سے ذرا سا بھی یہ مفہوم نکلتا کہ مسلمان دو مسلم ریاستیں چاہتے ہیں تو وہ اسے خوب اچھالتے اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے دو ٹکڑے کئے بغیر نہ رہتے۔ ہندو اور انگریز اسے دو ٹکڑے کرنے کے لئے ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء تک ریشہ دوانیاں کرتے رہنے کی زحمت کیوں اٹھاتے؟ خود مسلمانوں کے ذہن میں بھی ایک ہی ملک کا قیام مقصود تھا۔ اگر ایک کے بجائے دو ریاستیں مقصود ہوتیں تو ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کبھی نہ کبھی اس کے لئے مسلمان ضرور آواز بلند کرتے۔ بہرکیف یہ غلطی خواہ ٹائپ کرنے کی ہو یا STATES کا لفظ کسی وجہ سے عمداً لکھا گیا ہو پاکستان بننے سے پہلے مسلم لیگ کے ذہن میں ایک ہی ریاست کا قیام مقصود تھا اور مسلم لیگ کی قیادت کو اس غلطی کا جو سہواً سرزد ہوئی یا عمداً پاکستان بننے سے پہلے ہی علم ہو گیا تھا اور اس نے پاکستان بننے سے پہلے ہی اس کی اصلاح کر دی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی میں ایک ترمیمی قرارداد منظور کی گئی جس میں STATES کی جگہ پر STATE کا لفظ رقم کیا گیا۔ یہ ترمیمی قرارداد مجیب الرحمٰن کے سیاسی پیشوا جناب حسین شہید سہروردی نے پیش کی تھی۔ چنانچہ جب مجیب الرحمٰن نے اپنا فارمولا حزب اختلاف کی جماعتوں کے اجلاس منعقدہ لاہور میں پیش کیا تھا تو اسے یکسر مسترد کر دیا گیا تھا۔

مگر جب مجیب الرحمٰن اس دوران، اس فارمولے کی حمایت میں اپنے صوبے کی رائے عامہ ہموار کر کے صوبے کے سب سے طاقتور لیڈر بن چکے تھے۔ ان کی اس طاقت وری سے فائدہ اٹھانے کے لئے بروایت ملک غلام جیلانی، یحیٰی خاں نے گول میز کانفرنس سے ذرا قبل خفیہ طور پر مجیب الرحمٰن کو پیغام بھیجا کہ وہ بیرول

Marfat.com

پر رہا ہو کر آنے سے انکار کر دیں اور کانفرنس میں شرکت کے لئے اپنی مکمل رہائی پر اصرار کریں ۔ دوسری طرف انہوں نے (یحییٰ خان نے) مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ایک مرکزی وزیر وحید الزمان کو یہاں بلوایا ۔ مقصد یہ تھا کہ وہ ایوب خان کو چھ نکات کے معاملے میں کوئی نرمی اختیار کرنے سے روکیں ۔ اس طرح یحییٰ خان نے بیک وقت دو باہم متضاد کردار ادا کئے ۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا ۔ مجیب الرحمٰن نے پیرول پر رہا ہو کر آنے سے انکار کر دیا ۔ اس کی وجہ سے کانفرنس کے انعقاد میں تعطل پیدا ہو گیا اور کانفرنس جے ۲ فروری کو شروع ہونی تھی، ملتوی کر دی گئی ۔ ایوب خان مجیب الرحمٰن کو مکمل طور پر رہا کرنے پر تیار نہ تھے مگر ان پر اس قدر دباؤ ڈالا گیا کہ ناچار انہیں مجیب الرحمٰن کو رہا کرنا پڑا ۔ رہائی کے بعد ان کے خلاف سازش کا مقدمہ ختم کر دیا گیا اور ٹریبونل توڑ دیا گیا ۔ جو رہائی معافی نامہ لکھنے پر بھی انہیں حاصل نہ ہو سکی تھی یحییٰ خان کی چالوں کی بدولت بغیر کسی شرط کے انہیں حاصل ہو گئی ۔ اب مجیب الرحمٰن ایک فتح مند لیڈر تھے ۔ ان کی آمد کے بعد ۱۰ مارچ ۱۹۶۹ء سے کانفرنس شروع ہوئی ۔ اس میں پاکستان تحریک جمہوریت (PDM) کی پانچوں جماعتوں (جماعت اسلامی، مسلم لیگ، نظام اسلام پارٹی، قومی جمہوری محاذ اور عوامی لیگ (نصراللہ خان گروپ) کے علاوہ تین مزید جماعتوں نے بھی شرکت کی جو نیشنل عوامی پارٹی (ولی خان گروپ) جمعیت علمائے اسلام یا جسٹس پارٹی اور عوامی لیگ مجیب گروپ تھیں [1]

کانفرنس میں حزب اختلاف کی جماعتوں کا پیش کردہ آٹھ نکاتی مطالبہ زیر غور آیا ۔ اس کے چھ نکات تو ضمنی اہمیت کے حامل تھے جن میں دفعہ ۱۴۴ ختم کرنے مزدوروں کو ہڑتال کا حق دینے، میاں افتخار الدین کا پریس بحال کرنے کے مطالبات تھے ۔ صرف دو نکات بنیادی نوعیت کے تھے ۔ ایک یہ تھا کہ ملک میں مروجہ صدارتی طرز حکومت ختم کر کے

لہ آٹھ جماعتوں کا یہ مجموعہ جمہوری مجلس عمل (DAC) کہلایا ۔

پارلیمانی نظام قائم کیا جائے اور دوسرا یہ تھا کہ بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کے ذریعے اسمبلی منتخب کرنے کا طریقہ ختم کر کے بالغ رائے دہی کا نظام واپس لایا جائے۔ چونکہ ایوب خان ۲۱ فروری ۱۹۶۹ء کی نشری تقریر میں صدارت سے سبکدوشی کا اعلان کر چکے تھے اس لئے اقتدار کی منتقلی کا مسئلہ بھی اس کے ساتھ منسلک ہو گیا تھا۔

ایوب خان نے آٹھ نکاتی مطالبے کو تسلیم کر لیا۔ اقتدار کی منتقلی کے لئے انہوں نے عملی صورت یہ تجویز کی کہ ۱۹۶۲ء کے مروجہ آئین کے بموجب وہ اقتدار اس وقت کی قومی اسمبلی کو منتقل کر دیں گے۔ یہ اسمبلی بالغ رائے دہی کے مطابق ملک میں عام انتخابات کرائے گی۔ انتخابات کے بعد تشکیل پانے والی اسمبلی پارلیمانی طرز کی جمہوریت بحال کرے گی۔ یہی حزب اختلاف کی جماعتوں موسوم بہ جمہوری مجلس عمل کا مطالبہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ حزب اختلاف کی جماعتیں پہلے ۱۹۵۶ء کا آئین بحال کرانے کی خواہاں تھیں جس کا مطلب (غالباً) یہ تھا کہ ایوب خان اقتدار اپنی اسمبلی کو منتقل نہ کریں بلکہ ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات کرائیں پھر اقتدار اسمبلی کو منتقل کریں جو ۱۹۵۶ء کے آئین کے مطابق پارلیمانی جمہوریت بحال کرے۔ مگر حزب اختلاف ایوب خان کے تجویز کردہ طریقہ کار پر راضی ہو گئی کیونکہ اگر ۱۹۶۲ء کے آئین میں اتنی ترمیم کر دی جاتی کہ صدارتی کے بجائے پارلیمانی طرز حکومت ہوتا اور بنیادی جمہوریتوں کی بجائے بالغ رائے دہی کا طریقہ تو ۱۹۶۲ء کا آئین قریب قریب ۱۹۵۶ء کے آئین کی شکل اختیار کر لیتا لیکن مجیب الرحمٰن نے کانفرنس میں، نہایت غیر متوقع طور پر اپنا چھ نکاتی فارمولا پیش کر دیا اور اصرار کیا کہ قتدار کی منتقلی ان کے فارمولے کے بموجب عمل میں لائی جائے۔ انہوں نے یہ دلچسپ فائدہ بھی اس کے ساتھ منسوب کیا کہ اگر اقتدار کی منتقلی چھ نکاتی فارمولے کے بموجب عمل میں لائی گئی تو پاکستان ایک طاقتور اور خوشحال ملک بن جائے گا۔ اس پر ایوب خان نے

Marfat.com

ان سے طنزاً سوال کیا کہ "کون سا پاکستان"؟ اس سے مراد یہ تھا کہ اس کے بعد پاکستان باقی کب رہے گا؟

کانفرنس کی اس دن کی نشست کے اختتام پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مجیب الرحمٰن کو اپنے ساتھ گھر لے گئے اور انہیں بہتیرا سمجھایا کہ وہ اپنے موقف پر اصرار نہ کریں ورنہ عجب نہیں کہ کوئی نیا مارشل لاء ملک پر مسلط ہو جائے۔ مگر وہ اپنے موقف پر مصر رہے نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس ناکام ہو گئی، اور اقتدار کی منتقلی عمل میں نہ آسکی۔ ملک میں بدامنی تو تھی ہی، اب مایوسی بھی چھا گئی۔ بدامنی اور ملک گیر مایوسی نے یحییٰ خان کے لئے حالات سازگار بنا دیئے اور انہوں نے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو ایوب خان سے ریڈیو پر بالجبر ایک تقریر نشر کرائی جس کے بموجب انہوں نے اقتدار اپنے نام منتقل کرا لیا۔ اس طرح یحییٰ خان نے وہ مقصد پوری طرح حاصل کر لیا جس کے لئے وہ خفیہ طور پر اس قدر کوشاں تھے۔

کانفرنس ایسے حالات میں ناکام ہوئی جب پورا ملک بدامنی کی لپیٹ میں تھا۔ اس کی ایک وجہ جہاں مولانا بھاشانی اور بھٹو صاحب کی تخریب پسند کارروائیاں تھیں وہاں ایوب خاں کی جانب سے صدارت کے منصب سے دست برداری کا اعلان بھی تھا۔ قبل از وقت اس اعلان کا نقصان یہ ہوا کہ سرکاری مشینری ایوب خاں کے اثر سے نکل کر یحییٰ خاں کے اثر میں چلی گئی۔ اس کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ایوب خاں نے امن و امان کی بحالی کے لئے صرف ان چند شہروں میں جہاں بدامنی تھی، مارشل لا نافذ کرنا چاہا مگر یحییٰ خاں نے پورے ملک میں مارشل لا نافذ کرنا تجویز کیا۔ ایوب خاں اسی وقت سمجھ گئے کہ یحییٰ خاں سرکاری مشینری کو اب پوری طرح اپنے زیرِ اثر لا چکے ہیں اور اب وہ مجھے ہٹا کر ملک کا مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بننا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے یحییٰ خاں کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اگر صدارت کے منصب سے دست برداری کے ارادے کو وہ کانفرنس کے اختتام تک اخفا میں رکھتے تو یہ سب صورتِ حال پیدا نہ ہوتی۔ بہرکیف ان

بدتر حالات میں جب یحییٰ خاں نے اقتدار ایوب خاں سے چھینا تو عوام الناس کی طبیعتوں پر کسی قسم کا کوئی ناخوشگوار ردِعمل رونما نہیں ہوا بلکہ اُسے امن و امان کی بحالی کے لئے ناگزیر سمجھا جانے لگا اور کانفرنس کی ناکامی کی وجوہات کی تحقیق و جستجو پسِ پردہ چلی گئی۔ یہ بات محض چند گنے چنے لوگوں کے علم میں رہی کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے کانفرنس میں اقتدار کی منتقلی کے لئے اپنے چھ نکاتی فارمولے کو بنیاد بنانے پر جو اصرار کیا وہ حقیقتاً یحییٰ خاں کی شہ پر تھا۔ کانفرنس کے دوران انہوں نے بذاتِ خود شیخ مجیب الرحمٰن سے ایک خفیہ ملاقات کی تھی۔ خود یحییٰ خاں نے اردو ڈائجسٹ کے ایک خصوصی انٹرویو بابت ماہ جنوری ۱۹۷۹ء کے شمارے میں اس ملاقات کا اقرار کیا ہے (مصنف) اور اس ملاقات میں کہا جاتا ہے کہ جنرل یحییٰ نے شیخ مجیب الرحمٰن کو یقین دہائی کرائی کہ آپ اپنے مطالبات سامنے لائیں کوئی مارشل لا نہیں لگایا جائے گا۔

نواب زادہ نصراللہ خان نے اس ملاقات کے بارے میں اس تفصیل کا بھی انکشاف کیا ہے کہ کانفرنس کے دوران مجیب الرحمٰن کو یحییٰ خان سے ملوانے کے لئے یوسف ہارون ہیلی کاپٹر کے ذریعے لے گئے تھے اور یہ کہ واپسی پر مجیب الرحمٰن کا رویہ بہت سخت تھا اور وہ چھ نکات (اور پیریٹی ختم کرنے کے مطالبے) سے ہٹنے پر تیار نہ تھے۔ (ادا کار ۱۱ ستمبر ۱۹۷۲ء)

چھ نکاتی فارمولے کو مسترد کرکے ایوب خان نے بڑی استقامت اور پامردی کا ثبوت دیا حالانکہ گذشتہ کئی ماہ سے شدید بیماری اور فالج کے حملے نے انہیں ذہنی طور پر شکستہ حال کر دیا تھا اور وہ اقتدار سے سبکدوشی کا بھی ناقابلِ تنسیخ فیصلہ کر چکے تھے۔ رائے عامہ بھی ان کی مخالف ہو چکی تھی۔ مگر انہوں نے ملک کے وسیع تر مفاد میں چھ نکاتی فارمولے کو حاوی نہ ہونے دیا۔ کانفرنس کی ناکامی سے ملک کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ بھاشانی، بھٹو اور یحییٰ خان نے جو کانفرنس کو ناکام بنانے کے لئے کوشاں تھے اس سے اپنے مطلوبہ مقاصد پوری طرح حاصل کر لئے گو اس کا ظاہری فائدہ صرف یحییٰ خان کو پہنچا۔ بھاشانی اور ذوالفقار علی بھٹو کو جو فائدے پہنچے وہ بالواسطہ تھے۔ دونوں یہ چاہتے تھے کہ جمہوریت کی بحالی عمل میں

Marfat.com

نہ آنے پائے ۔ مجیب الرحمٰن کو آخر وقت تک ان کے اس طرز عمل کا کوئی فائدہ نہ پہنچا اور یہ ان کی سیاسی حماقت کا نتیجہ تھا ۔ باقی ماندہ تینوں آدمیوں کے برخلاف مجیب الرحمٰن کا مقصد کانفرنس کو ناکام بنانا نہ تھا بلکہ وہ یحییٰ خان کی سازش کا شکار ہوگئے اور اس کی چالوں میں آکر کانفرنس میں ہٹ دھرمی کا رویہ اختیار کیا جس کی وجہ سے کانفرنس کے فوائد حاصل کرنے سے سب سے زیادہ محروم وہی رہے ذوالفقار علی بھٹو کو ایک فائدہ اور بھی ہوا ۔ امور سلطنت میں انہیں خاصا عمل دخل حاصل ہوگیا ۔ یہ فائدہ حاصل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ کئی برس پہلے سے یحییٰ خان سے ان کے ذاتی تعلقات تھے ۔ ان تعلقات میں اتنی قربت اور بے تکلفی تھی کہ بہ روایت ملک غلام جیلانی ، دونوں ایک ساتھ مے نوشی کی مجلسیں جمایا کرتے تھے۔ یحییٰ خان کے برسراقتدار آنے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے اس قربت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور وہ سرکاری فیصلوں پر بھی اثر انداز ہونے لگے ۔ اعلیٰ سرکاری حکام یہاں تک کہ بعض صوبائی گورنر ان کے احکام کی بلا چوں وچراں بجا آوری کرنے لگے ۔

۱۹۶۹ء کا مارشل لأ اور دستوری ڈھانچے کا انہدام

یحییٰ خاں نے برسراقتدار آنے کے بعد قوم سے وعدہ کیا کہ وہ جلد از جلد آئینی حکومت بحال کردیں گے ۔ وہ ۱۹۶۲ء کے آئینی ڈھانچے میں مارشل لا احکامات کے تحت ترمیمیں کرتے چلے گئے ۔ انہوں نے ۲۸ نومبر ۱۹۶۹ء کو ایک فرمان کے ذریعے دو بہت بڑے اقدامات کر ڈالے ان میں سے ایک یہ تھا کہ انہوں نے ون یونٹ کو توڑ دیا اور دوسرا یہ کہ اسمبلی کی نشستوں کے معاملے میں ملک کے دونوں بازوؤں کے مابین قائم شدہ مساوات (PARITY) ختم کردی ۔

ان کی ان دونوں ترمیموں نے جو یکم جولائی ۱۹۷۰ء سے نافذ العمل ہوئیں ، مرکزی حکومت کا آئینی ڈھانچہ توڑ دیا جسے ۱۹۵۶ء کے آئین میں بڑی محنت ، کدوکاوش ،

مصالحت اور مفاہمت کے ذریعے تعمیر کیا گیا تھا۔ ایسے وقت میں جبکہ مشرقی پاکستان کے وہ تمام اکابر جن کی مدد سے مفاہمت ہوئی تھی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے مرکزی حکومت کے ڈھانچے کا انہدام اپنے گھر کی چھت خود اپنے ہاتھ سے منہدم کر دینے کے مترادف تھا۔ اگر آگے چل کر مشرقی پاکستان کے سقوط کا حادثہ پیش نہ آتا تو یحییٰ خان کی صرف یہ ترمیمیں ہی ملک کو بحران میں ڈالنے کے لئے بہت کافی ہوتیں۔

ملک کے دور اندیش سیاسی رہنما یحییٰ خان کے اس اقدام پر بڑی تشویش میں مبتلا ہوئے۔ جو بات تشویش کا باعث تھی وہ دراصل ون یونٹ کا توڑا جانا نہ تھا، بلکہ اس کے ذریعے دونوں بازوؤں کے مابین جو مساوات قائم کی گئی تھی، اس کا ختم کیا جانا تھا۔ مساوات ختم کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اب مرکز میں پھر سے دو ایوانی مقننہ بنائی جائے اور دونوں ایوانوں کے مابین اختیارات کی تقسیم کا مسئلہ پھر سے پیدا ہو۔ اگر یحییٰ خاں ان ترمیمات کے ساتھ ساتھ ۱۹۵۶ء کا آئین بحال کر دیتے تو کسی بحران کا اندیشہ نہ تھا کیونکہ اس آئین میں دو ایوانی مقننہ کی تمام تفصیلات کو باہمی رضامندی سے محمد علی بوگرا فارمولے کے بموجب طے کر دیا گیا تھا۔ مگر صرف مساوات کو ختم کرنا اور اس اقدام کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے مسائل کو حل کرنے کی راہ تجویز نہ کرنا ایسے وقت میں جب مجیب الرحمان جیسا کٹر علاقہ پرست لیڈر سب سے بڑی سیاسی قوت کا حامل ہو، بہت بڑا بحران پیدا کر سکتا تھا۔ لہذا بحران سے بچنے کے لئے قومی نقطہ نظر کے حامل لیڈروں نے یحییٰ خاں کے سامنے تجویز پیش کی کہ وہ ۱۹۵۶ء کے آئین کو بحال کر دیں۔ اور دستور کے مطابق جسے ملک کے دونوں بازوؤں اور تمام سیاسی جماعتوں کے اتفاق رائے سے منظور کیا گیا تھا، عام انتخابات کرا کے اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل کر دیں۔

۱۹۵۶ء کے آئین کی بحالی کی تجویز جن اکابر نے پیش کی ان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی چوہدری محمد علی، میاں ممتاز دولتانہ اور نواب زادہ نصراللہ خان شامل تھے۔ ان کے علاوہ ملک کے دیگر چوٹی کے لیڈر بھی اس آئین کی بحالی پر متفق تھے۔ مگر ذوالفقار بھٹو نے اس کی بحالی کی سخت مخالفت کی۔ جو لوگ اس آئین کی بحالی کے مخالف تھے ان کی

طرف سے یہ اعتراض کیا گیا کہ یحییٰ خان کس اختیار کی رو سے ۱۹۵۶ء کا آئین بحال کر سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کہا کہ یحییٰ خان اسی اختیار کی رو سے یہ کام کر سکتے ہیں جس اختیار کی رو سے وہ برسر اقتدار آئے ہیں اور جس اختیار کی رو سے انہوں نے ون یونٹ کو توڑا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک میں آئینی حکمرانی کی بحالی کی یا اقتدار کی منتقلی کی یہی سب سے موزوں اور صحیح صورت تھی مگر یحییٰ خان نے یہ تجویز منظور نہ کی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ اقتدار کی منتقلی میں مخلص نہ تھے۔ آنے والے واقعات نے جن کا تذکرہ آگے کیا جائے گا یہ بات ثابت کر ہی دی۔ گذشتہ واقعات سے بھی اس امر کے شواہد مل رہے تھے کہ وہ برسوں برسر اقتدار رہنے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور اس کی تیاری بھی انہوں نے دھیرے دھیرے شروع کر دی تھی۔ ملک غلام جیلانی (سابق سکریٹری جنرل تحریک استقلال) کا کہنا ہے کہ جون ۱۹۶۸ء میں ایک دوستانہ ملاقات میں یحییٰ خان نے خود اپنے منہ سے اپنے دل کی بات ان پر ظاہر کر دی تھی۔ اقتدار کے حریص تو ان کے پیش رو ایوب خان بھی تھے۔ مگر جس بات میں وہ اپنے پیش رو سے فروتر نکلے، وہ ان کی یہ افتادِ ذہن تھی کہ اگر مشرقی پاکستان ان کے اقتدار کو گوارا کرنے کا روادار نہ ہو تو اسے کاٹ کر علیحدہ کر دیا جائے تاکہ کم سے کم مغربی پاکستان پر ان کا اقتدار قائم رہے۔ پہلی بات تو اس وقت درست ثابت ہوگئی جب ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو انہوں نے اقتدار پر تسلط حاصل کیا اور دوسری بات، بعد کے ان کے اقدامات نے درست ثابت کر دکھائی۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات اور علاقہ واریت کی بالادستی

یحیٰی خاں نے ۲۸ نومبر ۱۹۶۹ء کو یہ بھی اعلان کیا کہ وہ ۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو (بعد میں اس تاریخ میں ، دسمبر تک کی توسیع کر دی گئی) انتخابات کرائیں گے۔ انہوں نے انتخابات کے لئے جناب جسٹس عبدالستار کی سربراہی میں ایک الیکشن کمیشن بھی قائم کیا کمیشن نے انتخابات کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یحیٰی خان نے انتقال اقتدار کے لئے قومی اسمبلی پر یہ ذمہ داری عائد کر دی کہ وہ ملک کے لئے پہلے ایک نیا آئین بنائے اور یہ آئین ۱۲۰ دن کے اندر مکمل کرے۔ اگر وہ اس مدت کے اندر دستور نہ بنا سکی تو خود بخود ٹوٹ جائے گی۔ یہ شرط نہایت خطرناک تھی کیونکہ ۱۹۵۶ء کا آئین تیار ہونے میں ۹ سال لگے تھے۔ بعد کا زمانہ آئین سازی کے لئے مشکل تر ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۷۰ء تک پہنچتے پہنچتے ۱۹۵۶ء کے آئین کے بہت سے نکات پر اتفاق رائے باقی نہیں رہا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکاتی فارمولے نے بھی اختلافات کی خلیج وسیع تر کر دی تھی۔ اس لئے ۱۲۰ دن کے اندر دستور مکمل کرنے کی شرط عائد کرنے کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہ تھا کہ اسمبلی دستور نہ بنا سکنے پر ٹوٹ جائے اور یحیٰی خان کو اقتدار پر مسلط رہنے کا مزید موقع مل جائے۔ ان کے فرمان کے بموجب دستور سازی کے لئے پھر نئی اسمبلی منتخب کی جاتی۔ بظاہر یہ بات دستور بنانے کے لئے مزید ایک موقع دینے کی صورت تھی مگر پہلی اسمبلی ناکام ہو جانے کے بعد دوسری اسمبلی سے دستور سازی کی کیا توقع کی جا سکتی تھی، پھر عملاً یہی ہوتا کہ یحیٰی خان برسر اقتدار رہتے خواہ مشرقی پاکستان تنگ آکر علیحدہ ہو جاتا۔

۲۸ نومبر کو مذکورہ اعلان میں انہوں نے بہت سی باتیں طے کیں مگر ایک نہایت اہم بات غیر طے شدہ چھوڑ دی۔ وہ بات صوبائی خودمختاری کے حدود کا

Marfat.com

تعین تھی۔ گذشتہ تین سالوں میں مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کو مشرقی پاکستان میں جو عمومی مقبولیت حاصل ہوئی تھی اس سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ صوبائی خود مختاری کا مسئلہ ہی سب سے اہم انتخابی ایشو بنے گا اور دستور سازی میں بڑی مشکلات پیدا کرے گا۔ اگر یحییٰ خان ۱۹۵۶ء کے آئین کو بحال کرنے پر رضا مند نہ تھے اور نیا آئین بنوانے پر مصر تھے تو اس کے لئے لازم تھا کہ وہ مجوزہ دستور میں صوبائی خود مختاری کا تعین کر دیتے۔ پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کے سوا تمام سیاسی جماعتیں نیا دستور بنوانے کی صورت میں، صوبائی خود مختاری کی حدود کے تعین پر متفق تھیں۔ یہاں تک کہ خود مشرقی پاکستان کی جماعتیں بھی مثلاً قومی جمہوری محاذ کے صدر جناب نورالامین نے بھی دسمبر ۱۹۶۹ء میں صدر یحییٰ کی اس مسئلے کی طرف توجہ دلائی۔[1]

۱۲۰ دن کی مدت کے اندر دستور نہ بنا سکنے کی صورت میں جو خطرناک اندیشے متوقع تھے ان سے بچنے کے لئے میاں طفیل محمد صاحب نے یحییٰ خان کو تجویز پیش کی کہ اگر وہ ۱۲۰ دن کی شرط عائد کرنے پر مصر ہیں تو وہ اس میں کم از کم اتنی سی ترمیم کر لیں کہ وہ خود دستور کا مسودہ تیار کرا کے اسمبلی میں پیش کریں اور اسمبلی پر (دستور بنانے کے بجائے) صرف اس امر کی ذمہ داری ڈالیں کہ وہ ایک سو بیس دن کے اندر اس میں جس قدر کاٹ چھانٹ کرنا چاہتی ہو کر لے۔ اس کے بعد جو کچھ بچ جائے وہی ملک کا دستور ہو اور اسی کے مطابق اقتدار کی منتقلی عمل میں لائی جائے۔ خود میاں صاحب کی نگاہ میں یہ تجویز کوئی پسندیدہ بات نہ تھی مگر ۱۲۰ دن کے اندر اندر دستور بنانے کی خطرناک شرط کے مقابلے میں بہت بہتر صورت تھی۔ اس سے کم سے کم اتنا تو ہوتا کہ اقتدار کی منتقلی عمل میں آ جاتی مگر یحییٰ خاں اس تجویز کو ماننے پر تیار نہ ہوئے۔ (یہ تجویز بعد میں انہوں نے مان لی مگر بعد از خرابیٔ

---

[1] بعد میں رونما ہونے والے واقعات نے یہ بات ثابت کر دی کہ صوبائی خود مختاری کی حدود کا تعین نہ کیا جانا صدر یحییٰ کی بہت بھاری غلطی تھی۔

Marfat.com

بسیار اس کا تذکرہ آگے آئے گا) تین چار ماہ بعد یحییٰ خان کو اپنی غلطی کا غالباً اندازہ ہوگیا اس لئے انہوں نے ۲۸ مارچ ۱۹۷۰ء کو ایک فرمان کے ذریعے دستور بنانے والوں کے لئے کچھ رہنما اصول بنا دیئے اور شرط عائد کی کہ دستور ساز اسمبلی ملک کا دستور ان رہنما اصولوں کے دائرے میں رہ کر بنائے گی۔ یہ رہنما اصول لیگل فریم ورک آرڈر مجریہ ۱۹۷۰ء کہلائے۔ اس میں انہوں نے صوبائی خود مختاری کی حدود کا بھی کسی قدر تعین کر دیا اور یہ حکم صادر کیا کہ " مرکز کے پاس قانون سازی، انتظامی و مالیاتی اختیارات، دفاع و امور خارجہ کے محکمے اور ملک کے جغرافیائی اتحاد کو برقرار رکھنے والے اختیارات ہوں گے"۔ اس سے زیادہ وضاحت نہ کی۔ انہوں نے اس فریم ورک میں دستور کے نظریاتی پہلو پر بھی توجہ دی جو اس کے شق نمبر ۲۰ اور ۲۱ سے مترشح ہے کہ۔

۱۔ پاکستان کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہوگا۔

۲۔ اسلامی نظریئے کا تحفظ کیا جائے گا اور سربراہ مملکت مسلمان ہوگا۔

۳۔ انتخابات بالغ رائے دہی کے ذریعے ہوا کریں گے۔

(ب) بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی

(ج) عدلیہ پوری طرح آزاد ہوگی۔

۴۔ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دی جائے گی۔ مگر مرکز کے پاس قانون سازی، انتظامی و مالیاتی اختیارات، دفاع و امور خارجہ کے محکمے اور ملک کے جغرافیائی اتحاد کو برقرار رکھنے والے اختیارات ہوں گے۔

۵۔ ایک مقررہ مدت کے اندر صوبوں اور علاقوں کے درمیان ناہمواریاں دور کی جائیں گی۔

۶۔ (الف) مسلمانوں کو قرآن و سنت کے مطابق زندگی گذارنے کے لائق بنایا جائے گا۔

(ب) اقلیتوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ کوئی قانون قرآن و سنت کے

Marfat.com

خلاف نہیں بنایا جائے گا۔

(ج) مسلمانوں کو قرآن و اسلامیات کی تعلیمات کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

(د) اسلام کے اخلاقی معیارات کی پابندی کی جائے گی۔

(ہ) اسلامی نظام زندگی کو فروغ دیا جائے گا۔

بلاشبہ ان نکات کے ذریعے سیکولرازم اور چھ نکات کا کسی قدر کاٹ کر دیا گیا تھا۔

مگر انہوں نے لیگل فریم ورک آرڈر کے دفعات کی پابندی کرانے کی طرف مطلقاً توجہ نہ دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انتخابات کا اعلان ہوتے ہی صوبہ پرست اور سوشلسٹ عناصر پوری قوت اور تمام وسائل اور ذرائع کے ساتھ میدان میں اتر آئے۔ صوبہ پرست عناصر کا پروگرام یہ تھا کہ ایک ایسا دستور بنوایا جائے جو مرکزی حکومت کو زیادہ سے زیادہ مفلوج اور کمزور کر دے۔ مجیب الرحمٰن اس گروہ کے سب سے بڑے لیڈر تھے اور ان کا چھ نکاتی فارمولا ان کے اس منصوبہ کا غماز تھا۔ سوشلسٹ عناصر کا منصوبہ یہ تھا کہ مساوات اور معاشی انقلاب کے نام پر ملک میں ایک مستبد قسم کی فسطائی حکومت قائم کی جائے۔ ذوالفقار علی بھٹو اس گروہ کے سب سے بڑے نقیب تھے۔ ان آثار و قرائن کو دیکھ کر صاف نظر آنے لگا کہ ۱۹۷۰ء کا سال ملک کے مستقبل کے لئے فیصلہ کن ثابت ہوگا۔ ان حالات میں پاکستان کے بچاؤ کی ذمہ داری کلیتہً ان عناصر کے کندھوں پر آگئی تھی جو ملک میں اسلامی نظام کے علمبردار تھے اور فی الواقع اس میں مخلص تھے۔ اس بات کا تمام تر فیصلہ منتخب کی جانے والی اسمبلی پر منحصر ہو کے رہ گیا تھا کہ آیا وہ صوبائی خودمختاری یا سوشلسٹ آمریت کے خنجر سے ملک کے سیاسی وجود کو ہلاک کر ڈالتی ہے یا اسلامی نظام اور اسلامی دستور کی روح پھونک کر اس جسد ناتواں کو قوت و استحکام بخشتی ہے۔ اگر اسمبلی میں صوبہ پرست یا سوشلسٹ عناصر بھاری تعداد میں منتخب ہو کر آجاتے تو صاف نظر آ رہا تھا کہ ان کا بنایا ہوا دستور ملک کے لئے ہلاکت خیزی کا موجب بنے گا۔ ایسی صورت میں ملک کے

Marfat.com

بچاؤ کی واحد صورت یہ رہ گئی تھی کہ اسمبلی کے ہاتھوں ایک ایسا دستور بنوایا جائے جو اس امر کی ضمانت دے کہ ملک کا سیاسی نظریہ اسلامی نظام زندگی کا نفاذ ہوگا اور قانون کا ماخذ اساسی قرآن و سنت ہوگا۔ اس طرح کا دستور بغیر اس کے نہیں بن سکتا تھا کہ اسمبلی میں بھاری تعداد میں ایسے افراد منتخب ہوکر آئیں جو نہ صرف اسلامی نظام کے لئے مخلص ہوں بلکہ تمام قسم کے خوف و خطر سے بے نیاز ہوکر صوبہ پرستوں اور سوشلسٹوں سے لڑ سکیں، دستور اور اس سے متعلقہ امور سے ضروری واقفیت رکھتے ہوں، پاکستان کی گذشتہ دستوری جدوجہد سے آگاہ ہوں اور اس امر سے بھی واقف ہوں کہ ملک کے دستوری مسائل کیا ہیں؟

اس بات کا اعتراف صوبہ پرستوں اور سوشلسٹوں کو بھی تھا کہ ملک میں اسلامی دستور کی جنگ لڑنے کی صلاحیت جماعتی حیثیت میں صرف جماعت اسلامی رکھتی ہے اور پاکستان میں اس سلسلے میں قرارداد مقاصد سے لے کر اس وقت تک سب سے موثر جنگ اس نے لڑی ہے۔ جماعت اسلامی نے بھی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا اور انتخابات میں حصہ لینے کے لئے پوری تیاری کے ساتھ کمربستہ ہوگئی۔

ملک کے عوام میں اسلام کے لئے بیداری پیدا کرنے کی غرض سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ۳۱ مئی ۱۹۷۰ء کو ملک بھر میں یوم شوکت اسلام منانے کی پکار دی۔ اس پکار پر پوری قوم نے بلا تفریق مسلک، لبیک کہا اور ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں اتنے جوش اور ولولے اور شان و شوکت کے ساتھ یہ یوم منایا گیا کہ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں شاید اس کی نظیر نہ ملے۔ ملک کے ہر شہر میں خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، بڑے بڑے جلوس نکالے گئے جو نظم و ضبط اور شوکت و تمکنت میں بے مثال تھے۔ کسی کو بھی اس یوم کے اس قدر کامیاب اور عظیم الشان ہونے کا یقین نہ تھا۔ اس یوم کی اس غیر معمولی کامیابی پر سوشلسٹ اور صوبہ پرست عناصر بے حد سراسیمہ ہوئے اور اس کے بعد انہیں انتخابی حکمت عملی پر نظر ثانی کی حاجت محسوس ہونے لگی۔

یوم شوکت اسلام کی کامیابی کے بعد ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ دیگر تمام

Marfat.com

دینی جماعتیں جماعت اسلامی کے ہاتھ مضبوط کرتیں مگر اس کے برعکس ان میں سے بہتوں نے اس کے مقابلے پر اپنی متوازی تنظیمیں قائم کیں اور یہ بھی ہوا کہ جو جماعتیں غیر سیاسی بنیادوں پر قائم چلی آ رہی تھیں ان کے اکابر نے انہیں سیاسی جماعت کی حیثیت دے دی اور انتخابات کے میدان میں انہیں اتار دیا ۔ ان کے افراد میں اکثر و بیشتر ایسے لوگ تھے جنہوں نے پوری زندگی گوشہ ہائے عزلت میں گذاری تھی یا جنہوں نے خانقاہوں یا مدرسوں سے باہر کی دنیا کو جھانک کر نہ دیکھا تھا۔ سیاست کے میدان میں ان کے اترنے سے صوبہ پرستوں اور سوشلسٹوں کو تو کوئی نقصان نہ پہنچا مگر اسلام پسندوں کے ووٹ تین چار حصوں میں تقسیم ہو گئے ۔ مزید ستم کی بات یہ ہوئی کہ ان نومولود جماعتوں کی طرف سے جماعت اسلامی سے فرمائش کی جانے لگی کہ جہاں جہاں سے یہ چاہتی ہیں ، وہ مقابلے سے ہٹ جائے حالانکہ ان جماعتوں کی طرف سے بالعموم جو نمائندے کھڑے کئے گئے تھے وہ داستان گوئی اور قصہ خوانی میں تو ملکہ اور مہارت ضرور رکھتے تھے مگر سیاست اور دستور سازی کے امور میں اس قدر کورے تھے کہ انہیں دستور اور قانون کا فرق تک معلوم نہ تھا۔ وہ صوبائی اور قومی اسمبلی کے حدود کار کے فرق سے بھی ناواقف تھے ۔ ملک کے بنیادی دستوری مسائل کا بھی انہیں علم نہ تھا ان سب باتوں کے باوجود جماعت اسلامی کی جانب سے اس امر کی کوشش کی گئی کہ ان کے ساتھ انتخابی اتحاد عمل میں آجائے تاکہ آپس میں مقابلہ نہ ہو۔ مگر اس نوع کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔

عوام میں اس صورت حال سے زبردست بددلی اور مایوسی پیدا ہوئی اور انتخابات میں ان کے ووٹ آپس میں تقسیم ہو گئے ۔ دوسری طرف مشرقی پاکستان میں صوبہ پرست عناصر نے اور مغربی پاکستان سے سوشلسٹ عناصر نے فی الواقع پرفریب اور دلنواز نعروں سے عوام کی بڑی تعداد کو مسحور کر دیا۔

مزید ایک بات جس سے مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے بڑا فائدہ اٹھایا یہ تھی کہ انتخابات سے تھوڑا عرصہ پہلے وہاں ایک زبردست طوفان آیا جس میں بڑی تباہی

Marfat.com

مچی اور زبردست جانی نقصان ہوا۔ وہاں طوفان آنے کا یہ کوئی پہلا واقعہ نہ تھا۔ وہاں ہر سال دو سال بعد ایک بڑا طوفان آتا ہے اور وہ ہزاروں جانوں کا نذرانہ وصول کرتا ہے۔ مغربی پاکستان کی بعض جماعتیں ہر طوفان کے بعد یہاں کے سے چندہ اکٹھا کر کے وہاں بھیجتی تھیں اور اس سے وہاں کے عوام کی حتی المقدور مدد کی جاتی تھی۔ سرکاری امداد اس کے علاوہ ہوتی تھی۔ مگر انتخابی تیاریوں کی وجہ سے ۱۹۷۰ء کے طوفان کے لئے اس پیمانے پر چندہ اکٹھا کر کے بھیجا نہ جا سکا اور نہ ہی کسی لیڈر کو پرسش حال کے لئے وہاں جانے کا موقع مل سکا۔ سیاسی جماعتوں کی اس مجبوری سے وہاں کی جماعتوں نے زبردست سیاسی فائدہ اٹھایا وہاں اس امر کا خوب پروپیگنڈہ کیا گیا کہ مغربی پاکستان کے لیڈروں کو تمہارے دکھ درد اور تمہاری مصیبتوں سے کوئی ہمدردی نہیں یہاں تک کہ کوئی تمہارا حال پوچھنے کو بھی نہ پہنچا۔ ایسی صورت میں اس کی کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ انتخابات جیتنے کے بعد وہ تمہارے کام آئیں گے۔ خان عبدالولی خان کی روایت کے بموجب مولانا نے ایک جلسہ عام میں تقریر کے دوران، جسے عبدالولی خان نے خود بھی سنا، مغربی پاکستان کے لیڈروں کے خلاف بڑی اشتعال انگیز اور زہر آلود باتیں کہیں۔ انہوں نے کہا "مولانا مودودی نے ہمیں جسم ڈھانکنے کے لئے کپڑے کا ایک ٹکڑا نہ دیا۔ وہ ہمارے نماز جنازہ میں نہیں آیا۔ وہ یہاں مُردوں پر ایک مٹھی مٹی ڈالنے کو بھی نہ آیا۔ کوئی دوسرا لیڈر بھی نہ آیا۔ کوئی پاکستانی اور کوئی مسلمان نہ آیا کیونکہ وہ ہمیں پاکستانی کے طور پر قبول ہی نہیں کرتے۔ مغربی پاکستانی ہمیں مسلمان ہی نہیں سمجھتے۔" یہ پروپیگنڈہ ان کے لئے بڑا فائدہ مند ثابت ہوا۔ وہاں کے عوام کے دلوں میں، جو پہلے سے صوبہ پرستی کے پرچار کی زد میں تھے، یہ بات بیٹھ گئی اور وہ علاقائی جماعتوں کو اپنا سہارا سمجھنے لگے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ انتخابات میں اسلام پسند جماعتیں پٹ گئیں۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی نے بھاری اکثریت

Marfat.com

سے انتخابات جیت لئے۔ عوامی لیگ کو مشرقی پاکستان میں ۱۶۷ میں سے ۱۶۴ نشستیں مل گئیں اور پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان کی ۱۴۶ میں سے ۸۳ حاصل کیں۔ اسلام پسند جماعتوں کی شکست نے آگے چل کر وہ حالات پیدا کئے جو ملک کو دونیم کرنے کا موجب بنے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دینی جماعتوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کرنے میں سوشلسٹوں بالخصوص پیپلز پارٹی کی شہ کو بھی دخل تھا اور انہیں صف آرا کرنا یوم شوکت اسلام کی کامیابی پر ان کی نظر ثانی شدہ حکمت عملی کا نتیجہ تھا۔ بہرکیف اسمبلی میں عوامی لیگ کو اکثریت مطلقہ حاصل ہو گئی تھی اور ۳۱۳ کے ایوان میں اس کے ۱۶۴ ارکان تھے اس لئے اب وہ اس بات پر قادر تھی کہ تن تنہا دستور بنالے لہذا آئین سازی ۱۲۰ دن کے اندر عین ممکن ہو گئی تھی۔ اس امر کے باوجود کہ عوامی لیگ سیکولر خیالات کی جماعت تھی اور صوبہ پرست بھی تھی، اس امر کا اندیشہ مطلق نہ تھا کہ اب بھی وہ چھ نکات پر مبنی دستور بنانا چاہے گی۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے چھ نکاتی فارمولا مشرقی پاکستان کو ایوب خان کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لئے وضع کیا تھا[1] اب جبکہ یہ جماعت قومی اسمبلی میں اکثریت مطلقہ کی حامل بن گئی تھی، اور اس بنا پر پاکستان کے مرکزی اقتدار کی حقدار بن گئی تھی، یہ بات اس کے مفاد کے بالکل منافی ہوتی کہ وہ چھ نکاتی فارمولے کے بموجب دستور بنا کے اس مرکزی حکومت کو کمزور کر دے جس کے

---

[1] ساہیوال کے ایک وکیل جناب مسعود پوسوال اپنے ایک مضمون (زندگی ۱۰ جنوری ۷۱ء) میں رقمطراز ہیں کہ "یہ بات اگرتلہ سازش کیس میں مجیب کے خلاف ثبوت جرم کے طور پر پیش کی گئی کہ انہوں نے سازش میں شریک اپنے تمام ساتھیوں کو پیغام بھیجا تھا کہ اگر مادر ملت انتخابات میں کامیاب ہو جائیں تو ہمیں اپنے منصوبے پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی"۔ یہ بات اگر درست ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی مجیب کا مقصود بالذات نہ تھی بلکہ مقصود بالذات یہ امر تھا کہ مشرقی پاکستان کے مفادات محفوظ رہیں۔

Marfat.com

ایوان کی چابی اب اس کے ہاتھ میں آنے والی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ان دنوں مشرقی پاکستان میں نکسل پارٹیوں (نیکسلائٹ) کا بڑا زور تھا۔ یہ کمیونسٹ گوریلے تھے جو قتل و غارت گری کے ذریعے مشرقی پاکستان پر اپنا تسلط حاصل کرنا چاہتے تھے اور مولانا بھاشانی کی سرپرستی میں وہاں سرگرم عمل تھے۔ مجیب الرحمٰن کو اس امر کا شدید اندیشہ تھا کہ اگر مشرقی پاکستان، پاکستان سے علیحدہ ہوگیا تو نکسل پارٹیئے اسے دوسرا ویت نام بنا دیں گے۔ اب رہا چھ نکات سے انحراف کرنے کی صورت میں اہل مشرقی پاکستان کے غیظ و غضب کا نشانہ بننے کا مسئلہ تو اس کا چنداں اندیشہ نہ تھا۔ اس سے پہلے ۱۹۵۴ء میں وہاں کی جگتو فرنٹ نے جس میں عوامی لیگ بھی شامل تھی، اپنے جس ۲۱ نکاتی منشور پر انتخابات جیتے تھے وہ بھی چھ نکات ہی جیسا تھا۔ اس میں بھی مرکز کے اختیارات کو صرف دفاع، خارجہ پالیسی اور کرنسی کی حد تک کم کرانے کا وعدہ کیا گیا تھا، مگر جب عوامی لیگ مرکزی اقتدار کی ساجھی بن گئی تو اس نے ۲۱ نکاتی منشور کو ترک کر دیا۔ یہی اس مرتبہ بھی ہوتا۔ اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی۔ لیگل فریم ورک آرڈر میں چھ نکاتی فارمولے کا کافی حد تک کاٹ کر دیا گیا تھا لہٰذا مجیب الرحمٰن کے نزدیک اس امر کا بھی اندیشہ موجود تھا کہ اگر انہوں نے دستور کو چھ نکات کی بنیاد پر بنایا تو یحییٰ خان اس کی منظوری روک دیں گے جس کا اختیار انہوں نے لیگل فریم ورک آرڈر میں محفوظ کر لیا تھا اور اگر وہ منظوری روک لیتے تو اقتدار کی منتقلی عمل میں نہ آسکتی تھی۔[1]

---

[1] اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ بات مان لی جائے کہ مجیب الرحمٰن چھ نکات سے انحراف کرنے پر کسی قیمت پر آمادہ نہ ہوتے تو اس سے کم سے کم اتنا تو ہوتا کہ کنفڈریشن کی صورت میں ہی سہی ملک کے دونوں بازو متحد رہتے یا اگر علیحدہ بھی ہونا چاہتے تو خوش اسلوبی سے علیحدہ ہوتے۔ وہ عظیم قتل و غارت گری نہ ہوتی جو مجیب کو مارچ ۱۹۷۱ء میں علیحدگی کی راہ پر دھکیل دینے سے ہوئی۔

Marfat.com

بھٹو و یحییٰ کی مجیب سے محاذ آرائی

ملک کی دیگر جماعتیں مثلاً مسلم لیگ، جماعت اسلامی، جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت علماء اسلام وغیرہ بھی اسی بنا پر صورت حال پر ہراساں نہ تھیں۔ فکر تھی تو ذوالفقار بھٹو کو تھی اور مولانا بھاشانی کو تھی۔ دونوں کو یہ اندیشہ ستانے لگا کہ عوامی لیگ اب چھ نکات کو ترک کر کے دستور بنائے گی۔ بھاشانی صاحب کو پریشانی یہ تھی کہ عوامی لیگ اب علیحدگی کا راستہ اختیار کرنے سے گریز کرے گی لہذا انہوں نے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا اعلان کر دے۔ انہوں نے ۷ دسمبر کے انتخابات کے تیسرے ہی روز ۱۰ دسمبر ۱۹۷۰ء کو پلٹن میدان کے جلسۂ عام میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا مطالبہ کر دیا۔ انہوں نے اس مطالبے کے ساتھ اس قدر جارحانہ رویہ اختیار کیا کہ مغربی پاکستان کے مال کے بائیکاٹ کی ترغیب دی اور مجیب الرحمٰن کو دھمکی دی کہ جو شخص مغربی پاکستان کے ساتھ سمجھوتا کرے گا اس کی جان محفوظ ہو گی نہ مال۔ دوسرے لیڈروں میں عطا الرحمٰن (سابق وزیر اعلیٰ مشرقی پاکستان) اور مسیح الرحمٰن نے بھی ان کی ہمنوائی کی۔ ذوالفقار بھٹو کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اب عوامی لیگ تن تنہا تخت و تاج کی مالک بن جائے گی۔ انتخابات میں مجیب الرحمٰن کی اتنی بھاری اکثریت سے کامیابی پر یحییٰ خان کو اپنا ذاتی منصوبہ تلپٹ ہوتا نظر آیا۔ ان کا تخمینہ تو یہ تھا کہ انتخابات میں کوئی جماعت اسمبلی میں اکثریت مطلقہ (ABSOLUTE MAJORITY) حاصل نہ کر سکے گی لہذا دستور سازی کے مسئلے پر پارٹیوں کے درمیان خوب جھگڑا ہو گا۔ ۱۲۰ دن کی متعینہ مدت کے اندر دستور نہ بن سکا تو اس مدت کے اختتام پر اسمبلی خود بخود ٹوٹ جائے گی جس کے بعد کم سے کم نئی اسمبلی منتخب ہونے اور نیا آئین بننے تک وہ حکمراں رہیں گے۔ مگر مجیب الرحمٰن نے اسمبلی میں پچاس

فیصد سے زیادہ نشستیں حاصل کر لیں اور یحییٰ خان کو صاف نظر آنے لگا کہ مجیب الرحمٰن دستور بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے جس کے بعد انہیں اقتدار منتقل کرنا پڑے گا اس لئے اب انہیں یہ فکر ستانے لگی کہ کوئی ایسی صورت نکلے کہ اقتدار پر کسی نہ کسی شکل میں ان کا تسلّط برقرار رہے لہذا انہوں نے انتخابات کے بعد جتنے کچھ بھی اقدامات کئے وہ سب کے سب اسی نیت اور مقصد کے تحت کئے۔ اس مقصد کے تحت، اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ مقرر کرنے کے بجائے وہ جنوری کے وسط میں ڈھاکہ گئے۔ وہاں انہوں نے آئین سازی اور اقتدار کی منتقلی کے مسئلے پر مجیب الرحمٰن سے مذاکرات کئے۔ بہ روایت چوہدری ظہورالٰہی، انہوں نے مذاکرات میں مجیب الرحمٰن کی طرف سے دو باتوں کا اطمینان حاصل کر لیا ایک یہ کہ دستور چھ نکات کے بجائے لیگل فرم ورک آرڈر کے بموجب ہوگا۔ دوئم یہ کہ صدارت کا عہدہ انہیں دیا جائے گا۔ یہ اطمینان حاصل کر لینے کے بعد یحییٰ خاں نے ۱۶ جنوری ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں اعلان کر دیا کہ مجیب الرحمٰن ملک کے آئندہ وزیراعظم ہوں گے۔

مفاہمت کی یہ خبر ذوالفقار علی بھٹو کے خرمن ذہن پر بجلی بن کے گری۔ انہیں اپنا منصوبہ ناکام ہوتا نظر آیا چنانچہ جب یحییٰ خاں اپنے فوجی رفقاء کے ساتھ ڈھاکہ سے کراچی پہنچے اور پھر حسب پروگرام ۱۷ جنوری کو بھٹو سے ملاقات کے لئے اپنے فوجی رفقاء کے ساتھ لاڑکانہ گئے تو بھٹو نے ان سب کی خوب خاطر مدارت کی اور اس کے بعد انہیں ڈرایا کہ اگر انہوں نے مجیب الرحمٰن کو اقتدار منتقل کر دیا تو وہ ان کے ساتھ دھوکا کرے گا اور انہیں صدر مملکت نہیں بنائے گا۔ یہ اندیشہ یحییٰ خاں کے دل میں اتر گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اسمبلی کے اجلاس کی، جو متوقع طور پر ۱۵ فروری سے پہلے منعقد ہونا تھا، تاریخ کا تعین التوا میں ڈال دیا۔ یحییٰ خاں کو برگشتہ کر لینے کے بعد بھٹو اپنے رفقاء کی ایک بڑی ٹیم لے کر مجیب الرحمٰن سے ملنے ڈھاکہ گئے۔ وہاں انہوں نے ۲۸ جنوری سے مجیب الرحمٰن کے ساتھ بند کمرے میں مذاکرات شروع کئے۔ بمطابق مولانا ظفر احمد انصاری، مشرقی پاکستان کے اس وقت کے گورنر جناب ریئر ایڈمرل ایس۔ ایم۔ احسن، کرنل ایس۔ جی۔ مہدی اور دیگران'

Marfat.com

انہوں نے مجیب الرحمٰن سے مطالبہ کیا کہ دستور سازی سے پہلے اقتدار کی منتقلی عمل میں آئے اور صدر مملکت یا نائب وزیر اعظم کا عہدہ انہیں دیا جائے۔ علاوہ ازیں مغربی پاکستان کے صوبوں کے گورنروں کے تقرر کا اختیار انہیں حاصل ہو (اس بات کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ آگے چل کر جب اقتدار کی منتقلی کا مطالبہ مجیب الرحمٰن نے کیا تو بھٹو نے اس کی زبردست مخالفت کی کیونکہ اقتدار کی منتقلی اب ان کی مصلحت کے مطابق نہ تھی) ان کا یہ مطالبہ ان کے اس نظریئے پر مبنی تھا کہ مجیب الرحمٰن صرف مشرقی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کے لیڈر ہیں۔ مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی پیپلز پارٹی ہے۔ ان کا یہ نظریہ نہایت گمراہ کن تھا کیونکہ مغربی پاکستان کے ون یونٹ کو یحییٰ خاں نے پہلے ہی ختم کر دیا تھا اور اس کے چاروں صوبے بحال کئے جا چکے تھے۔ پیپلز پارٹی کو صرف سندھ اور پنجاب میں اکثریت حاصل ہوئی تھی لہٰذا مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی ہونے کا دعویدار بننا صریحاً گمراہ کن بات تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے اس دعوے پر مصر رہے اور اپنی آئندہ کی سیاسی مہم انہوں نے اسی نظریئے پر چلائی اور یہی گمراہ کن نظریہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا موجب بنا۔

مجیب الرحمٰن نے اس بات پر تو آمادگی ظاہر کی کہ وہ اکثریت مطلقہ کا حامل ہونے کے باوجود دستور سازی کا کام مغربی پاکستان کی جماعتوں کے تعاون سے کرنا چاہتے ہیں اور اقتدار میں بھی انہیں شریک کرنا چاہتے ہیں مگر وہ ذوالفقار علی بھٹو کی مذکورہ بالا شرطوں کو ماننے پر راضی نہ ہوئے۔ مجیب الرحمٰن کا یہ موقف آئین یا دستور کے کسی قاعدے سے بھی غلط نہ تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو سے سیاسی مفاہمت نہ کرنے کی ایک غیر سیاسی وجہ بھی تھی کہ اگر تلہ سازش کیس سے رہائی کے بعد سے مجیب الرحمٰن ان سے سخت نفرت کرنے لگے تھے۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے تھے کہ جب میں گرفتار ہوا تو ذوالفقار علی بھٹو نے ڈھاکہ آکر میرے اہل خاندان سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا۔ ان کی ڈھارس بندھائی اور گاہے گاہے ان کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے لئے آتے رہے۔ اس طرح انہوں

Marfat.com

نے میرے اہلِ خانہ اور میری جماعت کے افراد کی نگاہوں میں بڑی اپنائیت حاصل کر لی۔ میں بھی انہیں اپنا حقیقی غمگسار سمجھنے لگا مگر اپنے حسنِ اخلاق کے ذریعے میری جماعت کے لیڈروں کا اعتماد حاصل کر لینے کے بعد انہوں نے انہیں عوامی لیگ سے توڑ کر پیپلز پارٹی میں شامل کرنا چاہا۔ جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی تو اس دن سے بھٹو سے سخت نفرت ہو گئی۔

بہرکیف بھٹو بے نیل مرام مشرقی پاکستان سے واپس آ گئے۔ اب انہوں نے مجیب الرحمٰن سے محاذ آرائی کے لئے ایک نئی ترکیب اختیار کی۔ انہوں نے اقتدار کی منتقلی کا مسئلہ ترک کر دیا اور دستور سازی کے مسئلے کو چھیڑ دیا۔ ۱۵ فروری کو دھمکی دی کہ مجیب الرحمٰن اپنے چھ نکاتی فارمولے سے دست برداری کا اعلان کریں اور دستور ساز اسمبلی میں بیٹھنے سے پہلے ایک دستوری مسودہ طے کریں بصورت دیگر وہ اسمبلی کا بائیکاٹ کریں گے اور اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا تو ان کی پارٹی کے ارکان اپنی نشستوں سے استعفےٰ دے دیں گے۔ لیگل فریم ورک آرڈر میں اسمبلی کے اجلاس سے پہلے نشستوں سے استعفےٰ دینے کی گنجائش نہ تھی۔ بھٹو نے ۱۹ اور ۲۰ فروری کو یحییٰ خان سے دو ملاقاتیں کیں۔ اب مجیب کے مقابلے پر یحییٰ خان کی لائن بھی وہی تھی جو بھٹو کی تھی۔ لہٰذا یحییٰ خاں نے لیگل فریم ورک آرڈر میں ترمیم کر کے ارکان اسمبلی کے استعفےٰ کے لئے مطلوبہ گنجائش پیدا کر دی۔ بھٹو کی طرف سے مجیب الرحمٰن سے چھ نکات میں ترمیم کرنے کے اعلان کا مطالبہ دو وجوہ کی بنا پر نہایت بے جا تھا۔ ایک وجہ یہ تھی کہ مجیب الرحمٰن نے انتخابات چھ نکات کی بنیاد پر جیتے تھے۔ اب وہ کھلم کھلا اس سے انحراف یا دست برداری کا اعلان نہیں کر سکتے تھے۔ اس قسم کا کام تو کسی جماعت کا لیڈر نہیں کر سکتا تھا۔ چھ نکات سے جو کچھ انحراف کیا جاتا اور ظاہر ہے کہ انحراف کیا جانا اب خود عوامی لیگ کے مفاد کا تقاضا تھا، وہ درپردہ طور پر اس طرح کیا جانا تھا کہ عوام اسے محسوس نہ کر سکیں[1]۔ دوسری وجہ یہ

[1] بعد میں واقعتاً ایسا ہی ہوا۔ فروری کے آخری ہفتے میں مجیب الرحمٰن نے چھ نکات میں ترمیم کر کے ایک نیا فارمولا یحییٰ خاں کو بھجوایا جس کا تفصیلی تذکرہ صفحہ ۱۱۶ پر کیا گیا ہے۔

Marfat.com

تھی کہ کوئی جماعت جسے اسمبلی میں اکثریت مطلقہ حاصل ہو، اس بات کی ہرگز محتاج نہیں ہوتی کہ وہ اسمبلی سے باہر کسی اقلیتی جماعت کے ساتھ سمجھوتہ کرے۔ یہ بات اس کے وقار کے خلاف ہوتی ہے چنانچہ جس شد و مد کے ساتھ ذوالفقار علی بھٹو نے انہیں چھ نکات سے دست برداری پر مجبور کرنا چاہا، اسی شد و مد کے ساتھ مجیب الرحمٰن کو پبلک میں کھڑے ہو کر چھ نکات سے وابستگی کا اعلان کرنا پڑا۔ وہ ایسا نہ کرتے تو مشرقی پاکستان میں بھاشانی صاحب کی جماعت انہیں بدنام کرتی کہ اب وہ چھ نکات سے غداری کرنے جا رہے ہیں۔ مجیب الرحمٰن کے اس نوع کے بیانات کو بھٹو نے اپنے سیاسی مقصد کیلئے استعمال کیا اور مغربی پاکستان کے عوام کو یہ باور کرایا کہ مجیب الرحمٰن اب بھی چھ نکات کے اتنے ہی وفادار ہیں جتنے پہلے تھے لہٰذا اُن سے یہ توقع رکھنا سادہ لوحی ہوگی کہ وہ ملک کا دستور مضبوط مرکز کی بنیاد پر بنائیں گے۔ اس سے مغربی پاکستان کے عوام کے دلوں میں عوامی لیگ کے خلاف بے اعتمادی اور نفرت بہت بڑھ گئی۔ بھٹو کی جانب سے یکایک آئین کو اتنی اہمیت دینا اور چھ نکات کو پاکستان کی سالمیت کے لئے خطرہ قرار دے کر اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جانا ایک نہایت عجیب و غریب بات تھی۔ آئین ان کی نگاہ میں کبھی لائق اعتنا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ اس کا بارہا وہ برملا اظہار بھی کر چکے تھے۔ گول میز کانفرنس کا بائیکاٹ کرتے وقت انہوں نے یہی کہا کہ "آئین سے کیا ہوتا ہے؟ آئین سے پیٹ نہیں بھرا کرتا"۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقع پر بھی انہوں نے آئین کی اہمیت کا یہ کہہ کر مذاق اڑایا کہ "آئین کوئی چپلی کباب نہیں کہ اس سے پیٹ بھر جائے"۔ خود اپنے انتخابی منشور میں جو پندرہ ہزار الفاظ پر مشتمل ہے ———— ہر مسئلے پر سیر حاصل گفتگو کی مگر آئین کو اس سے زیادہ اہمیت نہ دی کہ وہ تین چار سطروں سے زیادہ کی جگہ پا سکے اور اس میں صرف مندرجہ ذیل آٹھ نکات رقم کرکے آئین پر مباحثے کا باب بند کر دیا۔

۱۔ مکمل جمہوریت

۲۔ پارلیمانی طرزِ حکومت

۳۔ وفاقی نظام

۴۔ لوکل سیلف گورنمنٹ کے ادارے کو وسعت دینا۔

۵۔ آزادی ضمیر کی ضمانت

۶۔ بنیادی حقوق کی ضمانت

۷۔ عورتوں اور مردوں کے لئے مساوی حقوق

۸۔ اٹھارہ سال تک کی عمر کے لوگوں کیلئے حق رائے دہی

درآں حالیکہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقع پر ہر شخص کو اندازہ تھا کہ چھ نکات کی عمومی مقبولیت کی وجہ سے صوبائی خودمختاری کا مسئلہ باعث نزاع بنے گا۔ وہ خود ۱۹۶۶ء میں چھ نکات سے اس قدر برہم تھے کہ انہوں نے مجیب الرحمٰن کو مناظرے کا چیلنج دے رکھا تھا مگر جب چھ نکات عملی اہمیت اختیار کرنے کے مرحلے میں داخل ہونے لگے تو اس مسئلے پر سکوت اختیار کر لیا۔ اسے پاکستان کی سالمیت کا مسئلہ اس وقت بنایا جب انہیں مجیب کی طرف سے اقتدار میں حصہ داری حاصل کرنے میں ناکامی دکھائی دینے لگی۔

بہرکیف! ذوالفقار علی بھٹو نے مجیب الرحمٰن سے اہل مغربی پاکستان کو بدگمان کرنے کے لئے ایک اور طریقہ بھی اختیار کر لیا۔ مختلف ذرائع سے مجیب الرحمٰن کے دل میں یہ خوف پیدا کیا کہ مغربی پاکستان کے عوام کے دل میں ان کے خلاف اتنی نفرت پیدا ہو چکی ہے کہ وہ ان کی جان کے دشمن بن چکے ہیں۔[1] یہ خوف مجیب الرحمٰن کے دل میں

---

[1] بہ روایت چوہدری ظہور الٰہی بھٹو نے مجیب الرحمٰن کو یہ دھمکی دی تھی کہ اگر وہ مغربی پاکستان آئے تو انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ مولانا احمد شاہ نورانی کا کہنا ہے (بحوالہ زندگی ۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء) کہ مجیب الرحمٰن نے خود ان سے کہا تھا کہ وہ ۱۵ فروری سے پہلے مغربی پاکستان کا دورہ کریں گے۔

Marfat.com

اس قدر بیٹھ گیا کہ انہوں نے مغربی پاکستان آنے سے گریز کیا حالانکہ اگر وہ یہاں کا دورہ کرتے اور عوام سے ان کا رابطہ قائم ہوتا تو ان کو اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا موقع ملتا اور ان کے بارے میں عوام کی غلط فہمیاں دور ہو سکتی تھیں۔ مغربی پاکستان کے دورے سے مجیب الرحمٰن کے اس مجبورانہ گریز کو ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے سیاسی مقصد کے لئے استعمال کیا اور یہاں کے عوام کو یہ باور کرایا کہ انتخابات جیت لینے کے بعد مجیب الرحمٰن کو اب مغربی پاکستان سے کوئی سروکار نہیں رہا لہذا ایسے آدمی کا برسر اقتدار آنا مغربی پاکستان کے مفاد میں نہیں۔ بھٹو کی باتیں یحییٰ خاں کی حکومت کے ذرائع ابلاغ و اخبارات اس اہتمام سے چھاپتے تھے کہ جو کچھ ان کے منہ سے نکلتا تھا وہ ایک ایک فرد تک پہنچ جاتا تھا۔ چنانچہ مجیب الرحمٰن کے خلاف ان کا یہ پروپیگنڈہ بھی ہر خاص و عام کے دل میں اتر گیا اور انہیں مجیب الرحمٰن سے سخت نفرت ہو گئی۔ گویا مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو کا معرکہ صرف ان دونوں کی ذات تک محدود نہ رہا بلکہ اس معرکے نے مشرقی پاکستان بمقابلہ مغربی پاکستان محاذ آرائی اور سرد جنگ کی شکل اختیار کر لی۔

ان سب حرکتوں کو دیکھنے کے بعد مجیب الرحمٰن اقتدار کی منتقلی کے خلاف ذوالفقار علی بھٹو کی سازشی سرگرمیوں کو خوب اچھی طرح سمجھنے لگے اس لئے انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ۱۵ فروری تک اسمبلی کا اجلاس طلب جائے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اس مطالبے کے جواب میں تاریخ میں توسیع کا مطالبہ کیا چنانچہ یحییٰ خاں نے ان کی مرضی کے مطابق فروری کے بجائے مارچ کی ۳ تاریخ اسمبلی کے اجلاس کے لئے مقرر کی۔ اس مسئلے میں جب یحییٰ خاں نے اکثریتی جماعت کے قائد کے مقابلے پر اقلیتی جماعت کے قائد ________ بھٹو کی کھلی کھلی طرف داری کی تو ان کی جانب داری مجیب الرحمٰن پر پوری طرح عیاں ہو گئی۔ اس کے باوجود انہوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور ۲۴ فروری کو اپنا تاثر ان الفاظ میں ظاہر کیا کہ "جب بالآخر ۳ مارچ کو قومی اسمبلی کے اجلاس کا نوٹس جاری کیا گیا تو ایک لمحے کے لئے یوں معلوم ہوا کہ

Marfat.com

معقولیت کی قوتیں ان سازشی قوتوں پر حاوی ہوگئی ہیں جو پاکستان میں ہمیشہ اس وقت سرگرم عمل ہو جاتی ہیں جب عوام جمہوری طریقوں سے اقتدار حاصل کرنے کے قریب ہوتے ہیں۔ ان عوام دشمن طاقتوں نے ۱۹۵۴ء میں آئین ساز اسمبلی کو توڑ دیا۔ ۱۹۵۸ء میں مارشل لا نافذ کیا اور اس کے بعد ہر عوامی تحریک کو ناکام بنانے کی کوشش کی۔ تاہم اب بھی یہ سازشی قوتیں ایک بار پھر ضرب لگانے کے لئے تیاری کر رہی ہیں۔ اس بات کا اندازہ ان واقعات سے ہو جاتا ہے جو قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کے اعلان سے شروع ہوئے۔ بھٹو صاحب اور پیپلز پارٹی نے اچانک ایسی حرکتیں شروع کیں اور ایسے بیانات دئے جن سے اس رجحان کا پتہ چلتا تھا کہ وہ قومی اسمبلی کی معمولاتی کارروائی روک کر آئینی عمل میں رکاوٹ ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس طریقے سے عوام کو انتقال اقتدار کا سبوتاژ ہونا لازمی ہے"۔

انہوں نے اس بیان میں اہل مغربی پاکستان کو چھ نکاتی فارمولے کی طرف سے مطمئن کرنے کے لئے کتنا یہ بھی کہا اور بلاشبہ بڑا اہم اقرار تھا کہ "عوامی لیگ چھ نکات کو مغربی پاکستان پر نہیں ٹھونسے گی اور اگر یونٹوں کی یہی خواہش ہو تو وفاقی حکومت کو اضافی اختیارات تفویض کئے جا سکتے ہیں"۔ اس اعلان اور اقرار کے بعد بھٹو صاحب کے تمام گلے اور شکوے دور ہو جانے چاہئیں تھے مگر ۲۸ فروری سے انہوں نے یکایک اسمبلی ملتوی کرنے کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر ان کی پارٹی کا کوئی رکن اجلاس میں شریک ہوا تو اس کی ہڈی پسلی توڑ دی جائے گی۔ اگر کسی دوسری جماعت کے ارکان شریک ہوئے تو واپسی پر ان سے انتقام لیا جائے گا۔ بعد میں یہ افسوسناک حقیقت منکشف ہوئی کہ بائیکاٹ کی اس سازش میں بھی یحییٰ خاں شریک تھے اور ولی خاں کے بقول انہوں نے جناب مفتی محمود، سردار شوکت حیات اور مولانا شاہ احمد نورانی وغیرہ پر زور دیا تھا کہ وہ بھی اجلاس کا بائیکاٹ کریں۔

یحییٰ خاں نے سیاسی جماعتوں کے قائدین سے ملاقاتوں میں جو ۲۰ اور ۲۲ فروری ۱۹۷۱ء کے درمیان ہوئیں، اس بات پر بھی زور دیا کہ وہ بیان جاری کریں کہ وہ ڈھاکہ میں بلائے گئے

قومی اسمبلی کے اجلاس میں جانے کو تیار نہیں۔

ہفت روزہ اداکار لاہور

۲۸ اگست ۱۹۷۲ء

بھٹو نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا جائے یا ۱۲۰ دن کے اندر دستور بنانے کی قید اٹھالی جائے ورنہ درۂ خیبر سے کراچی تک زبردست احتجاجی مظاہرے کریں گے۔ انہوں نے ۲۸ فروری کو جس جلسہ عام میں اسمبلی کے التوا کا مطالبہ کیا اس میں انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ مجیب کے چھ نکات میں سے پانچ کو تسلیم کرتے ہیں اور مشرقی پاکستان کے طلبا کے گیارہ میں سے دس نکات انہیں منظور ہیں۔ مغربی پاکستان میں چونکہ عام طور پر کسی کو معلوم نہ تھا کہ چھ نکات میں کیا کیا باتیں کہی گئی ہیں اور گیارہ نکات میں کیا کیا اس لئے کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بھٹو صاحب مجیب الرحمٰن کے چھ نکات میں سے جن پانچ نکات کو اب ماننے پر تیار ہو گئے ہیں وہ کیا کیا ہیں اور جس چھٹے نکتے کو وہ ماننے سے انکاری ہیں وہ کیا ہے؟ اس طرح یہ بات بھی کسی کی سمجھ میں نہ آسکی کہ وہ طلبا کے جن دس نکات کو ماننے پر تیار ہو گئے ہیں وہ کیا ہیں اور جس گیارھویں نکتے کو ماننے سے گریزاں ہیں وہ کیا ہے؟ بھٹو جن پانچ نکات کو ماننے پر تیار ہو گئے تھے ان میں اس کا وہ سب سے خطرناک نکتہ بھی تھا کہ پاکستان کو دو جدا گانہ مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس میں یہ نکتہ بھی تھا کہ ملک کے دونوں بازوؤں کے لئے ترجیحاً علیحدہ علیحدہ سکے ہوں۔ یہ بھی تھا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدہ فوج ہو۔ یہ بھی تھا کہ مرکز کے پاس دفاع اور خارجہ پالیسی کے علاوہ اور کوئی محکمہ نہ ہو۔ یہ بھی تھا کہ مرکز کو ٹیکس لگانے کا اختیار نہ ہو۔ یعنی ایسے تمام نکات جو ملک کو دو لخت کرنے کا سامان مضمر کئے تھے بھٹو کو منظور تھے اور جو نکتہ منظور نہ تھا وہ یہ تھا کہ ملک کے دونوں بازوؤں کی تجارت علیحدہ علیحدہ ہو یعنی ان چھ میں سے سب سے کم خطرناک شق ان کے لئے قابل قبول نہ تھی۔

اسی طرح سے طلباء کی طرف سے پیش کئے گئے گیارہ نکات میں سے جو نکتہ ان

کے لئے ناقابل قبول تھا وہ یہ تھا کہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کا ایک علاقائی وفاق (ZONAL FEDERATION) قائم کیا جائے۔ حالانکہ چھ نکاتی فارمولے کو تسلیم کرنے کے بعد مغربی پاکستان کے صوبوں کی سیاسی وحدت باقی رکھنے کے لئے یہ لازم تھا کہ چاروں صوبوں کا علاقائی وفاق قائم کیا جائے۔ علاقائی وفاق قائم کئے بغیر اگر چھ نکات کو تسلیم کیا جاتا اور اس کی بنیاد پر پاکستان کا آئین بنتا تو، چونکہ ون یونٹ کو توڑا جا چکا تھا، اس لئے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو بھی وہ ساری صوبائی خود مختاریاں دینی پڑتیں جن کا مشرقی پاکستان اب تک تنہا خواہاں تھا۔ اس طرح نہ صرف مشرقی پاکستان ملک سے ٹوٹتا بلکہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبے بھی بکھر جاتے۔ لہذا یہ گیارھواں نکتہ مشرقی پاکستان نے اس غرض سے شامل کیا تھا کہ انہیں ان کی مطلوبہ خود مختاری مل جائے اور مغربی پاکستان انتشار سے محفوظ رہے اور یہاں کے عوام کو چھ نکات سے کوئی گلہ نہ ہو۔ اگر مغربی پاکستان کے عوام چھ نکات اور گیارھویں نکتے سے باخبر ہوتے تو بھٹو کو یہ کہنے کی ہرگز جرأت نہ ہوتی کہ انہیں چھ نکات کا چھٹا نکتہ اور گیارہ نکات کا گیارھواں نکتہ منظور نہیں مگر افسوس کہ ہماری سیاسی بے خبری ہمیں لے ڈوبی۔ مزید افسوس کہ سیاسی جماعتیں بھی ان نکات سے بے خبر تھیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ماسوائے جماعت اسلامی کے سب کی سب بائیکاٹ کی ہمنوا بن گئیں۔ پھر جب انہیں بائیکاٹ کے مضمرات کا اندازہ ہوا تو ان کی آنکھیں کھلیں اور ماسوائے قیوم لیگ کے سب نے اجلاس میں شرکت کا فیصلہ کیا۔

مجیب الرحمٰن، ذوالفقار علی بھٹو کی ان سازشوں سے بہت پریشان ہو گئے۔ اس سے پہلے فروری کے پہلے ہفتہ میں گنگا نامی بھارتی ہوائی جہاز کے تباہ کئے جانے کا واقعہ ہو چکا تھا۔ بھارت نے جواباً پاکستان کے دونوں بازوؤں کے درمیان بھارت کی سرزمین کے اوپر سے پاکستانی جہازوں کی پرواز پر پابندی عائد کر دی تھی۔ اس سے ملک کے دونوں بازوؤں کے مابین فضائی رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ مجیب الرحمٰن نے اس سازش کو گنگا کے تباہ کئے جانے پر فوراً بھانپ لیا تھا اور اس کے تباہ کئے جانے کو واضع الفاظ میں ملک کے خلاف ایک سازش قرار دیا تھا۔ بعد کے واقعات نے ان کے اندیشے کو درست ثابت

Marfat.com

کیا اور معلوم ہوا کہ یہ دونوں لڑکے حریت پسند نہ تھے بلکہ بھارتی محکمہ جاسوسی کے ملازم تھے۔ اور ہوائی جہاز کو اغوا اسی مقصد کے تحت کیا گیا تھا جو بعد کے اقدامات کے ذریعہ حاصل کیا گیا۔[1]

۳ مارچ کے اجلاس سے پہلے مجیب الرحمٰن نے چاہا کہ مغربی پاکستان کے سلیم الطبع لیڈروں کے تعاون سے ایک آئینی فارمولا تیار کیا جائے۔ اس مقصد کے تحت ان کی جماعت کے سکریٹری جنرل قمر الزماں نے مولانا ظفر احمد انصاری کے نام، جو قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو چکے تھے اور آج بھی ملک کے سب سے دقیق النظر ماہر آئین ہیں، ایک رقعہ ارسال کیا جس میں ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اسمبلی کے اجلاس سے کچھ

---

[1] اس مسافر بردار ہوائی جہاز کو دو کشمیری لڑکوں نے جن کے نام ہاشم اور اشرف تھے سری نگر سے پرواز کے دوران اغوا کر کے ۳۱ جنوری ۱۹۷۱ء کو لاہور کے ہوائی اڈے پر اتار لیا تھا۔ ان دونوں نے خود کو کشمیری حریت پسند ظاہر کیا اور بھارتی حکومت کو الٹی میٹم دیا کہ وہ کشمیری محاذ آزادی کے گرفتار شدہ ارکان کو ۴۸ گھنٹے کے اندر رہا کر دے ورنہ ہوائی جہاز کو بم سے اڑا دیا جائے گا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے لاہور ایرپورٹ پر پہنچ کر ان دونوں لڑکوں کو ان کی حریت پسندی اور جرأت پر مبارکباد دی اور ہوائی جہاز کو تباہ کرنے کی ہمت افزائی کی۔ چنانچہ ۷۹ گھنٹے کے بعد ۲ فروری کو رات کے آٹھ بجے ان لڑکوں نے جہاز کو بم سے تباہ کر دیا۔ سردار عبدالقیوم بھانپ گئے کہ یہ بھارتی سازش ہے لہذا جہاز کے تباہ کئے جانے پر انہوں نے اس کی زبردست مذمت کی۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے بھی اس سازش کو بھانپ لیا مگر جب انہوں نے مذمت کی تو بھٹو کی طرف سے ان پر الزام عائد کیا گیا کہ انہیں کشمیریوں کی آزادی سے کوئی دلچسپی نہیں۔
صدر یحییٰ کے تحقیقاتی ٹریبونل اور بعد میں لاہور ہائیکورٹ نے ان لڑکوں کو بھارت کے محکمہ سراغ رسانی کا ایجنٹ پایا اور اس واقعے کو بھارت کی سازش قرار دیا۔ تعجب کی بات ہے اگر بھٹو اسے نہ بھانپ سکے۔

Marfat.com

دن پہلے ڈھاکہ تشریف لائیں تاکہ دستور سازی کے مسئلے پر ضروری صلاح ومشورہ ہو سکے۔ مولانا انصاری اسمبلی کے اجلاس سے قبل ڈھاکہ پہنچ گئے۔ ان کے علاوہ ۳۴ مزید ارکان ڈھاکہ پہنچ چکے تھے اور دس ارکان پہنچنے والے تھے۔ نہ جانے والوں میں صرف پیپلز پارٹی اور قیوم لیگ کے ارکان تھے۔ مگر ادھر ذوالفقار علی بھٹو نے اسمبلی کے انعقاد کے خلاف اس قدر شور وغل مچایا کہ یحییٰ خاں نے لیکا یک ۳ مارچ کا اجلاس ملتوی کر دیا۔ التوا کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں ایسے ناموافق حالات پیدا ہو گئے کہ مولانا کو عوامی لیگی لیڈروں سے گفت وشنید کا موقع نہ مل سکا۔

یحییٰ خاں نے التوا کے ساتھ حماقت یا زیادتی یہ کی کہ نئی تاریخ کا تعین نہ کیا۔ لہٰذا التوا کا بڑا شدید ردِعمل ہوا۔ اہل مشرقی پاکستان کے دل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ مرکزی حکومت انہیں اس حق کو حاصل کرنے سے روکنا چاہتی ہے جس کے وہ جائز طریقے پر حقدار بن چکے ہیں۔ چنانچہ غم وغصہ کے مارے وہ گھروں سے باہر نکل آئے اور سڑکوں پر زبردست مظاہرے اور توڑ پھوڑ شروع کر دی۔

غیر معینہ مدت کے لئے التوا کے خلاف یہ ردِعمل عین متوقع تھا۔ کرنل صدیق سالک کا، جو ان دنوں مشرقی پاکستان میں مامور تھے، کہنا ہے (ملاحظہ ہو ان کی تصنیف "میں نے ڈھاکہ کو ڈوبتے دیکھا" صفحہ ۱۲۴، ۱۲۵) کہ التوا کے فیصلہ کا اعلان نشر کرانے سے پہلے یحییٰ خاں کی حکومت نے مشرقی پاکستان کے گورنر جناب ریر ایڈمرل ایس۔ ایم۔ احسن کو فیصلے سے آگاہ کر دیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ مجیب الرحمٰن کو اس فیصلے سے آگاہ کر دیں اور ان کے ردِعمل سے مرکزی حکومت کو مطلع کریں۔ حسب ہدایت گورنر احسن نے مجیب الرحمٰن کو بلا کر التوا کے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ مجیب الرحمٰن اس خبر کو سن کر ذرا بھی برانگیختہ نہ ہوئے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا، اور وہ بھی نہایت معقولیت سے، کہ "میں اس التوا کو بہانہ بنا کر شور نہیں مچاؤں گا۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر التوا کے ساتھ اس کی نئی تاریخ کا بھی اعلان ہو جائے تو مجھے جماعت کے انتہا پسند عناصر کو کنٹرول کرنے میں سہولت ہو گی۔" مجیب کی گفتگو کا لبِ لباب راولپنڈی پہنچا دیا گیا۔ اس

Marfat.com

کے علاوہ یہ سفارش بھی کی گئی کہ التوا کے اعلان کے ساتھ نئی تاریخ کا اعلان ضرور کیا جائے۔ راولپنڈی سے جواب ملا کہ آپ کا پیغام پوری طرح سمجھ لیا گیا ہے۔ اس مختصر جواب کا مفہوم یہ سمجھا گیا کہ راولپنڈی نے گورنر کی تجویز کو شرف قبولیت بخش دیا ہے۔ مگر دوسرے دن یکم مارچ کو التوا کا اعلان جب نشر ہوا تو اس کے ساتھ میں نئی تاریخ کے تقرر کا کوئی ذکر نہ تھا۔

آگے چل کر صدیق سالک رقمطراز ہیں کہ (صفحہ ۱۲۶) "یکم مارچ کو التوا کے خلاف مظاہرے ہو چکنے کے بعد، شام کے وقت مجیب گورنمنٹ ہاؤس آئے اور وہاں انہوں نے اعلیٰ فوجی حکام کے سامنے نہایت عاجزانہ انداز میں اپیل کی کہ حضور اب بھی وقت ہے مجھے اجلاس کی نئی تاریخ لے دیجئے۔ اب بھی صورت حال پر قابو پا لوں گا البتہ اگر غیر معینہ عرصے کے لئے تاخیر کی گئی تو وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔ مجیب کی ان باتوں میں حاکمین اعلیٰ کو حب الوطنی کی بو آئی۔ انہوں نے نئی تاریخ کا تقرر کرانے کے لئے ٹیلیفون پر یحییٰ خان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن صرف لیفٹیننٹ جنرل ایس۔جی۔ایم۔ پیرزادہ تک پہنچ سکے۔ پیرزادہ نے بات کو وہ اہمیت نہ دی جو ڈھاکہ میں محسوس کی جا رہی تھی۔ پیرزادہ سے مایوس ہونے کے بعد لیفٹیننٹ جنرل عبدالحمید سے بات کی گئی۔ انہوں نے جنرل یحییٰ خاں سے بات کرنے کی حامی بھر لی مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ درخواست کو پذیرائی بخشنے کے بجائے اسی رات احسن صاحب کو گورنر کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔"

کرنل صدیق سالک مزید رقم طراز ہیں کہ "مجیب نے یہ کوشش ناکام ہوتے دیکھ کر نتیجہ اخذ کیا کہ ڈھاکہ انتظامیہ کا رویہ ہمدردانہ سہی لیکن راولپنڈی میں بیٹھے لوگ کچھ اور ہی سوچ رہے ہیں۔ اس کی ایک نہیں سنتے۔ شاید وہ "لاڑکانہ سازش" کو عملی جامہ پہنانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ شاید مصالحت کا وقت گزر چکا ہے۔ چنانچہ اس نے مصالحت کا راستہ چھوڑ کر عدم تعاون کی تحریک کا آغاز کر دیا اور کھلم کھلا محاذ آرائی کے راستے پر سفر شروع ہوا۔"

Marfat.com

مجیب الرحمٰن سچ مچ بڑی بے چارگی میں مبتلا ہو گئے۔ ایک طرف علیحدگی پسند عناصر انہیں علیحدگی کے راستے پر کھینچ رہے تھے اور دوسری طرف بھٹو اور یحییٰ خان انہیں اسی راستے پر دھکیل رہے تھے چنانچہ مجیب کو ناچار حکومت کے خلاف عدم تعاون کی تحریک شروع کرنی پڑی۔ ہڑتالوں اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور حکومت کو ٹیکس دینا بند کر دیا گیا۔

حکومت نے جواب میں ۲ مارچ کو کرفیو نافذ کر دیا اور مظاہرین پر گولی چلادی۔ جس سے متعدد افراد ناحق مارے گئے۔ فائرنگ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور ردِ عمل میں بڑی زبردست شدت پیدا ہو گئی۔

۳ مارچ کو مجیب الرحمٰن نے ڈھاکہ کے ریس کورس کے میدان میں ایک جلسہ عام کیا جس میں دس لاکھ کے قریب افراد نے شرکت کی۔ اس میں انہوں نے اسمبلی کے التوا پر اگرچہ بڑی برہمی کا اظہار کیا اور فائرنگ پر شدید غم و غصہ دکھایا مگر دستور سازی کے مسئلے پر انہوں نے بڑے متوازن خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ "مغربی پاکستان کے نمائندوں سے دستور پر بات چیت کی جائے گی تاکہ کسی صوبے کے ساتھ ناانصافی نہ ہو جائے کیونکہ مغربی پاکستان کے عوام بھی اسی طرح پستے رہے ہیں جس طرح مشرقی پاکستان کے عوام کا استحصال ہوا ہے۔"

یحییٰ خاں نے ۶ مارچ کو ایک نشری تقریر کی جس میں انہوں نے حزب اختلاف کی جماعتوں کو دعوت دی کہ وہ ایک گول میز کانفرنس میں شرکت کریں جس میں دستوری مسائل پر غور و فکر کر کے آئین پر اتفاق رائے پیدا کیا جا سکے۔ انہوں نے اسمبلی کے اجلاس کے لئے ۲۵ مارچ کی تاریخ مقرر کی۔

اس تقریر میں بھی انہوں نے ایک حماقت یا زیادتی یہ کی کہ اجلاس کے التوا کے خلاف مشرقی پاکستان میں کئے جانے والے مظاہروں پر مجیب الرحمٰن کو سخت برا بھلا کہا مگر اجلاس ملتوی کرانے والے اور ہڈی پسلی توڑنے کی دھمکی دینے والے بھٹو کے خلاف ایک لفظ زبان سے نہ نکالا۔ اس سے ان کی جانب داری ایک بار پھر عیاں ہو گئی۔ اور اس سے مشرقی پاکستان کے عوام کا غصہ

Marfat.com

مزید فزوں ہوا۔ ان کی اس تقریر کے دوسرے دن ۷ مارچ کو مجیب الرحمٰن نے ایک جلسہ عام میں تقریر کی اور پہلے کے مقابلے میں سخت تر موقف اختیار کیا۔ انہوں نے گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت مسترد کر دی اور کہا کہ "ہمیں ان لوگوں کے ساتھ کانفرنس کی میز پر بیٹھنے کی دعوت دی جا رہی ہے جن میں سے بعض کی عیارانہ چالیں اب بے گناہ اور نہتے عوام کی موت کا سامان بن رہی ہیں۔ ہمارے کانوں میں اس وقت بھی گولیوں کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ ہمیں بندوق کی نالی دکھا کر کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے۔ ان حالات میں اس دعوت کو قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لہٰذا میں اس دعوت کو مسترد کرتا ہوں۔"

انہوں نے اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے مندرجہ ذیل شرائط پیش کیں۔

۱: دستوری سازی سے پہلے اقتدار منتخب نمائندوں کو منتقل کیا جائے۔

۲: فوج بیرکوں میں واپس بھیجی جائے۔

۳: مارشل لا اٹھا لیا جائے اور

۴: فائرنگ کی تحقیقات کرائی جائے۔

اس چار نکاتی مطالبہ کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ دستور سازی سے پہلے اقتدار منتقل کیا جائے۔ یہ مطالبہ بھی چنداں بے جا نہ تھا۔ پاکستان میں دستور سازی سے پہلے اقتدار کی منتقلی کی نظیر موجود تھی۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام اسی طریقے پر عمل میں آیا تھا کہ پہلے اقتدار اسمبلی کو منتقل ہوا پھر اسمبلی نے دستور بنایا۔ ۱۹۶۹ء کی گول میز کانفرنس میں اقتدار کی دو متبادل صورتوں میں سے ایک یہ تھی کہ پہلے اسمبلی کو اقتدار منتقل کیا جائے پھر وفاقی پارلیمانی دستور کا مسئلہ طے ہو۔

اسمبلی کے التوا کی وجہ سے یکم مارچ تا سات مارچ کے چھ دنوں کی مختصر سی مدت میں مشرقی پاکستان کے عوام کے دلوں میں مرکزی حکومت اور مغربی پاکستان کے خلاف جو غم و غصہ پیدا ہوا وہ گذشتہ ۲۴ سال کے غم و غصہ پر بھاری تھا۔ اس صورت حال نے علیحدگی پسند عناصر کو غیر معمولی تقویت بہم پہنچائی۔ چنانچہ ایسے عناصر کی طرف سے مجیب الرحمٰن

Marfat.com

پر دباؤ ڈالا جانے لگا کہ ۷ مارچ کی تقریر میں وہ آزادی کا یکطرفہ طور پر اعلان کر دیں۔
۶ اور ۷ مارچ کی درمیانی رات کو یہ مسئلہ عوامی لیگ کی مجلس عاملہ میں رکھا گیا مگر آزادی کے اعلان کے خواہاں اور اس کے مخالف ارکان میں سے کوئی بھی غالب نہ آسکے۔ جس کی وجہ سے اجلاس میں فیصلہ نہ ہوسکا۔ اس نازک لمحے کے بارے میں صدیق سالک رقم طراز ہیں (۱۳۲-۱۳۳) کہ آزادی کا اعلان کرنے میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ فوج اپنا فرض ادا کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کا عوامی لیگ کی قیادت کو بھی احساس تھا لہٰذا اس کی سنجیدہ قیادت ایسی صورت حال کو ٹالنا چاہتی تھی مگر انتہاپسند گروہ اعلان آزادی میں مزید تاخیر کے خلاف تھا۔ سالک صاحب لکھتے ہیں کہ "مجیب الرحمٰن کا اپنا ذہن کس طرف تھا؟ اس کی کوئی نشاندہی نہیں ہوسکی۔ ان کے قریبی حلقوں کا کہنا تھا کہ وہ ایک گروہ کے دباؤ میں آکر کبھی ایک طرف جھک جاتے اور کبھی دوسرے گروہ کے کہنے پر دوسری طرف"۔ وہ مزید رقم طراز ہیں کہ اس رات (۶ اور ۷ مارچ کی درمیانی رات) دو بجے مجیب کے دو معتمد علیہ نمائندے جی۔ او۔سی میجر جنرل خادم حسین راجہ سے ملے اور ان تک مجیب تک کا یہ پیغام پہنچایا کہ "انتہاپسند عناصر ان پر بے حد دباؤ ڈال رہے ہیں کہ ۷ مارچ کو آزادی کا ایک طرفہ اعلان کر دیں۔ وہ اب تک یہ مطالبہ ٹالتے رہے ہیں لیکن اب ان میں مزاحمت کی ہمت نہیں رہی۔ لہٰذا انہوں نے درخواست کی ہے کہ فوج انہیں اپنی تحویل میں لے لے"۔

بہرکیف معقولیت اور اعتدال پسندی، انتہاپسندی پر غالب آئی اور مجیب الرحمٰن نے آزادی کا اعلان کرنے سے گریز کیا۔ انہوں نے جلسے میں بنگلہ دیش کا قومی پرچم لہرانے سے بھی انکار کیا جس کے لیے ان پر سخت دباؤ تھا۔[۱]

---

[۱] آزادی کے اعلان سے باز رکھنے میں دو باتیں مؤید بنیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ ۶ اور ۷ مارچ کی درمیانی رات کو یحییٰ خاں نے مجیب الرحمٰن کو ایک تار ارسال کیا جس میں ان سے خواہش کی گئی کہ وہ جلد بازی سے کوئی فیصلہ نہ کریں۔ انہوں نے اپنے تار میں کہا

باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

Marfat.com

بہرکیف ! اسمبلی کے اجلاس کے التوا پر مشرقی پاکستان میں جو ردعمل ہوا اور مزید جن نقصانات کے اندیشے پیدا ہوئے اسے دوسری سیاسی جماعتوں نے بڑی دردمندی کے ساتھ محسوس کیا۔ ان جماعتوں میں مسلم لیگ، جماعت اسلامی، جمعیت علمائے پاکستان، جمعیت علمائے اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی یعنی ماسوائے قیوم لیگ کے سب ہی تھیں۔ ان سب جماعتوں کو اس امر کا بھی اچھی طرح یقین ہوگیا کہ بحران کا اصل سبب ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی پیپلز پارٹی ہے اور اس بحران کو اگر دور نہ کیا گیا تو یہ ملک کے لئے ہلاکت خیز ثابت ہوگا۔ چنانچہ ان سب جماعتوں کی جانب سے اس امر کی کوشش کی جانے لگی کہ پیپلز پارٹی کی پرواہ کئے بغیر عوامی لیگ کے ساتھ مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ ملک بحران سے نکل سکے۔ جماعت اسلامی نے پروفیسر غلام اعظم کے ذریعے اور مسلم لیگ نے ممتاز محمد خاں دولتانہ کے ذریعے مفاہمت کی کوششیں شروع کردیں۔ مفاہمت کی نہج یہ تھی کہ اقتدار کی منتقلی کی تائید کی جائے اور دستور سازی میں عوامی لیگ کے ساتھ تعاون کی راہ تلاش کی جائے۔ اس سلسلے میں ۱۰ مارچ کو لاہور میں اسمبلی کی "اقلیتی جماعتوں" کے پندرہ اکابرین کا ایک اجلاس نواب زادہ نصراللہ خاں کے مکان پر منعقد ہوا۔ اس میں مجیب الرحمٰن کی جانب سے اقتدار کی منتقلی کے مطالبے کی حمایت کی گئی۔ اس اجلاس میں مولانا ظفر احمد انصاری کی اس تجویز سے اتفاق کیا گیا کہ "جو پارٹیاں اسمبلی کے اجلاس میں شرکت پر رضامند ہیں ان کے رہنما مشترکہ طور پر شیخ مجیب الرحمٰن سے جاکر ملاقات کریں اور افہام و تفہیم کے ذریعے وطن عزیز کی سالمیت کو درپیش خطروں کا تدارک کریں۔" اس کے تین دن بعد لاہور میں مفتی محمود

پچھلے صفحہ کا حاشیہ

تھا کہ میں جلد ہی ڈھاکہ آؤں گا۔ میرے ذہن میں ایسا نقشہ ہے جو چھ نکات سے بڑھ کر آپ کو مطمئن کر سکے گا۔ اعلان آزادی سے باز رکھنے والی دوسری وجہ یہ تھی کہ امریکی سفیر متعینہ پاکستان مسٹر فارلینڈ نے ۷ مارچ کی صبح کو مجیب الرحمٰن سے ملاقات کی اور ان پر امریکی حکومت کی یہ پالیسی واضح کی کہ علیحدگی کا اعلان کرنے کی صورت میں امریکہ ان کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔

Marfat.com

کی صدارت میں اقلیتی جماعتوں کے اکابرین کا ایک اور اجتماع ہوا اور اس میں بھی اسی نوع کے فیصلے کئے گئے۔ مشرقی پاکستان میں اس کا اچھا ردِعمل ہوا اور عوامی لیگ کے قائد جناب قمرالزماں نے اس حمایت پر ان سب کا شکریہ ادا کیا۔ اگر ان کوششوں کو جاری رہنے کا موقع ملتا تو قوی امید تھی کہ مفاہمت ہو جاتی اور ملک بحران سے نکل جاتا۔

بھٹو مفاہمت کے آثار دیکھ کر سخت متوحش ہوئے چنانچہ انہوں نے مفاہمت کے امکان کو رد کرنے کے لئے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ مغربی پاکستان کے باشندوں میں مشرقی پاکستان کے باشندوں کے خلاف ایسی نفرت پیدا کر دی جائے جیسی کسی ملک کے باشندوں کو دشمن ملک کے باشندوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کے بعد علیحدگی کی کوشش کی جائے۔

اس منصوبے کے بموجب انہوں نے ۱۴ مارچ ۱۹۷۱ء کو کراچی کے نشتر پارک میں ایک جلسہ عام کیا۔ اس میں انہوں نے سب سے پہلے شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ ڈھاکہ میں اپنے مذاکرات کی روداد بیان کی۔ چھ نکاتی فارمولے پر مجیب الرحمٰن کی عدم مفاہمت کا نقشہ کھینچا۔ مجیب الرحمٰن کو ہٹ دھرم اور پاکستان کی سالمیت کا دشمن قرار دیا۔ خود کو بہت بڑا محبّ وطن اور قائداعظم کے پاکستان کا محافظ قرار دیا (واضح ہو کہ راقم الحروف خود اس جلسے میں موجود تھا) اور جب عوام کے تحسین و آفرین کی صدائیں سُن سُن کر انہیں یقین آگیا کہ ان کی تقریر کا سحر سامعین پر پوری طرح طاری ہو چکا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ:

"جس طرح عوامی لیگ کو مشرقی پاکستان میں اکثریت حاصل ہے اسی طرح پیپلز پارٹی کو یہاں اکثریت حاصل ہے لہٰذا وہاں کا اقتدار وہاں کی اکثریتی پارٹی کو اور یہاں کا اقتدار یہاں کی اکثریتی پارٹی کو منتقل کر دیا جائے۔"

اس جملے کو زبان سے ادا کرنے کے بعد گویا انہوں نے ریاکاری کی وہ نقاب چہرے سے اتار پھینکی جو عرصے سے چڑھا رکھی تھی اور ان لوگوں کو جو انہی بالغ نظری کے سبب سے انہیں بہت پہلے سے وطن دشمن سمجھتے اور کہتے آرہے تھے بار ثبوت سے سبکدوش کر دیا۔

ان کا یہی وہ جملہ ہے جو اختصاریہ بیان میں "یہاں ہم اور وہاں تم" کا نعرہ بن کے مشہور ہوا۔ اس سلسلے میں اس امر کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مقدمۂ قتل کی سماعت

Marfat.com

کے دوران ۱۷ دسمبر تا ۲۰ دسمبر ۱۹۷۸ء سپریم کورٹ کے روبرو اپنے مقدمہ کے دفاع میں جو بیان دیا اس میں اپنے بارے میں اس الزام کی بھی تردید کی کہ انہوں نے مذکورہ جلسے میں ملک کو تقسیم کرانے کا مطالبہ کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے "یہاں ہم وہاں تم" کا جو فقرہ استعمال کیا تھا اس سے میری مراد "یہاں سے ہم وہاں سے تم باہم مل کر حکومت بنائیں" تھی۔ یہ ان کی صریح کذب بیانی تھی کیونکہ انہوں نے "یہاں ہم وہاں تم" کا فقرہ ادا ہی نہ کیا تھا۔ یہ فقرہ تو، جیسا کہ ابھی بتایا گیا، دونوں بازوؤں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے لئے ان کے مطالبے کو مختصر لفظوں میں بیان کرنے کے لئے وضع کیا گیا تھا۔

بہر کیف یحییٰ خان نے اسمبلی کے اجلاس کی دوسری تاریخ ۲۵ مارچ مقرر کی اور قبل ازیں مجیب الرحمٰن سے مذاکرات کے لئے ڈھاکہ گئے۔ اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے قومی اسمبلی کے بہت سے ارکان بھی ڈھاکہ پہنچ گئے مگر سازشی عناصر نے مجیب الرحمٰن سے یحییٰ خاں کی مفاہمت نہ ہونے دی۔ یحییٰ خان ۱۵ مارچ کو ڈھاکہ گئے۔ انہوں نے ۱۶، ۱۷، ۱۹، ۲۰ اور ۲۱ کو مجیب الرحمٰن سے کم سے کم پانچ ملاقاتیں کیں۔ اس دوران یعنی یکم مارچ سے اس وقت تک یحییٰ خاں نے پے در پے ایسے اقدامات کئے کہ ان کی ذات پر سے اہل مشرقی پاکستان کا اعتبار اٹھ گیا۔ مثلاً یکم مارچ کو انہوں نے مشرقی پاکستان کے گورنر جناب ایڈمرل مظفر احسن کو جو وہاں بہت مقبول تھے، گورنری کے عہدے سے ہٹا دیا۔ ۶ مارچ کو انہوں نے ٹکا خاں کو گورنر بنا دیا۔ قبل ازیں ۲۲ فروری کو یکایک اپنی کابینہ جو سویلین افراد پر مشتمل تھی، برطرف کر دی۔ پُر آشوب وقت میں ان کے یہ اقدامات نہایت پُر اسرار سمجھے گئے اور مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندی کا رجحان قوی تر ہوتا چلا گیا۔ علیحدگی پسندوں کے سرخیل مولانا بھاشانی کی جنہیں کوئی پوچھتا نہ تھا، یکایک مقبولیت بہت بڑھ گئی اور ولی خاں کے الفاظ میں آٹھ سال کے بعد پہلی بار ان کے جلسوں میں ہجوم ہونے لگا۔ اب حالات کو سنبھالنا مجیب الرحمٰن کے اختیار میں بھی نہ رہا تھا۔ دوسری طرف وہ یحییٰ خاں کی نیک نیتی سے بھی مایوس ہو چکے تھے اس لئے اُن سے مذاکرات میں انہوں نے سخت تر موقف اختیار کیا اور اسمبلی کے ۲۵ مارچ کے مجوزہ اجلاس میں شرکت کے لئے شرط پیش کی کہ ۷ مارچ کو ان کی (مجیب الرحمٰن کی) طرف سے پیش کئے جانے

Marfat.com

والے چار نکاتی مطالبات کی منظوری کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی اعلان کیا جائے کہ صوبائی حکومتیں قائم کر دی جائیں گی اور مشرقی پاکستان کو چھ نکاتی پروگرام کے مطابق مکمل اختیارات دیئے جائیں گے۔ دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ قومی اسمبلی کے مشرقی اور مغربی پاکستان کے ارکان پر مشتمل دو جدا جدا کمیٹیاں بنائی جائیں جو ایک متعینہ مدت کے اندر اپنی الگ الگ دستوری سفارشات تیار کریں۔ پھر قومی اسمبلی کا اجلاس منعقد ہو جس میں ان دونوں رپورٹوں کو مدغم کر کے ایک قابل قبول آئین ترتیب دیا جائے۔

عوامی لیگ کی طرف سے یحییٰ خاں کو اس کے ساتھ یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ صدر مملکت کے عہدے پر انہیں فائز رہنے دیا جائے گا۔ خان عبدالولی خاں (ہفت روزہ اداکار لاہور ۲۸ اگست ۱۹۷۲ء) اور کرنل صدیق سالک (۱۴۳) کے مطابق یحییٰ خاں اس تجویز پر راضی ہو گئے تھے۔ مگر اس تجویز کے نفاذ کو انہوں نے بھٹو کی رضامندی کے ساتھ مشروط کیا جو اس وقت مغربی پاکستان میں تھے۔ بھٹو ۲۱ مارچ کو ڈھاکہ پہنچے۔ یحییٰ خاں نے عوامی لیگ کا یہ فارمولا ان کے سامنے پیش کیا مگر انہوں نے اسے مسترد کر دیا۔ (صفحہ ۱۴۴)۔ جس طرح ۱۷ جنوری کو لاڑکانے میں یحییٰ بھٹو ملاقات کے دوران یحییٰ خاں کے دل میں مجیب الرحمٰن کی طرف سے یہ خوف بٹھا دیا گیا تھا کہ اگر انہوں نے مجیب الرحمٰن کو وزیراعظم بنا دیا تو وہ یحییٰ خاں کو صدر نہیں رہنے دے گا اسی طرح اس موقع پر بھی، عبدالولی خاں کے بقول، یحییٰ خاں کے دل میں یہ خوف بٹھا دیا گیا کہ اگر انہوں نے مارشل لا اٹھا لیا تو وہ وجہ جواز ہی ختم ہو جائے گا جس کی بدولت وہ صدارت کے منصب پر فائز ہیں۔ چنانچہ یہ خوف یحییٰ خاں کے دل میں جاگزیں ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یحییٰ خاں نے یہ فارمولا مسترد کر دیا۔ اگر اس فارمولے کو غور سے دیکھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ اس میں ایک بھی ایسی بات نہیں جو عوامی لیگ کے چھ نکات سے زیادہ بڑی ہو۔ اس فارمولے کی عملی شکل یہ ہوتی کہ مشرقی پاکستان کے ارکان اسمبلی اپنے صوبے کے لئے چھ نکات پر مبنی دستور بناتے اور مغربی پاکستان کے ارکان

ایک ایسا دستور بناتے جس میں، مرکز کو تفویض کئے جانے والے اختیارات کے علاوہ باقیماندہ اختیارات کے دو حصے کئے جاتے۔ اختیارات کا ایک حصہ صوبوں کو دیا جاتا اور باقیماندہ اختیارات کو استعمال کرنے کے لئے چاروں صوبوں کا ایک علاقائی وفاق (ZONAL FEDERATION) قائم کیا جاتا۔ اگرچہ نکات کو ماننا ہی تھا اور یحییٰ خاں اور بھٹو اسے ماننے پر پہلے سے قریب قریب تیار ہو چکے تھے تو مغربی پاکستان کو اس کے مضمرات سے بچانے کے لئے اس سے بہتر صورت اور کیا تھی کہ ملک کے اس بازو میں ایک علاقائی وفاق قائم کیا جائے۔ مگر یحییٰ خاں نے اسے اس درپردہ اندیشے کی بنا پر مسترد کر دیا کہ مارشل لا اٹھا لئے جانے کے بعد عوامی لیگ انہیں شاید صدر مملکت نہ رہنے دے اور بھٹو نے اس کی مخالفت اس بنا پر کی کہ اسے تسلیم کر لینے سے مشرقی پاکستان کو کاٹ کر علیحدہ کر دینے کی اسکیم نامکمل رہ جاتی۔[1]

بہر کیف! اس استرداد کے بعد عوامی لیگ اقتدار کی منتقلی کی طرف سے کلیتہً مایوس ہو گئی اور اور مفاہمت اور مصالحت کی کوئی راہ اس کے سامنے باقی نہ بچی۔ اب اس کے سامنے صورت حال یہ تھی

---

[1] خان عبدالولی خاں نے حمود الرحمٰن کمیشن میں بیان دیا (ملاحظہ ہو ہفت روزہ اذکار لاہور نمبر ۲۸-۸-۲) کہ دو اسمبلیوں والی تجویز حقیقتاً یحییٰ خاں کی تھی۔ یحییٰ خاں نے تجویز پیش کی کہ دونوں بازوؤں کی اسمبلیاں الگ الگ دستور بنائیں۔ مجیب نے دیکھا کہ یحییٰ خاں اسمبلی کا اجلاس بلانے پر آمادہ نہیں تو اس حالت جبر میں (UNDER DURESS) دو اسمبلیوں کی تجویز پر متفق ہو گئے تا کہ وہ پاکستان کے وزیر اعظم نہیں بن سکتے تو کم سے کم مشرقی پاکستان کی حکومت ہاتھ میں آ جائے کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ اگر اس کام میں دیر کی تو شاید پھر کوئی اور مارشل لا آ جائے۔

بقول ولی خاں، یحییٰ خاں کی تجویز (کی تفصیل) یہ تھی کہ دونوں اسمبلیوں کے اجلاس جدا جدا مشرقی اور مغربی پاکستان میں ہوں۔ دونوں جدا جدا آئین تیار کریں۔ پھر ان کا اکٹھا اجلاس ہو اور وہ یہ طے کریں کہ وہ کن کن اختیارات سے مرکز کے حق میں دست بردار ہونے کو تیار ہیں۔

اس مسئلے میں اگر ولی خاں کی معلومات درست ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک کی تقسیم کی یہ تجویز بھی، بھٹو صاحب کی ۱۴ مارچ ۱۹۷۱ء والی تجویز کی طرح جو انہوں نے نشتر پارک کراچی کے جلسۂ عام میں پیش کی تھی (تفصیل صفحہ ۱۱۰ پر دیکھئے) مغربی پاکستان کی طرف سے ہی پیش کی گئی۔

Marfat.com

کہ انتخابات جیت لینے کے باوجود وہ یحییٰ خاں کو اپنے اوپر مسلط رکھے۔ چنانچہ بہ مطابق کرنل صدیق سالک (صفحہ ۱۲۵) ۲۴ مارچ کو عوامی لیگ نے نئی تجاویز پیش کر دیں۔ یہ دراصل آئینی طور پر مشرقی پاکستان کی نیم علیحدگی کی تجویز تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ (دو کمیٹیوں کے بجائے) دو دستوری کونشن بنائے جائیں۔ یہ کنونشن مشرقی اور مغربی پاکستان کے لئے دو علیحدہ علیحدہ آئین بنائیں اور ان دساتیر کو الحاقِ پاکستان یا کنفڈریشن کے لئے بنیاد بنایا جائے۔

اُدھر، بہ روایت کرنل صدیق سالک (۱۴۲) یحییٰ خاں کئی دنوں سے فوجی کارروائی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ بقول ولی خاں (ادا کارہ- ۲۸ اگست ۱۹۷۲ء) ۲۳ اور ۲۴ مارچ کی درمیانی رات کو انہوں نے فوجی افسروں کی میٹنگ میں فوجی کارروائی کی پوری اسکیم مکمل کر لی۔ ولی خاں کے دعوے کے بموجب انہوں نے یحییٰ خاں کو بہتیرا سمجھایا کہ " وہ مجیب سے محاذ آرائی نہ کریں کیونکہ جو شخص اس وقت پاکستان کو ایک رکھ سکتا ہے وہ صرف مجیب ہے۔ آپ جتنا اس کے ہاتھ کمزور کریں گے اتنا ہی زیادہ آپ ایسی صورت حال پیدا کر دیں گے جس سے ملک کی علیحدگی ناگزیر ہو جائے کیونکہ ان دنوں مجیب الرحمٰن پر بایاں بازو کی طرف سے جس کی قیادت بھاشانی کر رہے تھے سخت دباؤ ہے۔ گذشتہ آٹھ سالوں میں پہلی بار اس کے جلسوں میں رش ہو رہا ہے"، مگر یحییٰ خاں کی تو در پر [illegible]یم ہی کچھ اور تھی۔ ان پر اس قسم کی نصیحتوں کا کیا اثر ہوتا۔ بہ روایت کرنل صدیق سالک (صفحہ ۱۴۵) ۲۴ تاریخ کو بھٹو سے یحییٰ خاں کی ایک اور ملاقات ہوئی اور اس میں عوامی لیگ کے خلاف فوجی کارروائی پر دونوں کے مابین اتفاق رائے ہوا۔

مجیب الرحمٰن بھی یحییٰ خاں کی ان چالوں سے بے خبر نہ تھے۔ اور ولی خاں کے بقول انہوں نے ۲۴ مارچ کی صبح کو ولی خاں اور ممتاز دولتانہ کو فوجی کارروائی کے یحییٰ خاں کے منصوبے سے باخبر کر دیا اور بچشم نم ان دونوں سے درخواست کی کہ اقتدار منتقل نہیں ہوتا ہے تو نہ ہو مگر بے گناہ بنگالیوں کو ناحق قتل نہ کیا جائے۔

یحییٰ خاں نے اپنے طے شدہ منصوبے کے بموجب ۲۴ مارچ کی رات کو مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا۔ صوبائی حکومت کا کنٹرول فوجی گورنر (ٹکا خاں) کے حوالے کر دیا اور اس کے بعد ڈھاکہ سے واپس آ گئے۔ انہوں نے اسلام آباد واپس آ کر ۲۶ مارچ کی شام کو ریڈیو پر قوم سے خطاب کیا اور عوام کو فوجی کارروائی کی ہولناک اطلاع سنائی۔ اس تقریر میں انہوں نے مجیب الرحمٰن کی تحریک عدم تعاون کی

مذمت کی اور اسے غدار قرار دیا۔ یہ سب کچھ ذوالفقار علی بھٹو کی خواہش کے عین مطابق اور بقول یحییٰ خاں، ان کے مشورے پر ہوا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اس اقدام پر اپنی مسرت کا اظہار ان لفظوں میں کیا کہ: "خدا کا شکر ہے کہ پاکستان بچ گیا۔" مگر حقیقتاً یہ مشرقی پاکستان کے ساتھ نہایت بے رحمانہ برتاؤ تھا جو اختیار کیا گیا اور اس اقدام نے اسے علیحدگی کے راستے پر دھکیل دیا۔ اس واقعے نے بعض دوراندیش رہنماؤں کا، جن میں مولانا ظفر احمد انصاری قابل ذکر ہیں، یہ خیال بالکل درست ثابت کر دیا کہ سازشی عناصر مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے نہ صرف یہ کہ کاٹ دینا چاہتے ہیں بلکہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اسے اس بے رحمی کے ساتھ کاٹا جائے کہ آئندہ کبھی نہ جڑ سکے۔

مشرقی پاکستان کے آخری گورنر وائس ایڈمرل ایس۔ ایم۔ احسن نے ایک خصوصی انٹرویو (قومی ڈائجسٹ، جون ۱۹۷۹ء) میں وہاں کے حالات کا سیر حاصل تجزیہ کرنے کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن کے بارے میں اپنی حتمی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے کہ "میں اس کنوکشن پر پہنچا تھا کہ مجیب پاکستان کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔" انہوں نے اپنی اس رائے کا بھی قطعیت کے ساتھ اظہار کیا ہے کہ "اسلام آباد اقتدار مشرقی پاکستان کے حوالے کرنے پر تیار نہیں تھا۔" احسن صاحب کے ان دونوں نکتوں کو اگر یکجا کر کے دیکھا جائے تو اس کے علاوہ اور کیا نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ساری غلطی ہماری تھی۔

چھ نکاتی فارمولے سے عوامی لیگ کی دست برداری

جہاں تک عوامی لیگ کا معاملہ ہے، شواہد بتاتے ہیں کہ وہ مفاہمت کی دل سے خواہاں تھی اور مفاہمت کی خاطر چھ نکات میں ردوبدل کرنے پر بھی آمادہ تھی مگر، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بتایا گیا، علیحدگی پسندوں بالخصوص مولانا بھاشانی کا اسقدر دباؤ تھا کہ عوامی لیگ کھلم کھلا چھ نکات میں ردوبدل کا اعلان نہیں کر سکتی تھی۔ ہاں جب دستور سازی کا وقت آتا یا اعتماد کی فضا میں مذاکرات کئے جاتے تو وہ اپنا مصالحتی فارمولا پیش کر سکتی تھی۔ عام لوگ چھ نکات کے متن سے واقف نہ تھے اس لئے ترمیمات کو دستور میں اس طرح سمویا جا سکتا تھا کہ بادی النظر میں چھ

Marfat.com

نکات سے کوئی انحراف نظر نہ آئے۔ کرنل صدیق سالک (صفحہ ۱۲۳) اس امر کے راوی ہیں کہ فروری کے آخر میں عوامی لیگ کی مرکزی مجلس عاملہ کے دو ارکان نے مجیب سے ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ ان کا یہ پیغام یحییٰ خاں تک پہنچا دیا جائے کہ انہیں فوراً ڈھاکہ آنا چاہیئے۔ اگر وہ ڈھاکہ تشریف لے آئیں تو عوامی لیگ چھ نکات میں ایسی ترمیم کردے گی کہ وہ مغربی پاکستان کے لئے قابل قبول ہوں گے۔ انہوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ بظاہر عوامی لیگ اپنے موقف پر قائم رہے گی مگر اپنے پروگرام کے ہر نکتے میں ایسی شق کا اضافہ کردے گی کہ اس کا قابل اعتراض حصہ بے معنی ہو کر رہ جائے مثلاً

(الف) بیرونی تجارت صوبائی ذمہ داری ہوگی اور تجارتی وفد صوبے ہی بھیجیں گے اور تجارتی معاہدوں کے لئے غیر ممالک سے مذاکرات بھی وہی کریں گے لیکن مرکز کی توثیق کے بغیر کوئی معاہدہ نافذ العمل نہیں ہوگا۔

(ب) کسی صوبے کی آمدنی خواہ وہ اندرونی وسائل سے ہو یا بیرونی ذرائع سے، صوبائی ریزرو بنک میں جمع ہوگی مگر یہ رقم مرکزی رابطہ کمیٹی کی منظوری سے خرچ کی جاسکے گی جس میں تمام صوبوں کو برابر کی نمائندگی حاصل ہوگی۔

(ج) محصولات جمع کرنا صوبائی ذمہ داری ہوگی لیکن اگر مرکز یہ کام اپنے ذمہ لینا چاہے تو ہمیں اعتراض نہیں ہوگا۔

(د) ہم علیحدہ کرنسی یا موجودہ کرنسی کے علیحدہ نظام کے مطالبے پر اصرار نہیں کریں گے۔

انہوں نے کہا کہ ہم ان باتوں کو تحریری طور پر دینے کو تیار ہیں۔ جب میں نے پوچھا کہ آپ کی اتھارٹی کیا ہے تو انہوں نے بتایا کہ وہ مجیب الرحمٰن کی منظوری سے یہ باتیں کہہ رہے ہیں۔ یہ اسکیم یحییٰ خاں تک پہنچا دی گئی۔ ترمیمی اسکیم کی وصولیابی کا مطلب یہ ہے کہ مجیب الرحمٰن سے جس چیز کی فرمائش کی جارہی تھی وہ انہوں نے پوری کردی تھی۔ اس کے بعد ان کے ساتھ محاذ آرائی کی کوئی وجہ باقی نہیں رہ گئی تھی۔ مگر یحییٰ خاں اور ان کے ہمنوا تو اندرونی طور پر کچھ اور ہی چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے اس اسکیم کی کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دی اور بھٹو صاحب کے حسب خواہش اسمبلی کا اجلاس ملتوی کردیا۔

Marfat.com

شیخ مجیب کی گرفتاری اور حوادث مابعد

بہر کیف! مجیب الرحمٰن گرفتار کر کے مغربی پاکستان لے آئے گئے جہاں وہ نو ماہ تک یحییٰ خاں کی قید میں رہے۔ اگر ملک کو بچانا مقصود ہوتا تو یحییٰ خاں ان سے مفاہمت کی ایک اور کوشش کر سکتے تھے، خواہ یہ کوشش بے نتیجہ رہتی۔ بہ روایت چوہدری ظہور الٰہی، یحییٰ خاں نے بعد میں خود اعتراف کیا کہ "مجیب الرحمٰن مفاہمت کے دل سے خواہاں تھے"، مگر یحییٰ خاں نے مفاہمت کی کوشش سے نہ صرف یہ کہ گریز کیا بلکہ ان پر غداری کا مقدمہ قائم کیا۔

اہلِ مشرقی پاکستان کے ساتھ یہ طرزِ عمل ان کے لئے قطعاً خلاف توقع تھا اور علیحدگی کی جس راہ پر انہیں دھکیلا جا رہا تھا وہ اس پر جانے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ نہ صرف مجیب الرحمٰن بلکہ پوری عوامی لیگ اس کے لئے تیار نہ تھی کیونکہ وہ اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھتی تھی کہ پاکستان سے علیحدگی کا مطلب اس کا بھارت کے زیر تسلط چلا جانا ہے۔ جہاں تک اس دوران یا اس سے پہلے ان کے باغیانہ اقدامات کا تعلق ہے وہ دراصل مرکزی حکومت یا سازشی عناصر کے معاندانہ اقدامات کا محض ردِ عمل تھے اور اگر انصاف کے ساتھ دیکھا جائے تو یہ ردِ عمل ہرگز غیر فطری نہ تھا۔ دو سال بعد ذوالفقار علی بھٹو نے بلوچستان کی اکثریتی جماعت کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کیا اور اس کا بھی اسی قسم کا ردِ عمل ظہور پذیر ہوا۔

فوجی کارروائی کے بعد، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان بھاگ جانے والے عوامی لیگی لیڈروں نے کلکتہ میں ایک جلاوطن حکومت قائم کی مگر باقی ماندہ لیڈروں نے مفاہمت کی کوششیں جاری رکھیں

Marfat.com

اس سلسلے میں وہ جو کچھ کر سکتے تھے ان سب نے کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے بیگم اختر سلیمان کو، جو اب مستقلاً مغربی پاکستان میں سکونت پذیر ہیں، یحییٰ خاں کے پاس بھیجا کہ مفاہمت کی کوئی صورت نکالی جائے مگر وہ اس درخواست کو مختلف حیلے بہانوں سے ٹال گئے۔ ان لوگوں نے غیر سیاسی افراد کو بھی وسیلہ بنایا۔ اس کام کے لئے جناب احمد۔ ای۔ ایچ جعفر سے رابطہ قائم کیا جنہوں نے اس وقت کے سکریٹری امور خارجہ جناب سلطان محمد خاں کے ذریعے عوامی لیگ کا پیغام مفاہمت یحییٰ خاں تک پہنچوایا۔ حکیم محمد سعید کو بھی وسیلہ بنایا گیا مگر ان تمام گذارشات کے ساتھ یحییٰ خاں نے بے توجہی برتی۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے حالات کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد مسئلے کا یہ حل تجویز کیا کہ ۱۹۵۶ء کا دستور بحال کر دیا جائے اور اس کے بموجب اسمبلی کو اقتدار منتقل کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ اب اقتدار کی منتقلی ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت عمل میں نہیں آسکتی تھی کیونکہ یہ آئین ون یونٹ اور نشستوں کی مساوات کی بنیاد پر بنایا گیا تھا جسے یحییٰ خاں نے قبل ازیں توڑ دیا تھا۔ انتقال اقتدار کی سب سے قابل عمل شکل ۱۹۵۴ء کے آئین کی بحالی ہی تھی مگر یحییٰ خاں نے یہ تجویز بھی نہ مانی۔

فوجی کارروائی کے چھ ماہ بعد یحییٰ خاں نے ایک اور بڑی بھاری غلطی کی۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کے ہنگاموں میں ملوث افراد کو ۴ ستمبر کو یکا یک عام معافی دے دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو مجرمین جیلوں میں بند کر دیئے گئے تھے آزاد کر دیئے گئے اور انہوں نے پھر سے گوریلا سرگرمیاں شروع کر دیں۔ جو لوگ بھاگ کر ہندوستان چلے گئے تھے وہ گوریلا سرگرمیوں کی ٹریننگ لے کر واپس آگئے اس طرح صوبے میں پھر سے بڑے پیمانے پر باغیانہ سرگرمیاں شروع ہوگئیں اور فوج نے جو امن و امان قائم کیا تھا وہ درہم برہم ہوگیا۔ فوج تنہا ملک کی سرحدوں کی حفاظت کا بھی اور داخلی امن و امان کی بحالی کا بھی دوگونہ فریضہ انجام نہیں دے سکتی تھی لہٰذا ایسے نازک اور پُر خطر وقت میں جماعت اسلامی آگے بڑھی۔ اس کے کارکنوں نے جو بیشتر بنگالی تھے، اسلامی مملکت کے تحفظ کے لئے البدر اور الشمس نام کی تنظیمیں قائم کیں، فوج سے اسلحہ حاصل کیا اور گوریلوں کے خلاف سینہ سپر ہوگئے۔ ملک کے دفاع میں اس کے ہزاروں رضاکاروں نے خود اپنے بھائیوں کے ہاتھوں سے گولیاں کھائیں، جام شہادت نوش کیا اور وطن کے تحفظ کے لئے رضاکارانہ قربانی کی نظیر قائم کی۔

فوجی کارروائی کے ساتھ ساتھ یحییٰ خاں نے عوامی لیگ کو غدار جماعت قرار دے کر اسے

Marfat.com

خلاف قانون قرار دے دیا۔ اور صوبے میں تمام قسم کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی مگر دو باتوں کا تعین نہ کیا۔ ایک یہ کہ قومی اسمبلی برقرار رہی یا نہیں، دوئم یہ کہ اسمبلی برقرار ہے تو عوامی لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے والے ارکان اپنی جماعت کے غدار قرار پانے کے بعد اسمبلی کے رکن باقی رہے یا نہیں؟ پانچ مہینے تک اس مسئلے پر بڑی الجھن قائم رہی اور اس مسئلے پر سیاسی جماعتوں میں بڑے بحث و مباحثے ہوتے رہے۔ اس کے بعد یحییٰ خاں نے اعلان کیا کہ قومی اسمبلی کا وجود قائم ہے اور عوامی لیگ کے ۱۶۷ میں سے ۸۸ ارکان کی، ان کی حب الوطنی کی بناپر اسمبلی کی رکنیت بحال رہے گی۔ باقیماندہ ارکان کی نشستیں خالی قرار دے دی گئیں اور ان پر ضمنی انتخابات کرانے کا اعلان کیا گیا۔ اس ضمنی انتخاب میں زیادہ تر دائیں بازو کی جماعتوں نے متحدہ محاذ بنا کر حصہ لیا۔ اور اپنے امیدوار کھڑے کئے۔ پیپلز پارٹی نے بھی اپنے کچھ امیدوار نامزد کیے۔ کالعدم قرار پا جانے کی وجہ سے مقابلے پر چونکہ عوامی لیگ نہ تھی اس لئے متحدہ محاذ اور پیپلز پارٹی کے امیدوار تقریباً بلامقابلہ منتخب ہو گئے۔ ضمنی انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان میں ایک صوبائی وزارت بھی بنوائی گئی۔ اس دوران بھٹو نے جو اب تک مجیب الرحمٰن کے ساتھ معرکہ آرائی کی وجہ سے یحییٰ خاں کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، اب علیحدہ راستہ اختیار کر لیا اور گیارہ ستمبر کو مزار قائد اعظم پر ایک جلسہ عام میں یحییٰ خاں سے مطالبہ کیا کہ مشرقی پاکستان کا مسئلہ حل ہونے تک انہیں انتظار میں نہ رکھا جائے بلکہ مغربی پاکستان کا اقتدار ان کے حوالے کر دیا جائے۔ انہوں نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اقتدار ان کے حوالے نہیں کیا گیا تو ہم دیکھتے ہیں کہ "کارخانے کیسے کھلتے ہیں، بینکوں اور یونیورسٹیوں میں کام کس طرح ہوتا ہے اور کسان کس طرح بٹائی ادا کرتے ہیں"۔ یہاں سے ان دونوں کے مابین مفادات کا ٹکراؤ شروع ہوا۔ اس مطالبے کے جواب میں یحییٰ خاں نے یہ موقف اختیار کیا کہ ایک ملک میں دو نظام نہیں چل سکتے کہ آدھے ملک پر مارشل لا مسلط رہے اور آدھے ملک میں جمہوریت بحال کر دی جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ اقتدار قومی اسمبلی کو منتقل کریں گے اور قومی اسمبلی ابھی نامکمل ہے (کیونکہ مشرقی پاکستان کے ارکان اس میں شریک ہونے پر قادر نہیں) اس لئے ابھی اسمبلی کا اجلاس طلب نہیں کیا جا سکتا۔ قبل ازیں ۲۸ جون ۱۹۷۱ء کو ایک نشری تقریر کے ذریعے انہوں نے قومی اسمبلی کے ملتوی شدہ اجلاس کے لئے ۲۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کی تاریخ مقرر کی تھی۔ اسمبلی سے نیا دستور بنوانے

کی اسکیم کا حشر یحییٰ خاں نے دیکھ لیا تھا اسے دہرانے کا اب ان کے پاس جواز نہ تھا لہٰذا انہوں نے انتقال اقتدار کی نئی اسکیم تیار کی اور اسے قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس اسکیم کے بموجب انہوں نے اعلان کیا کہ دستور کا مسودہ حکومت کی طرف سے اسمبلی میں پیش کیا جائے گا اور اسمبلی کو نوے دن کی مہلت اس امر کے لئے دی جائے گی کہ وہ اس مدت کے دوران جتنی کچھ ترمیمیں کرنا چاہتی ہو کرلے۔ اس کے بعد وہی مسودہ، دستور کی حیثیت اختیار کر لے گا۔ اس کی تمام شقوں کو زیر بحث لانا ضروری نہ ہوگا۔ اس کے بعد اقتدار قومی اسمبلی کو منتقل کر دیا جائے گا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہی صورت سب سے مناسب تھی اور یہی صورت حال یحییٰ خاں کو اس صورت کے بجائے اختیار کرنی چاہیے تھی جس میں انہوں نے قومی اسمبلی پر ذمہ داری ڈالی تھی کہ وہ ۱۲۰ دن کے اندر دستور بنائے ورنہ از خود ٹوٹ جائے گی۔ اس وقت دستور سازی میں ناکامی کی صورت میں اسمبلی کو ٹوٹ جانے سے بچانے کے لئے میاں طفیل محمد نے یہی تجویز پیش کی تھی کہ دستور کا مسودہ حکومت کی طرف سے پیش کیا جائے اور اس پر صرف اس امر کی ذمہ داری ڈالی جائے کہ وہ ۱۲۰ دن کی مہلت میں جتنی ترمیمیں کرنا چاہتی ہو کرلے۔ یحییٰ خاں نے یہ تجویز اس وقت مان لی ہوتی تو مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو کے مابین وہ تباہ کن معرکہ آرائی نہ ہوتی جو ۱۹۷۱ء کا بحران پیدا کرنے کا موجب بنی[1]۔ دستور کا محولہ بالا مسودہ یحییٰ خاں نے سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس جناب اے۔ آر کارنیلیس سے تیار کرایا۔

۲۷ دسمبر کے اجلاس کے لئے مشرقی پاکستان کے ارکان اسمبلی بہت پہلے سے اسلام آباد پہنچنا شروع ہو گئے مگر بھارت کو اقتدار کی منتقلی گوارا نہ تھی کیونکہ وہ مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنا طے کر چکا تھا اور اس کے لئے عرصے سے کوشاں تھا۔ اقتدار کی منتقلی کی صورت میں کم سے کم اتنی بات تو اس کے خلاف ضرور جاتی کہ اس کی منظور نظر عوامی لیگ حصول اقتدار سے محروم رہتی چنانچہ

---

[1] اس تجویز کا تمام لیڈروں نے خیر مقدم کیا مگر بھٹو صاحب نے ایک انٹرویو کے ذریعے جو انہوں نے ۸ جولائی ۱۹۷۰ء کو کیہان انٹرنیشنل کو ایران کے قیام کے دوران دیا۔ اس تجویز کی پُرزور مخالفت کی۔ پاکستان واپس آنے کے بعد ایک عرصے تک ۱۲۰ اس تجویز کا تمسخر اڑاتے رہے۔

Marfat.com

اس نے نہایت عجلت کے ساتھ مشرقی پاکستان پر باقاعدہ حملہ کر دیا۔

بھارتی حملے کے سلسلے میں دو باتوں کا تذکرہ ضروری ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس اسکیم میں خود اپنے ملک کے کون کون لوگ شریک تھے اور انہیں کیا کیا کردار سونپے گئے تھے۔

بھارت کے ممکنہ حملے کے اندیشے کے پیش نظر حکومت نے قبل ازیں فوجی جرنیلوں کا ایک وفد چین بھیجا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ حملے کی صورت میں چین کی مدد حاصل کی جائے مگر چین نے جنگ کی صورت میں مدد دینے سے معذوری ظاہر کی اور مشورہ دیا کہ حکومت پاکستان عوامی لیگ کے ساتھ سیاسی مفاہمت کی کوشش کرے۔ چین، جس نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان کو بھارتی حملے سے محفوظ رکھا تھا، اس کی ۱۹۷۱ء میں معذرت کی دو وجوہات تھیں۔ ایک یہ تھی کہ تھوڑا عرصہ پہلے بھارت کا روس سے ایک دفاعی معاہدہ ہو چکا تھا۔ اس لئے چین اس جنگ میں حصہ لینے سے گریزاں تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ پاکستان کی فوجی مدد کی صورت میں اسے اہل مشرقی پاکستان کے خلاف نفرت کا ہدف بننے کا اندیشہ تھا۔ مذکورہ فوجی وفد میں ذوالفقار علی بھٹو بہ اصرار شامل ہوئے تھے۔ بذات خود چین جانے سے انہیں یہ اطمینان حاصل کرنے کا موقع ملا کہ جنگ کی صورت میں چین بے تعلق رہے گا۔ وہ ۸ نومبر کو چین سے واپس آئے۔ اس کے چند دن بعد نومبر کے اوائل میں وہ یورپ کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ ان ہی دنوں بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی بھی یورپ کے دورے پر تھیں اور اس دورے میں وہ پاکستان کے خلاف زہر اگل رہی تھیں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے سوئٹزرلینڈ جا کر ان سے ملاقات کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس ملاقات میں، اور یہی ملاقات ان کے دورہ یورپ کا مقصد تھی، انہوں نے اندرا گاندھی کو مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دی اور انہیں اس امر کا بھی اطمینان دلایا کہ بھارت کے حملے کی صورت میں چین میدان جنگ میں نہیں اترے گا۔[۵] اندرا گاندھی نے اس کے بعد اگرچہ اپنے ذرائع سے بھی چین کی عدم مداخلت کا اطمینان حاصل کر لیا مگر اس ملاقات کے دو تین ہفتے بعد ہی انہوں نے مشرقی پاکستان پر بھرپور حملہ کر دیا۔

بھارتی حملے کے فوراً بعد پاکستان نے اپنا ایک وفد انجمن اقوام متحدہ میں بھیجنے کا فیصلہ

---

۵ ورنہ پھر کس لئے انہوں نے اندرا گاندھی سے خفیہ ملاقات کی؟

کیا۔ بھٹو اس وفد کے بھی قائد بن گئے مگر جنگ کی سنگینی اقوام متحدہ کے اجلاس میں پہنچنے کے لئے جس عاجلانہ روانگی کی متقاضی تھی انہوں نے اس کے بالکل برعکس روش اختیار کی۔ پہلے تو انہوں نے اس امر کے لئے اصرار کیا کہ وہ نائب وزیراعظم کے عہدے کا چارج لے لیں پھر روانہ ہوں گے۔ کچھ وقت اس کام میں گذر گیا۔ پھر وہ خشکی کے راستے کابل کے لئے روانہ ہوئے۔ وہاں سے یورپ پہنچے۔ وہاں رکے۔ پھر نیویارک پہنچے اور وہاں پہنچ کر انفلوائنزا میں مبتلا ہو گئے۔ اگر وہ فی الواقعی انفلوائنزا میں مبتلا ہو گئے تھے اور ایسے بیمار تھے کہ واقعی اجلاس میں شرکت سے معذور تھے تو انہیں وفد کے کسی دوسرے فرد کو اجلاس میں بھیجنا چاہیئے تھا مگر انہوں نے ایسا نہ کیا اور اپنی صحت یابی کے منتظر رہے۔ ادھر مشرقی پاکستان کی جنگی حالت دگرگوں ہوتی چلی گئی وہ جب اسمبلی کے اجلاس میں پہنچے، اس وقت تک مشرقی پاکستان کا چاروں طرف کا علاقہ بھارت کے تسلط میں جا چکا تھا البتہ ڈھاکہ اور اس کے اطراف کا بڑا حصہ ابھی تک محفوظ تھا۔ یہ صورتحال تھی جب پولینڈ نے جنگ بندی کی قرارداد پیش کی۔ اگر وہ قرارداد منظور کر لی جاتی تو جنگ فوراً بند ہو جاتی اور مشرقی پاکستان کی پاکستان کے ساتھ وحدت برقرار رہتی۔ پھر مذاکرات کے ذریعے بھارت کے قبضے میں گیا ہوا علاقہ واپس لیا جا سکتا تھا مگر بھٹو نے اس قرارداد کو پاکستان کے مفاد کے منافی قرار دیا اور اسے پھاڑ کر واک آؤٹ کر گئے۔ مشرقی پاکستان میں ہماری فوجیں بھارتی دباؤ کا تادیر مقابلہ نہیں کر سکیں اور ۱۶ دسمبر کو ہتھیار ڈال دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کا یہ بازو ہم سے علیحدہ ہو گیا۔

یحییٰ خاں نے جنگ کے دنوں میں جنگی صورت حال سے ملک و قوم کو ہی نہیں بلکہ خود اپنی کابینہ کو بھی بالکل بے خبر رکھا۔ ۷ دسمبر کو انہوں نے جناب نورالامین کو خود دعوت دے کر وزیراعظم بنایا تھا مگر انہیں بھی صورت حال سے بالکل تاریکی میں رکھا اور جب بھی جناب نورالامین نے صورتحال کو سمجھنا چاہا یحییٰ خاں نے انہیں اس مغالطے میں مبتلا کرنے کی کوشش کی کہ میدان جنگ میں پاکستان کی پوزیشن بڑی مستحکم ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ پاکستان کے دوست ممالک بھی بہت جلد مدد کرنے کو آنے والے ہیں وغیرہ، وغیرہ۔ مگر جب حالات بالکل قابو سے باہر ہو گئے تو انہوں نے کمال بے فکری کے ساتھ ہتھیار ڈالنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ اس کے بعد ۱۵ دسمبر

Marfat.com

کی رات کو جناب نورالامین، یحییٰ خاں سے ملنے گئے تو ان کے بقول یحییٰ خاں نہایت بے فکری کے ساتھ جنرل حمید کے ساتھ محفل مے نوشی جمائے بیٹھے تھے۔ ان کی باتوں سے جناب نورالامین نے اندازہ لگایا کہ ہتھیار ڈالنے کا حکم جاری کرنے کا انہیں مطلقاً کوئی صدمہ نہ تھا (زندگی ۲۴ جنوری ۱۹۷۲ء)

بہرکیف! یحییٰ و بھٹو بمقابلہ مجیب الرحمٰن معرکہ آرائی کے حقائق و واقعات اور ان کے محرکات کو، جن کا خلاصہ سطور بالا میں بیان کیا گیا، یکجا کر کے غور کرنے سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ان دونوں فریقوں کے مابین محاذ آرائی فی الواقع دستوری مسائل یا چھ نکات پر نہ تھی بلکہ حصول اقتدار کی خاطر تھی۔ مجیب اکثریتی پارٹی کے قائد تھے اس لئے قدرتی طور پر وہ اس امر کے خواہاں تھے کہ وہ اقتدار کے مالک بنیں۔ اس کے برعکس بھٹو کی کوشش یہ تھی کہ (کم از کم اتنا ضرور ہو کہ) مشرقی پاکستان کو علیحدہ کر دیا جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ باقیماندہ پاکستان کے مطلق العنان فرماں روا نہیں بن سکتے تھے۔ یحییٰ خاں کے بارے میں کم سے کم اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اپنے اقتدار کی خاطر انہیں مشرقی پاکستان کی پروا نہ تھی۔ اگر وہ ان کے اقتدار تلے پاکستان سے وابستہ رہنے پر راضی رہتا تو انہیں اعتراض نہ تھا۔ اگر اسے یہ شرط منظور نہ تھی تو اس کے علیحدہ ہو جانے کا انہیں کوئی غم نہ تھا۔

بھٹو نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے چھ نکات کو محض ایشو بنایا۔ چھ نکات کی مخالفت انہوں نے اس بنا پر نہ کی کہ اس سے پاکستان کمزور ہوتا بلکہ اس بنا پر کی کہ اس سے مشرقی پاکستان کمزور رشتے کے ساتھ ہی سہی مغربی پاکستان سے بندھا رہتا۔

یحییٰ خاں کو اگر اطمینان خاطر رہتا کہ مجیب کی حکومت میں ان کی صدارت قائم رہے گی تو وہ اسمبلی کے انعقاد میں ہرگز حائل نہ ہوتے۔ بھٹو نے انہیں مجیب کی طرف سے اس قدر خوف زدہ کر دیا کہ انہوں نے نہ صرف اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا بلکہ دستور کے مسئلے پر بھی ہیرا پھیری شروع کر دی۔ حالانکہ یہ کام ان کے دائرہ کار سے باہر تھا۔

مجیب الرحمٰن دو بلاؤں میں گرفتار تھے۔ ایک طرف تو علیحدگی پسند ان پر اس قدر حاوی تھے کہ انہیں قابو میں رکھنا ان کے لئے مشکل ہوا جا رہا تھا، دوئم یہ کہ ان میں تدبر کی بھی کمی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ بھٹو اور یحییٰ خاں کے جال میں پھنستے چلے گئے۔ قبل ازیں گول میز کانفرنس کے موقع پر وہ یحییٰ خاں کی چالوں میں آ کر زبردست نقصان اٹھا چکے تھے۔ مگر اس کے بعد بھی انہیں عقل نہ آئی۔ اگر وہ ۳ مارچ

Marfat.com

سے اجلاس کا التوا تحمل کے ساتھ گوارہ کر لیتے تو امکان غالب تھا کہ یحییٰ اور بھٹو کی چالیں ناکام ہو جاتیں۔ اب رہا مجیب الرحمٰن کا کسی نئے مارشل لا کے امکان سے خوفزدہ ہونا، تو یہ دور از کار بات تھی۔ بھٹو اور یحییٰ خاں نے مجیب کی ان دونوں کمزوریوں سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ اس محاذ آرائی میں آخری فتح بھٹو کو ضرور ہوئی مگر آخری شکست مجیب الرحمٰن کو نہیں بلکہ اس بدنصیب ملک کو ہوئی۔

مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی کا منظر و پس منظر آپ نے ملاحظہ فرما لیا مگر اس سے یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ اس کی علیٰحدگی صرف ان داخلی عوامل کے ذریعے عمل میں آئی جس کا ہم نے اب تک تذکرہ کیا ہے۔ اسے علیٰحدہ کرنے میں بیرونی عوامل بھی یکساں طور پر کام کر رہے تھے۔

مشرقی پاکستان کو علیٰحدہ کرنا امریکہ اور روس دونوں کا مشترکہ مقصد تھا۔ روس کا اس وجہ سے کہ پاکستان کو کمزور تر کرنا اس کی، مستقبل کی توسیع پسندانہ پالیسی کا عین تقاضا تھا، اس کی توسیع پسند پالیسی میں افغانستان اور پاکستان کو مغلوب کر کے بحیرۂ ہند تک رسائی حاصل کرنا شامل تھا۔ یہ کام پاکستان کو دولخت کر کے زیادہ آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا تھا۔ کرنل ایس۔ جی مہدی کا کہنا ہے کہ ۱۹۷۱ء کے جولائی میں یحییٰ خاں نے امریکہ کو چین سے قریب تر لانے کی جو کوشش کی اور امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر کے دورۂ چین کے لئے پاکستان کو بطور راہداری استعمال کرنے کا جو موقع فراہم کیا، اس سے روس بہت ناراض ہوا اور یہ ناراضگی بھی مشرقی پاکستان کو علیٰحدہ کرنے میں روس کی فعالیت کا سبب بنی۔ یحییٰ خاں نے بھی مدیر اردو ڈائجسٹ کو ایک خصوصی انٹرویو (مطبوعہ جنوری ۱۹۷۹ء) میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ اسے توڑنا امریکہ کا مقصد اس وجہ سے تھا کہ وہ چین کے گرد اپنے حلیف یا نیم حلیف ممالک کا جو فوجی حصار قائم کرنا چاہتا تھا، مشرقی پاکستان اس میں حارج ہو رہا تھا۔ ۱۹۶۲ء کی چینی بھارتی جنگ میں بھارت کو، اپنے آسام کے محاذ جنگ پر کمک بھیجنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا کیونکہ بھارت کو آسام سے ملانے والی ریلوے لائن مشرقی پاکستان سے گزرنے کی وجہ سے اب اس کے تصرف میں نہیں رہی تھی۔ اسے دشوار گزار راستے سے کمک بھیجنی پڑتی تھی۔ چین کے خلاف مشرقی پاکستان کی اس فوجی اہمیت کی بنا پر جب سے امریکہ اور بھارت اسے پاکستان سے منقطع کرنے کے خواہش مند تھے۔ اس جنگ کے اختتام کے بعد سے امریکہ نے مشرقی پاکستان کے لیڈروں کو علیٰحدہ ہونے کی ترغیب دینا شروع کر دی تھی۔ اس سازش کا انکشاف اور اس پر بہی

Marfat.com

کا اظہار خود خواجہ ناظم الدین (سابق وزیراعظم پاکستان) نے کیا تھا کیونکہ اس سلسلے میں امریکی حکام نے خود انہیں آلۂ کار بنانا چاہا تھا۔ اس امر کے باوجود کہ ۱۹۷۱ء میں امریکہ نے چین سے دوستی کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں، مشرقی پاکستان کے معاملے میں اس کی مذکورہ حکمت عملی تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ جناب نورالامین نے ۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو روزنامہ جاوداں لاہور کو ایک خصوصی انٹرویو میں امریکہ کی دخل اندازی کی طرف کھلا اشارہ کیا تھا اور ان کا کہنا تھا کہ دونوں بازوؤں کے لیڈران امریکہ کی شہ پر اپنا اپنا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اس سوال کے جواب میں کہ پھر دونوں لیڈر (اشارہ مجیب اور بھٹو کی طرف تھا) امریکہ کو گالیاں آخر کیوں دیتے ہیں۔ انہوں نے بڑے پتے کی بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ "امریکہ گالیاں کھا کر بھی اس وجہ سے بے مزہ نہیں ہوتا کہ اس طرح اس کا کام زیادہ اچھی طرح انجام پاتا ہے"۔ تاہم واقعہ نگاری کا تقاضہ یہ ہے کہ اس بات کا تذکرہ بھی ضرور کر دیا جائے کہ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ خود امریکی صدر نکسن پاکستان کو توڑنے کے سخت مخالف تھے اور انہوں نے اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ اپنی بھارت نواز انتظامیہ اور اپنی رائے عامہ کے آگے بے بس تھے۔ کرنل مہدی کے الفاظ میں صدر نکسن اس موقع پر اسی قدر بے بس تھے جس قدر واٹر گیٹ اسکینڈل کے موقع پر خود اپنے آپ کو بچانے سے۔ خان عبدالولی خاں کا کہنا ہے (ملاحظہ ہو حمود الرحمٰن کمیشن میں ان کا بیان) کہ مارچ کے مہینے میں پاکستان میں متعین امریکی سفیر مسٹر فارلینڈ نے ڈھاکہ جا کر مجیب الرحمٰن سے جو ملاقات کی تھی (اور جسے پاکستان کے معاملات میں امریکہ کی دخل اندازی سمجھا گیا تھا۔ مصنف) اس میں انہوں نے مجیب الرحمٰن کو انتباہ کیا تھا کہ امریکہ ان کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔ کرنل صدیق سالک نے بھی مسٹر فارلینڈ سے منسوب کردہ اس انتباہ کی تصدیق کی ہے۔ سابق امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے بھی اپنی یادداشتوں میں جو ابھی حال میں شائع ہوئی ہیں مجیب الرحمٰن سے فارلینڈ کی ملاقات کی یہی غایت بیان کی ہے۔

ان دونوں بڑی طاقتوں نے پاکستان کو دولخت کرنے کے لئے دونوں بازوؤں کے مابین صوبائی تعصبات کو استعمال کیا۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی شکل میں ایک مضبوط صوبہ پرست قیادت پہلے سے موجود تھی۔ مغربی پاکستان سے انہیں اسی قسم کی ایک صوبہ پرست قیادت ابھارنی تھی۔ ان سب کی نگاہیں ذوالفقار علی بھٹو پر پڑیں۔ اور اس کام میں ان طاقتوں کی طرف سے ان کی ہر ممکن مدد کی

Marfat.com

گئی۔ انتخابات کے زمانے میں پیپلز پارٹی کے پاس روپے کی جو ریل پیل تھی اسے دیکھ کر کسی کو یقین کرنے میں تامل نہ تھا کہ یہ باہر کا پیسہ ہی ہو سکتا ہے جو اس فراوانی سے خرچ کیا جا رہا ہے۔ ممتاز صحافی جناب زیڈ۔اے سلہری جو بھٹو کے ذاتی اور نہایت قریبی دوستوں میں رہ چکے ہیں پاکستان ٹائمز کی ۲۱ اپریل ۱۹۷۹ء کے ایک مضمون میں ان کے لئے بیرونی امداد کی الزام کی تائید ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھٹو کسی اور چیز پر بھروسہ کر رہے ہیں اور اس چیز نے مجھے بھی چونکا دیا اور مجھے بھی اس بات کا شبہ ہونے لگا کہ مسٹر بھٹو نے کسی بیرونی طاقت سے رابطہ قائم کر رکھا ہے۔ انہیں بیرونی حمایت حاصل ہے اور اس کا انتظام انہوں نے اپنے غیر ملکی سفر میں کیا تھا۔ مگر اس کے بارے میں میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا اس لئے میں اس پر کوئی رائے زنی کرنے سے معذور تھا مگر تمام معاملات سے ظاہر ہوتا تھا کہ مسٹر بھٹو پوری طرح تیار ہیں۔ بعد میں یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ اپنی مہم کے دوران انہوں نے بے دریغ روپیہ خرچ کیا اور پاکستان پیپلز پارٹی نے اسی بیرونی امداد کے زور پر خوب جلسے کیے، جلوس نکالے اور اپنی تنظیم کو مضبوط کیا۔"

بہر کیف! یحییٰ خاں نے ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ایک نشری تقریر کے ذریعے جہاں مشرقی پاکستان کے سقوط کی جاں گسل خبر سنائی وہاں انہوں نے یہ کہہ کر قوم کی ڈھارس بندھائی کہ اقتدار کی منتقلی اور دستوری حکومت کے قیام کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ مگر اس اعلان کے فوراً بعد انہوں نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ دستوری مسودہ پیش کرنے اور اسمبلی کا اجلاس بلانے کا فیصلہ منسوخ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بغیر دستوری حکومت کا قیام عمل میں نہیں آ سکتا تھا۔ اگر وہ اپنے وعدے کو عملی جامہ پہناتے تو اس امر کے باوجود کہ اقتدار کی وارث پیپلز پارٹی ہی بنتی ملک میں دستوری حکومت قائم ہو جاتی اور پارلیمانی نظام بحال ہو جاتا۔

مشرقی پاکستان کے سقوط کو بھٹو صاحب کی محض اقتدار پسندی کی مثال سمجھا جاتا ہے اور اس واقعے کے بعد سے ان کے بارے میں ان کے مداحوں اور نکتہ چینوں دونوں کی یکساں رائے ہے کہ وہ انتہا درجے کے اقتدار پسند تھے۔ اتنے کہ اس کی خاطر انہوں نے ملک توڑنے میں بھی تامل نہ کیا۔ مگر میری رائے میں ان کے بارے میں یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ اگر ان کے پورے سیاسی کردار کو

Marfat.com

یکجا کر کے دیکھا جائے تو اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ وہ خواہ اقتدار پسند بھی رہے ہوں اور یہ کچھ عجیب بات نہیں کیونکہ سیاست میں آنے والا ہر آدمی کسی نہ کسی حد تک اقتدار پسند ضرور ہوتا ہے، وہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھے۔ ان کے متعدد اقدامات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے دل میں کچھ اور بات بھی تھی جو ان کی اقتدار پسندی پر بھی غالب تھی۔ پاکستان کو نقصان ان کی اقتدار پسندی سے اتنا نہ پہنچا جتنا ان کے اس مخفی عامل کی وجہ سے پہنچا۔ میری یہ رائے دو باتوں پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ اگر وہ محض اقتدار پسند ہوتے تو مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی پر قانع ہو جاتے اور مغربی پاکستان کا اقتدار حاصل کر لینے کے بعد وہ اسے مضبوط و متحد کرنے پر توجہ دیتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو تمام عمر اس کے اقتدار پر فائز رہ سکتے تھے کیونکہ ان کی سی غیر معمولی صلاحیت کا حامل کوئی اور لیڈر نہ تھا مگر اس کے برعکس انہوں نے پیہم ایسے اقدامات کئے جس سے پاکستان کی ساکھ اور وحدت کو نقصان پہنچا۔ ہم ذیل میں ایسی چند مثالیں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کر رہے ہیں جن سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اقتدار کے بجائے کچھ اور چاہتے تھے۔

(۱) فروری ۱۹۷۴ء کی اسلامی سربراہی کانفرنس میں ایک سے زیادہ مسلمان ممالک نے شرکت سے انکار کیا۔ ان میں اردن، ایران اور مراکش بھی تھے۔ ان تینوں ممالک سے پاکستان کے گہرے برادرانہ تعلقات قائم چلے آ رہے تھے مگر بھٹو صاحب نے ان کی عدم شرکت کی پروا نہ کی۔ انہوں نے پروا کی تو افغانستان کے انکار کی حالانکہ اس کا رویہ پاکستان کے ساتھ عرصے سے معاندانہ تھا۔ انہوں نے افغانستان کو منانے کے لئے اپنے وزیر خارجہ عزیز احمد کو کابل بھیجا۔ عزیز احمد صاحب نے افغانستان کو شرکت پر رضامند کیا مگر کانفرنس میں شرکت کے لئے افغانستان کے سربراہ خود نہ آئے بلکہ اپنے وزیر خارجہ عبدالرحمٰن پژواک کو بھیجا جو پاکستان کے بدترین مخالف تھے۔ انہوں نے کانفرنس میں پختونستان کے مسئلے پر نہایت زہریلی تقریر کر ڈالی۔ یہ تقریر سرتاسر پاکستان کے مفاد اور موقف کے خلاف تھی۔ افغانستان کو پختونستان کا مسئلہ پیش کرنے کے لئے تمام عمر اس سے بہتر فورم میسر نہ آ سکتا تھا جو بھٹو صاحب نے اسے فراہم کر دیا۔ پھر جب اس تقریر کا جواب دینے کا وقت آیا تو بھٹو صاحب نے یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی کہ چونکہ وہ کانفرنس کے میزبان ہیں لہٰذا اس کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھتے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان کے جیسا زیرک سیاستدان اس امر کا اندازہ نہ لگا سکتا تھا کہ افغانستان

Marfat.com

کو شرکت پر رضامند کیا گیا تو ان کا مندوب اپنی تقریر میں کس مسئلے کو موضوع بنائے گا ؟ یا تقریر سے پہلے اس کا عندیہ معلوم نہ کیا جا سکتا تھا ؟ یا یہ تقریر ان کے پیشگی علم میں نہ تھی تو اس کا جواب نہ دیا جا سکتا تھا ؟ اس قسم کی پاکستان دشمن تقریر کا موقع فراہم کرنے سے بھٹو صاحب کی اقتدار پسندی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا ؟

(۲) مذکورہ کانفرنس مسلمان ممالک کے مسائل پر غور و فکر کرنے کے لئے منعقد کی گئی تھی چنانچہ اس میں فلسطین کا مسئلہ بھی زیرِ غور آیا، اریٹیریا کا بھی، قبرص کا بھی، فلپائن کا بھی اور دیگر مسلمان ممالک کا بھی، سردار عبدالقیوم خاں کشمیر کا مسئلہ بھی پیش کرنا چاہتے تھے مگر بھٹو صاحب نے اس کی اجازت نہ دی ۔ ان کے اس انکار سے یہ ثابت ہوا کہ وہ کشمیر کے مسئلے کو مسلمان ممالک کا کوئی لائق اعتنا مسئلہ نہیں سمجھتے ۔ ان کے اس موقف سے ان کی اقتدار پسندی کو کیا تقویت حاصل ہوتی ؟

(۳) بین الاقوامی تعلقات یا خارجہ امور میں پاکستان کی سابقہ حکومتوں نے جو غلطیاں کیں اور جو غلط اقدامات کئے ان کا ریکارڈ وزارت خارجہ کی فائلوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کے نکلوایا اور اسے ۲ نومبر ۱۹۷۶ء کو اخبارات میں پورے اہتمام سے شائع کروایا ۔ یہ مواد جو سترہ ضمیموں پر مشتمل ہے اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جن جن ملکوں سے پاکستان کے تعلقات خراب ہوئے اس میں ساری غلطی ہماری ہی تھی فریق ممالک کی نہ تھی ۔ اگر واقعتاً ایسا تھا تو یہ مواد چھپانے کا تھا ۔ شائع کرنے کا خیال تو کسی دشمن کے دل میں ہی آ سکتا تھا ۔ مثلاً ایسے وقت میں جبکہ چین سے ہمارے تعلقات قریبی اور دوستانہ ہیں، وزارت خارجہ کی دستاویز کے حوالے سے یہ راز افشا کیا گیا کہ چین کو اقوام متحدہ کا رکن بنانے کا مسئلہ جب درپیش ہوا تو پاکستان نے امریکہ کے زیرِ اثر اس کی مخالفت کی ۔ (ضمیمہ نمبر ۔ ۱) تائیوان کے مسئلے میں پاکستان نے چین کے برعکس امریکہ کے موقف کی حمایت کی (ضمیمہ نمبر ۔ ۲) روس نے ۱۹۴۹ء میں پاکستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور جناب لیاقت علی خان کو دورہ روس کی دعوت دی مگر پاکستان نے یہ دعوت قبول نہ کی (ضمیمہ نمبر ۔ ۳) مسلم ممالک کی قوت و حیثیت کا پاکستان کے وزیر اعظم جناب حسین شہید سہروردی نے یہ کہہ کر مذاق اڑایا کہ صفر جمع صفر جمع صفر برابر صفر (ضمیمہ نمبر ۴) پاکستان نے امریکہ کو اس امر کی اجازت دی کہ وہ اپنا یو ۔ ۲ ناحی طیارہ روس جا کر جاسوسی کرنے کی غرض سے پشاور کے اڈے سے اڑائے (ضمیمہ نمبر ۔ ۶) وغیرہ، وغیرہ ۔ یہ سب باتیں اگر

Marfat.com

کسی وزیر اعظم کی بے تدبیری کی وجہ سے یا حالات کی نزاکت کی بنا پر یا کسی دباؤ کی بنا پر وقوع پذیر ہوئیں تو انہیں دبائے رکھنا پاکستان کے مفاد میں بہتر تھا یا طشت از بام کر دینا؟

(۴) یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے ۱۹۶۵ء میں بھٹو صاحب نے ایوب خاں کو کشمیر میں رضاکار بھیج کر مقبوضہ کشمیر کو آزاد کرانے کا مشورہ دیا۔ ایوب خاں نے جب یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اس کے جواب میں ہندوستان پاکستان پر حملہ کر دے گا تو انہوں نے ایوب خاں کو یہ یقین دہانی کرائی کہ بھارت ہرگز ایسا نہیں کرے گا۔ خود ایوب خاں کی جانب سے اس واقعے کا انکشاف ان کے ایک نوٹ سے ہوتا ہے جو بہ روائت (ریٹائرڈ) میجر جنرل راؤ فرمان علی، ایوب خاں نے اس وقت کے سکرٹری خارجہ جناب عزیز احمد کے نام لکھا تھا کہ "آپ کے وزیر خارجہ (جناب ذوالفقار بھٹو) نے مجھے یقین دہانی کرائی ہے کہ ہندوستان پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا" (اردو ڈائجسٹ مارچ ۱۹۷۸ء) مگر اس یقین دہانی کے باوجود کیا ہوا؟ بھارت نے پاکستان پر بھرپور حملہ کر دیا۔ خدا کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو پاکستان اسی دن صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا۔ اگر پاکستان مٹ جاتا تو بھٹو صاحب کا اقتدار کب قائم رہتا؟

یہ اور اس نوع کی بے شمار مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ اپنے اقتدار سے بھی زیادہ انہیں پاکستان کو کمزور اور رسوا کرنے کی فکر رہتی تھی۔ مگر وہ پاکستان کو کیوں کمزور اور رسوا کرنے کے لئے سرگرداں رہتے تھے؟ اس کی وجوہات کی تشخیص ابھی باقی ہے۔ اور یہ ہم پر تاریخ کا قرض ہے۔ بھٹو صاحب کو قریب سے دیکھنے اور جاننے والوں کا کہنا ہے کہ ان کی ہندو ماں کو ان کے والد کے مسلم معاشرے نے قبول نہیں کیا تھا۔ اس کا غصہ اور اس کے انتقام کی آگ ان کے دل میں ہر وقت بھڑکتی رہتی تھی۔ سو انہوں نے اس ملک سے اس کا انتقام لیا۔ وجہ یہ ہو یا کچھ اور مگر یہ حقیقت ہے، خواہ اس کی بنا پر تکفیر بازی کا الزام آئے، کہ بھٹو کو پاکستان اور مسلمانوں سے نہ مٹنے والا عناد تھا۔ جناب مہدی علی صدیقی، ریٹائرڈ جج سیشن کورٹ کراچی و پرنسپل اسلامیہ لا کالج کراچی کی روایت کے بموجب "بھٹو کے حصولِ اقتدار کا مقصد غالباً پاکستان کا انہدام تھا۔" خود بھٹو صاحب کے بیان کے مطابق جو انہوں نے اطالوی صحافی اوریانا فلاچی کو دیا تھا وہ متحدہ ہند و پاک کے لیڈر بن جانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

۱۹۷۱ء کا مارشل لا اور بھٹو کا اپنے منشور سے انحراف

۲۰ دسمبر کو ذوالفقار علی بھٹو اقوام متحدہ سے واپس آئے۔ واپس آنے سے پہلے انہوں نے امریکی صدر نکسن سے بھی ملاقات کی۔ یہاں جس دن پہنچے اسی دن یحییٰ خاں نے مارشل لا کا اقتدار ان کے حوالے کر دیا۔ بھٹو نے ایک جمہوری سربراہ بننے کے بجائے مارشل لا ایڈ منسٹریٹر بننے کو ترجیح دی۔ انہیں اقتدار منتقل کرنے کے بجائے ہونا یہ چاہیئے تھا کہ اسمبلی کا اجلاس طلب کیا جاتا۔ اس میں یحییٰ خاں کا تیار کردہ دستوری مسودہ بحث و تمحیص کے بعد منظور کیا جاتا پھر یحییٰ خاں اقتدار اسمبلی کو منتقل کر دیتے اور اسمبلی پارلیمانی حکومت تشکیل کرتی۔ یہ کام اگر یحییٰ خاں نے نہ کیا تھا تو بھٹو، مارشل لا ایڈ منسٹریٹر کا چارج لینے کے بعد خود یہ کام کرتے۔ اسمبلی میں اکثریت ان کی ہی پارٹی کو حاصل تھی اس لئے دستور بنانے میں مطلقاً کسی قسم کی دشواری نہ ہوتی۔ وزیر اعظم بھی انہیں ہی بنایا جاتا مگر انہوں نے اس طریقہ کار کو اپنانے سے گریز کیا۔

کہا جاتا ہے کہ یحییٰ خاں کے ہاتھ سے بھٹو کے ہاتھ میں اقتدار کی منتقلی یحییٰ خاں کی آزادانہ مرضی سے عمل میں نہ آئی تھی بلکہ بری فوج کے سربراہ جنرل گل حسن اور فضائی فوج کے سربراہ ایر مارشل رحیم کی کوششوں سے عمل میں آئی تھی۔ اگر یہ بات درست ہے اور بلاشبہ یہی قرین امکان ہے، جب بھی بھٹو کے سامنے اس کام میں کوئی امر مانع نہ تھا کہ وہ اسمبلی کو اقتدار منتقل کر دیتے۔

اسمبلی کا اجلاس طلب کرنے کے خلاف بھٹو نے یہ عذر پیش کیا کہ مشرقی پاکستان کے ارکان کی شرکت کے بغیر اسمبلی نامکمل رہے گی لہٰذا جب تک وہاں کے ارکان شرکت پر قادر نہ ہوں اسمبلی کا اجلاس کس طرح طلب کیا جا سکتا ہے؟ ان کا یہ عذر، لنگ تھا۔ ملک کا کوئی حصہ اگر دشمن کے قبضے میں چلا جائے تو مرکزی اسمبلی کے اجلاس کو التوا میں نہیں ڈالا جاتا۔ اس کی بہت سی نظیریں موجود ہیں۔ چند سال قبل شام، متحدہ عرب جمہوریہ سے علیحدہ ہوا تھا مگر مصر نے اسمبلی کا اجلاس ملتوی نہیں کیا یا اسرائیل سے اپنے مقبوضہ علاقوں کی واپسی تک، اردن نے اپنی اسمبلی کا اجلاس

ؔ جنرل گل حسن نے پچھلے دنوں اپنے ایک مضمون میں اپنی ذات سے منسوب کردہ اس الزام کی تردید کی ہے۔

التوا میں نہ رکھا۔ اگر یہ کوئی معقول عذر تھا تو پھر کابینہ میں مشرقی پاکستان کے ارکان کو شامل نہیں کیا جانا چاہیئے تھا مگر انہوں نے اپنے اس کام میں اپنے مذکورہ عذر کو حائل نہ ہونے دیا۔ یہ ان کا ایک متضاد طرزِ عمل تھا۔ ۳۱۳ کی اسمبلی میں مغربی پاکستان کے ۱۴۶ ارکان موجود تھے اور مشرقی پاکستان سے بھی متعدد ارکان یہاں پہنچ چکے تھے۔ بھٹو نے دوسری زیادتی یہ کی کہ ضمنی انتخابات میں کامیاب ہوجانے والے ارکان کی رکنیت منسوخ کردی حالانکہ اس میں خود اُن کی پارٹی کے ارکان بھی تھے۔ یہ بھی ان کا ایک متضاد طرزِ عمل تھا۔

ان کے سربراہ بننے کے بعد بھی ملک کی سالمیت کو بحال کرنے کا ایک موقع باقی تھا۔ مجیب الرحمٰن مغربی پاکستان میں موجود تھے۔ وہی عوامی لیگ کے اصل لیڈر تھے۔ ان سے تصفیہ کیا جاسکتا تھا۔ اگر مجیب الرحمٰن سے تصفیہ ہوجاتا تو مشرقی پاکستان پر بھارت کے تسلّط کے لئے تمام قسم کا قانونی اور اخلاقی جواز ختم ہوجاتا اور اسے مشرقی پاکستان سے نکلنا پڑتا۔ مگر انہوں نے تصفیے سے گریز کیا۔ مولانا ظفر احمد انصاری نے اس امر کی ہر ممکن کوشش کی کہ کسی معتمد علیہ سیاسی شخصیت مثلاً جناب نورالامین کو جو اُن دنوں اسلام آباد میں ہی مقیم تھے، مجیب الرحمٰن سے ملاقات کا موقع بہم پہنچے تاکہ بھٹو سے ان کے تصفیے کی کوشش ہوسکے۔ مشرقی پاکستان کو واپس حاصل کرنے کی یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی۔ مگر بھٹو نے کسی کو ان سے ملنے نہ دیا۔ دوسری زیادتی انہوں نے یہ کی کہ ۸ جنوری ۱۹۷۲ء کو مجیب الرحمٰن کو رہا کرکے ڈھاکہ بھیج دیا۔ ایسے خطرناک وقت میں جب کہ کئی لاکھ غیر بنگالی مشرقی پاکستان میں بنگالیوں کے غیظ و غضب کے حصار میں گھرے ہوئے تھے، ان کی مغربی پاکستان کو منتقلی سے پہلے مجیب الرحمٰن کی رہائی، وہاں کے غیر بنگالیوں کے ساتھ نہایت ظالمانہ سنگدلی تھی۔

باخبر لوگوں کا کہنا ہے کہ مشرقی پاکستان کے سقوط سے خود مجیب الرحمٰن نہایت دل گرفتہ تھے کیونکہ اس کے سقوط سے پاکستان کا یہ حصہ بھارت کے تسلّط میں چلا گیا تھا۔ انہوں نے اس امر کی بہت خواہش کی کہ بھٹو سے ان کی مفاہمت ہوجائے۔ وہ بھٹو کو وزیراعظم بنانے اور خود ایک رسمی اور بے اختیار صدر بننے پر بھی آمادہ تھے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ مشرقی پاکستان بھارت کے زیرِ اثر جانے سے محفوظ رہے۔ مگر بھٹو مفاہمت پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے حالانکہ یہ ملک کی سالمیت کو بچانے کا آخری موقع تھا۔ اس واقعے کے راویوں میں ملک غلام جیلانی اور بہت سے دوسرے

Marfat.com

افراد کے علاوہ نواب اکبر بگٹی بھی ہیں جو پاکستان کے مفاد میں کبھی جھوٹی گواہی نہیں دے سکتے۔ نواب اکبر بگٹی کا تو کہنا ہے کہ ایک سال بعد لندن میں، جہاں مجیب الرحمٰن اپریشن کرانے کے لئے آئے ہوئے تھے، جب بھی وہ سقوط مشرقی پاکستان اور بھٹو کے معاندانہ رویے کا ذکر کرتے، ان کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا جاتیں۔

نیویارک ٹائمز اور گلوب اینڈ میل (کناڈا) نے اپنے اپنے مضامین میں اس امر کا انکشاف کیا کہ ۸ جنوری کو رہائی سے پہلے مجیب الرحمٰن نے اپنی الوداعی ملاقات میں بھٹو سے درخواست کی کہ "آپ کو دونوں بازوؤں کے مابین سیاسی اتحاد برقرار رکھنے کے لئے غور کرنا چاہیے"۔ [له]

رہائی کے بعد لندن پہنچنے کے بعد مجیب الرحمٰن نے اخباری نمائندوں کے سامنے پاکستان کے خلاف ایک نہایت تند و تلخ بیان دیا جس میں انہوں نے کہا کہ "وہ (مجیب الرحمٰن) گذشتہ ۲۴ سال سے مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کے لئے کوشاں تھے"۔ ان کے اس بیان پر یہاں (مغربی پاکستان میں) ان کے خلاف سخت تنفر پیدا ہوا اور جو لوگ مجیب الرحمٰن بتقابلہ بھٹو کے قضیئے میں اول الذکر کو کم درجے کا مجرم سمجھتے تھے وہ بھی انہیں سب سے بڑا مجرم سمجھنے لگے جبکہ بھٹو کی سیاسی بصیرت اور معاملہ فہمی کی تعریف کی جانے لگی۔ مگر بہت کم لوگوں نے اس بیان کے محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ بھارت کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے اور بھارت سے مشرقی پاکستان کا اقتدار حاصل کرنے کے لئے اس قسم کا بیان دینا مجیب الرحمٰن کے لئے عین ضروری تھا۔ یہ بیان کوئی غیر متوقع بات نہ تھی۔ مغربی پاکستان میں بعض صاحب بصیرت اور دور اندیش سیاستدانوں مثلاً مولانا ظفر احمد انصاری نے مجیب الرحمٰن کی طرف سے اس قسم کے بیان کی پہلے سے پیشین گوئی کر دی تھی۔ مگر آج بھی بعض لوگ جب بھٹو، مجیب قضیئے پر بحث کرتے ہیں تو مجیب الرحمٰن کو پاکستان دشمن ثابت کرنے کے لئے اس کے مذکورہ بیان کو سب سے بڑا ثبوت سمجھتے ہیں۔

بہرکیف! پاکستان کے خلاف مجیب الرحمٰن کے اس بیان سے بھٹو کو زبردست سیاسی فائدہ پہنچا۔ جو لوگ مشرقی پاکستان کے سقوط میں اب تک بھٹو کو قصور وار سمجھ رہے تھے، ان کی معتدبہ

له ہفت روزہ زندگی فروری ۲۸ (۹) ۱۹۷۲ء

Marfat.com

تعداد اس معرکے میں ان کے موقف کی حقانیت پر ایمان لے آئی۔ اس کے بعد سے مغربی پاکستان میں ان کی سیاسی پوزیشن بڑی مستحکم ہو گئی۔

ڈھاکہ پہنچنے کے بعد مجیب الرحمٰن کو حکومت سونپ دی گئی۔ اور اب وقت آگیا تھا کہ وہاں محصور غیر بنگالیوں اور بھارت کی جیلوں میں مقید شہری اور فوجی قیدیوں کی منتقلی پر مجیب الرحمٰن سے بات چیت شروع کی جائے۔ مگر بھٹو نے (فروری کے مہینے میں) مطالبہ کیا کہ جب تک مشرقی پاکستان سے بھارتی فوجیں نہ ہٹائی جائیں شیخ مجیب الرحمٰن سے بات چیت نتیجہ خیز نہ ہوگی۔ ان کے اس مطالبے کو مغربی پاکستان میں بہت سراہا گیا کیونکہ اس سے مترشح ہوتا تھا کہ بھٹو صاحب کو اہل مشرقی پاکستان کی سیاسی آزادی بہت عزیز ہے۔ بھارت نے اس مطالبے کے بعد بلا تامل اپنی فوجیں مشرقی پاکستان سے واپس بلالیں۔ بھارتی فوجوں کے وہاں سے ہٹتے ہی وہاں بنگالیوں کے ہاتھوں غیر بنگالیوں کا قتل عام شروع ہو گیا اور بڑی بھاری تعداد میں بے گناہ مارے گئے۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ بھارتی فوجوں کی موجودگی غیر بنگالیوں کی جانوں کے تحفظ کے لئے کتنی ضروری تھی۔

بہرکیف! اس امر کے باوجود کہ عوام میں بھی بھٹو صاحب کی پوزیشن مستحکم ہو گئی تھی اور اسمبلی میں بھی ان کی پارٹی کو غیر معمولی اکثریت تھی، انہوں نے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنے رہنا ہی پسند کیا۔ دستور بنانے اور اقتدار اسمبلی کو منتقل کرنے کی پالیسی سے انہوں نے گریز کیا۔

قومی اسمبلی میں مغربی پاکستان کے ۱۴۶ ارکان تھے جن میں سے ۱۰۴ پیپلز پارٹی کے تھے۔ بقیہ ۴۲ نشستوں میں سے سات، سات نشستیں مسلم لیگ (دونوں گروپ) جمعیت علمائے اسلام، جمعیت علمائے پاکستان اور نیشنل عوامی پارٹی کو حاصل تھیں۔ جماعت اسلامی کے پاس صرف چار نشستیں تھیں۔ دس ارکان آزاد تھے۔ یہ تعداد پیپلز پارٹی کے مقابلے میں بہت چھوٹی تھی۔ مگر اتنی چھوٹی سی حزب اختلاف بھی بھٹو کو گوارا نہ تھی۔ اسے بھی انہوں نے، خان عبدالولی خاں کے الفاظ میں "گاجر یا ڈنڈے" یا خان عبدالقیوم خاں کی اصطلاع میں "سونے یا بندوق" کے زور پر ختم کرنے کی کوشش کی، اور آہستہ آہستہ انہوں نے حزب اختلاف کو کمزور کر دیا۔ کونسل مسلم لیگ کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے اس جماعت کے سربراہ ممتاز دولتانہ کو جنوری ۱۹۷۲ء میں سفیر بنا کر انگلستان بھیج دیا۔ قیوم مسلم لیگ کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے آگے چل کر خان عبدالقیوم خاں کو اپنی کابینہ میں وزیر داخلہ بنا دیا۔ حزب اختلاف میں اس

جماعت کے صرف تین ارکان رہ گئے۔ جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت علمائے اسلام کے ۴۔ ۳ ارکان کو توڑ لیا۔ جماعت اسلامی کو خرید نہ سکے تو اس کے چار میں سے ایک رکن ڈاکٹر نذیر احمد شہید کو راستے سے ہٹا دیا۔ صرف نیشنل عوامی پارٹی کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے اور اس جماعت کے ارکان کی تعداد سات کی سات رہی۔

۱۹۷۲ء کا عبوری دستور۔ جمہوریت سے انحراف

بھٹو کے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنے رہنے کو حزب اختلاف کی جماعتوں نے چیلنج کیا کیونکہ اس سے پیپلز پارٹی کا خواہ کچھ نہ بگڑ رہا ہو، جمعیت علمائے اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی بہت خسارے میں تھیں۔ ان جماعتوں کو صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اکثریت حاصل تھی۔ مگر بحیثیت مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھٹو نے ان دونوں صوبوں میں بھی اپنی حکومتیں قائم کر دیں۔ یہ مارشل لا کے اختیار کا نہایت بے جا استعمال تھا۔ لہٰذا حزب اختلاف کی ان دونوں جماعتوں نے بھٹو سے مطالبہ کیا کہ وہ اسمبلی کا اجلاس منعقد کریں اور وفاقی پارلیمانی جمہوریت پر مبنی دستور بنوائیں۔ بھٹو نے قومی اسمبلی کا اجلاس منعقد کرنے کے خلاف یہ عذر پیش کیا کہ مشرقی پاکستان کے (اصلی) ارکان اسمبلی اس میں شرکت پر قادر نہیں لہٰذا ان کے بغیر اسمبلی کا اجلاس منعقد کرنا، بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے مترادف ہوگا۔ مگر ظاہر ہے کہ ان کا یہ عذرِ لنگ تھا لہٰذا نیپ اور جمعیت اس استدلال کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوئی اور اپنے مطالبے پر مضبوطی کے ساتھ جمی رہی۔ اس مطالبے کے نتیجے میں انہیں جمعیت کے رہنما مفتی محمود اور نیپ کے رہنما خان عبدالولی خاں سے مذاکرات کرنے پڑے اور ۶ مارچ ۱۹۷۲ء کو ان تینوں کے مابین ایک سہ فریقی

Marfat.com

معاہدہ عمل میں آیا۔ معاہدے کے بموجب بھٹو نے شرط منظور کی کہ وہ ۱۴ اپریل ۱۹۷۲ء تک اسمبلی کا اجلاس طلب کریں گے اور اس میں ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے مطابق وفاقی پارلیمانی اصولوں پر مبنی ایک عبوری دستور بنوائیں گے۔ اس کے بدلے انہوں نے مفتی محمود اور ولی خاں سے یہ شرط منوائی کہ جو دستور بنے گا وہ ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء کے بعد نافذ ہوگا۔ اس وقت تک مارشل لا برقرار رہے گا۔

بھٹو نے عبوری آئین کا مسودہ اپنے وزیر قانون محمود علی قصوری سے تیار کروایا۔ پھر ۱۴ اپریل کو اسمبلی کا اجلاس طلب کیا۔ اس میں انہوں نے ارکان اسمبلی سے ایک عجیب و غریب بات کی فرمائش کی۔ فرمائش یہ تھی کہ اسمبلی انہیں مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنے رہنے کی منظوری دے۔ جتنی افسوسناک یہ فرمائش تھی اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ تھی کہ اسمبلی نے ان کی یہ فرمائش پوری کر دی۔ اسمبلی نے مارشل لا برقرار رکھنے اور انہیں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے منصب پر فائز رہنے کی منظوری دے دی۔ ایسا اس وجہ سے ممکن ہوسکا کہ اسمبلی میں پیپلز پارٹی کے ارکان کو اکثریت مطلقہ حاصل تھی۔ ۱۴۶ ارکان میں سے ۱۰۴ اس کے ساتھ تھے اور وہ سب کے سب بھٹو صاحب کے استبداد کے چنگل میں جکڑے ہوئے تھے۔ انہیں اس امر کا بھی اندیشہ تھا کہ اگر انہوں نے منظوری نہ دی تو اسمبلی توڑ دی جائے گی۔ وہ اگر ہمت سے کام لیتے اور اسمبلی کی منسوخی اور اپنی رکنیت سے محرومی کا خطرہ مول لے لیتے تو خواہ اسمبلی توڑ دی جاتی، وہ جمہوری قدروں کو پامال ہونے سے بچا لیتے مگر وہ اتنی ہمت نہ دکھا سکے۔

اس سلسلے میں اس سوال کا جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر بھٹو کو آئین اور اسمبلی کے ساتھ یہ کچھ کرنا تھا تو پھر انہوں نے مفتی محمود اور ولی خاں کے ساتھ معاہدہ کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے ساتھ سہ فریقی معاہدہ انہوں نے اس غرض سے کیا تھا کہ اس معاہدے کے عمل میں آنے کے بعد وہ ان دونوں فریقوں کو اطمینان کی نیند سلادیں اور انہیں اپنا کام کرنے کے لئے پُرسکون مہلت مل جائے۔ چنانچہ اس معاہدے نے انہیں یہ پُرسکون مہلت فراہم کر دی۔

بھٹو نے جو عبوری آئین تیار کرایا اس میں وہ سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں روک لئے جو مارشل لا کے تحت انہیں حاصل ہوئے تھے (تفصیلی تذکرہ آگے آئے گا) انہیں قوی امید تھی کہ جس طرح انہوں نے مارشل لا کو برقرار رکھنے کے لئے اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیا ہے اس طرح سے عبوری آئین

Marfat.com

کو بھی منظور کرالیں گے کیونکہ اسمبلی کو توڑ دینے کا اختیار ان کے ہاتھ میں تھا لہٰذا انہوں نے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے صرف دو تین دن بعد یکایک اعلان کیا کہ وہ مارشل لا کو ۱۴ اگست تک طول دینے کے بجائے ۲۱ اپریل کو ہی اٹھالیں گے۔ ان کا یہ اعلان چنداں غیر متوقع نہ تھا۔ عبوری آئین کے مسودے پر نظر ڈالنے کے بعد بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ مارشل لا اب بلا تاخیر اٹھالیا جائے گا کیونکہ یہ آئین مارشل لا سے چنداں مختلف نہ تھا۔ جسارت کے ۱۸ اپریل ۷۲ء کے شمارے میں راقم الحروف نے لکھا تھا کہ :

"اگر عبوری آئین منظور کر لیا گیا تو مارشل لا اٹھانے کے لئے ۱۴ اگست ۷۲ء کی تاریخ کا تعین ایک بے معنی سی بات ہو جائے گی کیونکہ مارشل لا اٹھانے کا مفہوم صرف یہ ہوگا کہ آئندہ سے مارشل لا کے اختیارات فوج کے پاس نہ ہوں گے بلکہ بھٹو صاحب کے دست خاص میں ہوں گے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ بھٹو صاحب سادہ لوح برادران وطن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دستور منظور ہونے کے چند دن بعد ہی مارشل لا اٹھانے کا اعلان کر دیں"۔

عبوری آئین کا مسودہ اسمبلی میں پیش کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی بھٹو صاحب نے یہ دھمکی بھی دی (حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی) کہ اگر اسمبلی نے اسے منظور نہ کیا تو وہ توڑ دی جائے گی۔ اسمبلی نے ۲۰ اپریل کو مسودے کی منظوری دے دی۔ حزب اختلاف نے بھی بحالتِ مجبوری اس کی تائید کی کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ بصورت دیگر مارشل لا نافذ رہے گا۔ ۲۱ اپریل سے اسے نافذ کر دیا گیا۔ بھٹو نے جنہیں مارشل لا کو ۱۴ اگست ۷۲ء تک برقرار رکھنے پر اصرار تھا، وقت سے پہلے ہی اسے اٹھا لینے کا اعلان دو وجوہات کی بنا پر کیا۔

ایک وجہ یہ تھی کہ ولی خاں اور مفتی محمود کے ساتھ کیا ہوا سہ فریقی معاہدہ وہ توڑ دینا چاہتے تھے۔ وہ معاہدہ اگر برقرار رہتا تو انہیں عبوری آئین کو وفاقی اور پارلیمانی اصولوں پر بنانا پڑتا۔ مگر بھٹو صاحب صدارتی طرز کا آئین بنانا چاہتے تھے تاکہ جملہ اختیارات ان کے ہاتھ میں رہیں (ایسے دستور کے لئے صدارتی کی اصطلاح استعمال کرنا اس طرزِ حکومت کی بڑی تذلیل ہے کیونکہ صدارتی طرزِ حکومت میں صدر اتنے سارے اختیارات کا مالک نہیں ہوتا) لہٰذا ۱۴ اگست سے چار مہینے پہلے یعنی ۲۱ اپریل سے مارشل لا ختم کر کے معاہدے کی وہ شق انہوں نے از خود ساقط کر دی جس کی طرف داری کی شرط انہوں

Marfat.com

نے مفتی محمود اور ولی خاں سے منظور کرائی تھی۔ اس لئے وہ اب اپنے خیال کے مطابق ولی خاں اور مفتی محمود کی یہ شرط تسلیم کرنے کے پابند نہیں رہے تھے کہ دستور وفاقی پارلیمانی طرز کا ہوگا۔ چنانچہ دستور انہوں نے صدارتی طرز کا بنوایا اور سہ فریقی معاہدے کو یکطرفہ طور پر توڑ دیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مارشل لا کے تحت ان کے حاصل کردہ اختیارات کو عبوری آئین نے ایک خوشنما قالب عطا کر دیا تھا یعنی عوام الناس کی نگاہ میں مارشل لا کو ختم کر کے اب ملک میں جمہوریت بحال ہو گئی تھی۔

ہم ذیل میں عبوری آئین کے ایسے پہلوؤں کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں جس سے اس کے خدوخال سمجھ میں آسکیں اور اندازہ ہو سکے کہ اقتدار پر فائز ہونے کے بعد بھٹو کس قسم کے مطلق العنان اختیارات کے خواہاں تھے۔ عبوری آئین اگرچہ صرف سولہ ماہ نافذ العمل رہا اور اس کے بعد ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء سے اس کی جگہ پر مستقل آئین نافذ کر دیا گیا اس بنا پر عبوری آئین کی عملی قدروقیمت اب ختم ہو چکی ہے مگر اس پر روشنی ڈالنا اس وجہ سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بھٹو اسی کو مستقل آئین کی حیثیت دینا چاہتے تھے۔

جب یہ دستور بنا اس وقت انہوں نے چار قسم کی ٹوپیاں زیب سر کر رکھی تھیں۔ ایک ٹوپی پیپلز پارٹی کے چیرمین کی تھی، دوسری صدر مملکت کی، تیسری صدر اسمبلی کی اور چوتھی مسلح افواج کے سپریم کمانڈر کی۔ پاکستان میں اب سے پہلے کسی نے اتنے سارے اختیارات اپنی ذات میں مرکوز نہیں کئے تھے اور نہ دنیا کے کسی اور ملک ہی میں ایسی کوئی مثال شاید موجود ہو۔ جو آئین انہوں نے بنایا اس میں پہلی زیادتی تو یہ کی گئی کہ دستور کے بارے میں خود اپنے منشور میں کئے ہوئے وعدوں سے انحراف کیا۔ منشور میں وعدہ کیا گیا تھا کہ ملک کا دستور وفاقی پارلیمانی ہوگا خان عبدالولی خاں اور مفتی محمود کے ساتھ کئے ہوئے سہ فریقی معاہدے میں بھی انہوں نے اس امر کا وعدہ کیا تھا مگر جو دستور انہوں نے بنوایا وہ صدارتی طرز کا تھا اور صدر کے ہاتھ میں اس سے زیادہ اختیارات مرکوز کر دیئے گئے جتنے صدارتی حکومت میں کئے جاتے ہیں۔ یعنی صدر چاہے تو اسمبلی توڑ دے، صدر چاہے تو اسمبلی برخواست کر دے، صدر چاہے تو اسمبلی قانون میں ترمیم کر دے، صدر چاہے تو اسمبلی کے بنائے ہوئے قانون کو منسوخ کر دے، صدر چاہے تو بنیادی حقوق معطل کر دے، صدر چاہے تو کسی کو جیل میں ڈال دے، صدر چاہے تو عدالت کے اختیارات سلب کر لے۔ غرضیکہ وہ چاہے تو اس طرح کے اختیارات استعمال کر سکے جیسے عہد ملوکیت اور تاجداری میں شاہان کج کلاہ استعمال کیا کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ

جدید اصطلاح میں ملک کو ایک پولیس اسٹیٹ بنا دیا گیا۔

اس پولیس اسٹیٹ میں :

(۱) قومی اسمبلی کو کسی قسم کا حاکمانہ اختیار حاصل نہ تھا۔ اسمبلی پر یہ پابندی عائد کر دی گئی تھی کہ وہ ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء تک مستقل آئین بنا لے ورنہ عارضی دستور ہی مستقل دستور کی حیثیت حاصل کر لے گا (دفعہ ۹۳-۲) بادی النظر میں تو یہ بات بڑی خوشنما تھی اور اس سے آئین سازی کے معاملے میں ذوالفقار علی بھٹو کی بہی خواہی اور اخلاص ٹپکتا تھا۔ مگر فی الواقع مقصد یہ نہ تھا۔ مستقل آئین بنوانا ان کے لئے کیا مشکل تھا؟ ان کی پارٹی اکثریتی پارٹی تھی۔ وہ چاہتے تو مہینہ بھر میں دستور بن سکتا تھا۔ آخر عبوری آئین بنانے میں کتنی دیر لگی ہے؟ ایک دن میں اسمبلی سے منظوری حاصل کر لی گئی۔ اسی طرح مستقل آئین بھی بن سکتا تھا۔ مگر وہ فی الواقع چاہتے یہ تھے کہ اس معینہ مدت کے اندر دستور نہ بن سکے اور عبوری آئین ہی مستقل دستور کی حیثیت اختیار کر لے (بعد میں انہوں نے اپنے اس مقصد کو ایک اور طریقے پر حاصل کر لیا جس کا تذکرہ آگے آئے گا) یا بنے تو اس نمونے پر ہو جس پر عبوری آئین ہے۔ ایک سال کی مدت متعین کرنے کا مقصد یہ تھا کہ عوام ان کو دستور سازی کے معاملے میں مخلص سمجھیں۔ تاہم بطور احتیاط انہوں نے یہ اختیار بھی اپنے ہاتھ میں رکھا تھا کہ اگر اسمبلی ان کی مرضی کے خلاف دستور بنانے کی کوشش کرے تو وہ اسے توڑ دیں (دفعہ ۶۵-۳ اور ۹۲-۱) ان حالات میں اسمبلی کے لئے یہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ مستقل آئین میں وہ اسمبلی توڑنے کا اختیار صدر سے چھین لیتی یا اسمبلی کے بل کو نامنظور کرنے کا اختیار واپس لے لیتی یا ہنگامی حالت کو غیر معینہ مدت تک باقی رکھنے اور بنیادی حقوق کو غیر معینہ مدت تک معطل رکھنے کا اختیار واپس لے لیتی یا کسی اور طریقے سے ان کے اختیار میں کمی کرتی۔

(۲) دوسری زیادتی یہ کی گئی تھی کہ اسمبلی کو بذریعہ دفعہ (۹۴-۲) اس امر سے روک دیا گیا تھا کہ وہ دستور سازی کے دوران یعنی ۱۴ اپریل ۱۹۷۲ء سے لے کر ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء تک دستور سازی کے علاوہ کسی اور مسئلہ پر غور کر سکے۔ ان دنوں جو مسائل اسمبلی میں زیر غور لائے جانے کے محتاج تھے ان میں جنگی قیدیوں کی واپسی کا مسئلہ، مشرقی پاکستان میں محصور یا بھارتی جیلوں میں مقید غیر بنگالی شہریوں کی منتقلی کا مسئلہ، بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ تھے۔ بھٹو چاہتے تھے کہ ان معاملات کے فیصلے وہ اپنی پسند سے کریں اور اسمبلی چوں نہ کرے۔

Marfat.com

(۳) اسمبلی کو اختیار دیا گیا تھا کہ ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء کے بعد وہ قومی معاملات کو زیر غور لا سکتی ہے مگر یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس تاریخ کے بعد صدر مملکت جب چاہیں اسمبلی کو توڑ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس اسمبلی کی گردن پر برطرفی کا خنجر لٹک رہا ہو وہ اگر قومی مسائل کو زیر بحث لانے کا اختیار حاصل بھی کر لیتی تو وہ صدر مملکت کے اقدامات کے خلاف کوئی قرارداد کس طرح منظور کر سکتی تھی؟ یعنی جو اختیار اسمبلی کو ایک ہاتھ سے دیا گیا تھا وہ دوسرے ہاتھ سے چھین لیا گیا تھا۔ دنیا کی ہر دستوری مملکت میں اسمبلی اتنی مقتدر سمجھی جاتی ہے کہ اسے اس کی میعاد پوری ہونے سے پہلے کوئی توڑ نہیں سکتا۔ پارلیمانی طرزِ حکومت کو تو چھوڑیئے جہاں نورج، انتظامیہ اور صدر مملکت تینوں اسمبلی کی مرضی کے تابع ہوتے ہیں، صدارتی طرزِ حکومت میں مثلاً امریکہ میں جہاں صدر مملکت کو وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں اسے اسمبلی کو توڑنے کا اختیار نہیں ہوتا۔ وہ اسمبلی کے پاس کئے ہوئے قانون کو نامنظور نہیں کر سکتا۔ اسے اسمبلی کے بنائے ہوئے قانون میں کسی ترمیم کا اختیار نہیں ہوتا یا کسی اور طریقے پر کوئی اس کی بالادستی کو متاثر نہیں کر سکتا۔ خود پاکستان کے ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۶ء کے دستوری مسودوں میں اسمبلی کو کلیتہً خود مختار بنا دیا گیا تھا۔

(۴) دفعہ ۵۲، ۵۳، اور ۵۴ کے تحت صدر مملکت کو اس سے بھی زیادہ اختیارات کا حامل بنا دیا گیا تھا جتنے اختیارات گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء میں صدر مملکت (گورنر جنرل) کو دیئے گئے تھے۔ مذکورہ ایکٹ میں مرکزی اقتدار کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا صرف ایک حصہ گورنر جنرل کے سپرد کیا گیا تھا جس میں دفاع، خارجہ پالیسی اور مالیات کے محکمے اور چند دیگر امور تھے جبکہ دوسرا حصہ مرکزی اسمبلی کو تفویض کیا گیا تھا۔ عبوری آئین اپنے اس وعدے کے باوجود کہ یہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی بنیاد پر بنایا گیا تھا، تقسیم اختیارات کے معاملے میں اس بنیادی صفت سے محروم تھا اور جملہ اختیارات حکمرانی صدر مملکت کی ذات میں مرتکز کر دیئے گئے تھے۔

(۵) ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء سے لے کر ۲۰ اپریل ۱۹۷۱ء تک کے عرصہ میں مارشل لا کے تحت وضع شدہ بہت سے قوانین، ضابطوں اور احکامات کو اور مارشل لا کے تحت کئے ہوئے بہت سے فیصلوں کو دستور کی دفعہ ۲۷۴ اور ۲۷۵ کے ذریعہ مکمل قانونی تحفظ دے دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یحییٰ خاں نے ایک دستوری حکومت کو جو ۱۹۶۲ء کے دستور کے تحت چل رہی تھی، ختم کر کے

Marfat.com

اقتدار پر جو غاصبانہ قبضہ کیا اس قبضے کو جائز قرار دے دیا گیا حالانکہ عدالت عظمیٰ نے اسما جیلانی کے مقدمہ کے فیصلے میں جو ۲۰ اپریل ۱۹۷۲ء کو سنایا گیا تھا، یحییٰ خاں کے مارشل لا کو کھلے لفظوں میں غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ انہیں اقتدار کا غاصب قرار دیا تھا اور ان کے بنائے ہوئے تمام قوانین کو ماسوائے ان قوانین کے جو نظریہ ضرورت کے تحت قابل استعمال تھے غیر قانونی قرار دیا تھا مگر عبوری آئین کی دفعہ ۲۷۴ اور ۲۷۵ کے ذریعے ایسے بہت سے ناروا اور غیر منصفانہ اقدامات کو بھی دستوری تحفظ عطا کر دیا گیا جو مارشل لا کے تحت کئے گئے تھے۔ تحفظ پانے والے ضابطوں میں مارشل لا کا بدنام زمانہ اور استبدادی ضابطہ نمبر ۱۱۴ بھی تھا جس کے بموجب تقریباً تیرہ سو افراد کو ان کا جرم بتائے بغیر لیکایک ملازمتوں سے برطرف کر دیا گیا تھا اور ضابطہ نمبر ۵۸ بھی تھا جس میں کہا گیا تھا کہ "اگر کسی شخص کے بارے میں انہیں یہ اشتباہ ہو کہ وہ کسی تخریبی کارروائی میں شریک ہے یا اشتباہ ہو کہ وہ کسی تخریبی کرنے والوں سے محض تعلق رکھتا ہے تو اس کو ملازمت سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔"

(۶) دستور کی دفعات ۱۳۷ تا ۱۴۱ کے تحت ہنگامی حالت کا اعلان کرنے اور اس کے بموجب بنیادی حقوق کو معطل کرنے کا جملہ اختیار صدر مملکت نے اپنے دست خاص میں لے لیا۔ بلاشبہ دنیا کے ہر ملک کے صدر کو اختیار حاصل ہے کہ وہ ضرورت محسوس کرے تو ہنگامی حالت کا اعلان کر دے مگر ہنگامی حالت کو غیر معینہ مدت تک برقرار رکھنے کا اسے اختیار نہیں ہوتا۔ وہ از روئے دستور اس امر کا پابند ہوتا ہے کہ ایک معینہ مدت کے اندر اسمبلی کا اجلاس بلا کر اپنے اس اقدام کی منظوری حاصل کرے۔ اسمبلی کو اس بات کا پورا اختیار ہوتا ہے کہ وہ ضروری سمجھے تو ہنگامی حالت کے فیصلے کو منسوخ کر دے۔ خود پاکستان کے سابقہ دستوری مسودوں میں اور ۱۹۵۶ء کے منظور شدہ دستور میں اسمبلی کو اس امر کا اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ہنگامی حالت کو باقی رکھنے یا ختم کرنے کا فیصلہ کرے۔ ۱۹۶۲ء کے آئین میں جو آمرانہ دور کی تخلیق تھا اسمبلی کو اتنا اختیار ضرور دیا گیا تھا کہ وہ اگر چاہے تو ہنگامی حالت کے فیصلے پر غور کرے۔ ملاحظہ ہو ان دساتیر کی علی الترتیب دفعات (۱۴۱) (۲۵۳) (۱۹۹) اور (۳۰-۲)

(۷) دستور کی دفعہ (۹) شق (۳) کے تحت کسی بھی شہری کو گرفتار کرنے کا اختیار حاصل کر لیا گیا اور عدالت سے رجوع کرنے کا اختیار اس سے چھین لیا گیا۔ اس کے بجائے دفعہ (۹-۴) اور (۹-۷) کے تحت اس پر حکومت کے مقرر کردہ لورڈ کے روبرو حاضر ہو کر اپنی برأت ثابت کرنے کی ذمہ داری عائد کی گئی

(۸) وزرا کی وزارتوں کو بذریعہ دفعہ (۱۴۱-۱) اسمبلی کے بجائے صدر مملکت کی خوشنودی پر موقوف کر دیا گیا وہ کچھ بھی کرتے، اسمبلی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکتی تھی۔

(۹) صوبوں میں بھی سارے اختیارات گورنروں کو تفویض کئے گئے حالانکہ ہر صوبے میں اسمبلیاں موجود تھیں۔ دستور کی یہ سب دفعات صدر مملکت کی مطلق العنانی کا کیا کم ثبوت تھیں مگر ۲۱ اپریل ۱۹۷۲ء کو جب اس کا نفاذ عمل میں آیا تو اندازہ ہوا کہ بھٹو نے جو تھوڑے بہت اختیارات اسمبلیوں کے لئے چھوڑے ہیں انہیں بھی وہ خود ہی استعمال کرنا چاہتے ہیں مثلاً سندھ اور پنجاب کی اسمبلیوں کو اس امر کا اختیار استعمال کرنے کا موقع نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی آزادانہ مرضی سے پارٹی لیڈروں (وزرائے اعلیٰ) کا انتخاب کر سکیں بلکہ پارٹی لیڈروں کی نامزدگی عمل میں آئی اور یہ نامزدگی بھٹو نے اپنے دستِ خاص سے کی۔ اس سے بھی بڑا ستم یہ ڈھایا گیا کہ پارٹی لیڈر کی نامزدگی صوبائی اسمبلیوں کے ارکان میں سے نہیں کی گئی بلکہ قومی اسمبلی سے مستعار لے کر کی گئی۔ پنجاب کے لئے غلام مصطفےٰ کھر اور سندھ کے لئے ممتاز بھٹو کو پارٹی لیڈر بنا کر وزارتیں سونپی گئیں۔

دستور میں موجودہ تحفظات اور اختیارات حاصل کرنے کے بعد وہ ملک کی سب سے زیادہ بااختیار شخصیت بن گئے اور اس کے بعد انہوں نے کلی طور پر مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے اپنے اختیارات استعمال کئے۔ جب چاہا صوبائی وزارت توڑ دی۔ جسے چاہا حکومت سونپ دی۔ جس صنعت کو چاہا نیشنلائز کر لیا۔ سکے کی قیمت گرا دی۔ اعلیٰ حکام میں سے جنہیں چاہا برطرف کر دیا۔ سیاسی لیڈروں میں سے جسے چاہا پکڑ کے بند کر دیا۔ اسمبلی خاموش تماشائی بنی رہی کیونکہ اسے اختیار نہ تھا کہ وہ ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء سے پہلے ان معاملات پر بحث کر سکے۔ یہاں تک کہ غیر ملکی معاہدے بھی اپنی مرضی سے کر ڈالے۔ شملہ کا معاہدہ کیا اور اس میں پاکستان کے مفادات کو نقصان پہنچایا۔

ان سب باتوں کے علاوہ انہوں نے دستوری اعتبار سے طے شدہ امور کو متنازعہ بنانے کی کوشش کی مثلاً سرکاری زبان کا مسئلہ ۱۹۵۶ء کے دستور میں طے کیا جا چکا تھا کہ اردو اور بنگلہ ملک کی سرکاری زبانیں ہوں گے۔ مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد اب اردو ملک کی واحد سرکاری زبان ہو گئی تھی مگر انہوں نے ملک کو پھر سے دو لسانی بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ جنوری ۱۹۷۲ء میں تعلیمی پالیسی پر ایک تقریر میں نہایت معصومیت کے ساتھ انہوں نے کہہ دیا "زبان اور اس قسم

Marfat.com

کے بحث طلب امور کا فیصلہ اسمبلی کرے گی"۔ یہ جملہ کہنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے تیسرے روز سے لاڑکانہ، دادو، سکھر اور دوسرے شہروں میں اردو اخبارات جلائے جانے لگے اور سندھی کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ شروع ہو گیا۔ عبوری آئین میں ایک زیادتی تو یہ کی گئی کہ مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہو جانے کے باوجود اور عبوری آئین میں اسے پاکستان کی حدود سلطنت سے خارج کر دینے کے باوجود ملک کی دو لسانی حیثیت برقرار رکھی گئی۔ دفعہ (۲۶۲) میں لکھا گیا کہ ملک کی سرکاری زبانیں اردو اور بنگلہ دونوں ہوں گی۔ دوسری زیادتی یہ کی گئی کہ مذکورہ دفعہ میں یہ بھی لکھا گیا کہ ان کے علاوہ دیگر زبانوں کو بھی سرکاری زبان کی حیثیت سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ زبان کے بارے میں اس فتنہ انگیزی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے صرف ایک ماہ بعد مئی ۱۹۷۲ء میں سندھ کے وزیر اعلیٰ نے صوبائی اسمبلی میں ایک بل پیش کیا کہ سندھی صوبے کی واحد سرکاری زبان ہوگی اور حکومت کی متعین کردہ مدت میں جو لوگ اس زبان کو نہیں سیکھ لیں گے وہ سرکاری ملازم نہیں رہیں گے۔ صوبے کے اردو بولنے والے باشندے اس بل سے سخت متوحش ہوئے اور ان میں سخت سراسیمگی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ صوبے کے ایسے اکابر جنہیں عملی سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا یا جو اب عملی سیاست سے ریٹائر ہو چکے تھے، انہیں اس مسئلے کو حل کرانے کے لئے ناچار گوشۂ عزلت سے باہر نکلنا پڑا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، پروفیسر اے۔بی۔اے۔ حلیم مرحوم، جناب حسین امام اور جناب (میجر) آفتاب حسن آگے بڑھے۔ ان سب نے دستور کی مذکورہ شق کے حوالے سے بھٹو صاحب سے فریاد کی کہ اگر سندھی کو سرکاری زبان بنانے پر اصرار ہے تو اس کے ساتھ ہی اردو کو بھی سرکاری زبان بنایا جائے کیونکہ دستور کی محولہ بالا دفعہ کے بموجب کوئی اور زبان سرکاری زبان کی حیثیت اسی وقت اختیار کر سکتی ہے جب تسلیم شدہ سرکاری زبانوں یعنی اردو (اور بنگلہ) کو بھی ساتھ ساتھ سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہو۔ آئینی ماہرین کی بھی یہی رائے تھی کہ دستور کی مذکورہ دفعہ کے بموجب مسلمہ سرکاری زبانوں کو نظر انداز کر کے کسی اور زبان کو سرکاری درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ کسی اور زبان کو سرکاری درجہ اگر دیا جاتا ہے تو مسلمہ سرکاری زبانیں بھی لازماً متبادل سرکاری زبانیں ہوں گی۔ مگر ان سب دلائل کے باوجود بھٹو صاحب نے بے رخی برتی۔ ناچار صوبے کے اردو داں عوام نے اظہار جذبات کے لئے ۷ اور ۸ جولائی ۱۹۷۲ء کو پُر امن ہڑتال کی۔ اس کے باوجود حکومت نے نہ صرف بل پاس کر دیا بلکہ پُر امن ہڑتالیوں پر گولی چلوا دی جس میں متعدد

Marfat.com

افراد ناحق مارے گئے۔ پھر پورے صوبے میں لسانی فسادات شروع ہو گئے۔ یہ بات خود اپنے گھر میں آگ لگوانے اور اسے جلتا دیکھنے کے مترادف تھی۔ جب حالات قابو سے باہر ہو گئے تو انہوں نے اردو داں طبقے کے قائدین کو مذاکرات کے لئے اسلام آباد بلوایا جہاں ان کے ساتھ ایک معاہدہ عمل میں آیا۔ معاہدہ کے بموجب طے پایا کہ صوبائی اسمبلی میں ایک بل منظور کرایا جائے گا جس کے بعد کسی سرکاری ملازم کو بارہ سال تک ملازمتوں سے محض اس بنا پر برطرف نہیں کیا جائے گا کہ اسے سندھی یا اردو نہیں آتی۔ اس طرح قضیہ رفع ہوا۔ بھٹو صاحب کو اگر دستور کا تحفظ عزیز ہوتا تو وہ سندھی کو واحد سرکاری زبان بنانے کا بل اسمبلی میں پیش کرنے پر ممتاز بھٹو کو بیک جنبشِ قلم برطرف کر سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہ کیا۔[1]

بہرکیف! عبوری آئین کے نفاذ کے بعد صوبوں میں نئی وزارتیں بنوائی گئیں۔ سندھ اور پنجاب میں پیپلز پارٹی کی وزارتیں بنیں جبکہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں مشترکہ طور پر نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے

---

[1] بھٹو صاحب سے مذاکرات کرنے کے لئے جو وفد اسلام آباد گیا وہ بارہ افراد پر مشتمل تھا۔ وہ ارکان جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، جناب حسین امام، جناب پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم، جناب جی۔ اے مدنی، پروفیسر غفور احمد، شاہ فرید الحق، جناب مظفر حسین، جناب رئیس امروہوی، جناب سید محمد تقی، ڈاکٹر عالیہ امام، دو ما المعلم رمنا رشید کرناڑ اور عبد الباری خاں تھے۔

اس میں طے پایا کہ معاہدہ کا متن صوبہ سندھ کے گورنر بذریعہ آرڈیننس جاری کریں گے جسے اسمبلی کا اجلاس منعقد ہونے پر اسمبلی سے بھی منظور کرایا جائے گا۔ معاہدے کا متن درج ذیل ہے۔

آرڈیننس کی تاریخ نفاذ سے بارہ سال کی مدت تک:

(۱) کسی شخص کے ساتھ جو صوبہ سندھ سے متعلق کسی سول سروس یا سول عہدہ پر تقرر یا ترقی کا اہل ہو محض سندھی یا اردو زبان سے عدم واقفیت کی بنا پر کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔

(۲) کسی شخص کو جو آرڈیننس کے نفاذ سے پہلے صوبہ سندھ سے متعلق کسی سول سروس یا سول عہدہ پر کام کر رہا ہو، محض سندھی یا اردو زبان سے عدم واقفیت کی بنا پر سبکدوش نہیں کیا جائے گا۔

(۳) سندھی کے علاوہ اردو کو بھی استعمال کیا جائے گا۔

اس قانون کا نفاذ اس طرح عمل میں آئے گا کہ اردو کے استعمال کو نقصان نہ پہنچے۔

Marfat.com

اسلام کی حکومت بنی۔ سرحد کے وزیراعلیٰ مفتی محمود ہوئے اور بلوچستان کے سردار عطاءاللہ مینگل۔ یہ بلوچستان کی پہلی وزارت تھی کیونکہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پہلی بار اسے صوبے کا درجہ دیا گیا تھا۔ ابھی صوبائی وزارتوں کو کام کرتے ہوئے نو ماہ ہی گزرے تھے کہ بھٹو نے ۱۳ فروری ۱۹۷۳ء کو گورنر غوث بخش بزنجو کو برطرف کر دیا اور اس کے دو دن بعد صوبے کی وزارت بھی توڑ دی۔ بلوچستان کے گورنر کو برطرف کرنے کے ساتھ لگے ہاتھوں انہوں نے صوبہ سرحد کے گورنر ارباب سکندر خان خلیل کو بھی برطرف کر دیا۔ مینگل کو ہٹا کر جام صاحب لسبیلا کی سربراہی میں پیپلز پارٹی کی وزارت بنوائی گئی حالانکہ صوبائی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کو ایک نشست بھی حاصل نہ ہو سکی تھی۔ گورنری پر نواب اکبر بگٹی کو فائز کیا گیا۔ پس منظر اس اقدام کا یہ تھا کہ اسلام آباد میں واقع عراقی سفارت خانے میں روسی ساخت کے اسلحے کی پیٹیاں پکڑی گئی تھیں۔ بھٹو نے بلوچستان کی صوبائی حکومت اور نیشنل عوامی پارٹی کے سر یہ الزام منڈھا کہ یہ اسلحہ عراقی سفارت خانے کے ذریعے اس نے درآمد کرایا ہے۔ اسے وہ بلوچستان کے ذریعہ ایرانی بلوچوں میں تقسیم کرنا چاہتی تھی تاکہ ایرانی بلوچ اس کے ذریعے ایران میں شاہ کے خلاف گڑبڑ کر سکیں۔ شط العرب کے مسئلے پر عراق اور ایران کے مابین تعلقات پہلے سے کشیدہ چلے آ رہے تھے۔ ایران پر عراق کے صوبہ موصل کے کرد باغیوں کی پشت پناہی کا عراق الزام لگاتا چلا آ رہا تھا دوسری طرف ایرانی بلوچوں پر شاہ کے مظالم کے خلاف نیشنل عوامی پارٹی کے تنفر کا بھی سب کو علم تھا اس لئے اسلحے کی درآمد میں عراقی حکومت اور نیشنل عوامی پارٹی کے ملوث ہونے کے الزام کی صحت کا عام لوگوں کو بڑی آسانی سے یقین آ گیا۔ لہٰذا وزارت توڑ دیئے جانے پر لوگوں کی طرف سے کسی قسم کی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں ہوا بلکہ اسے ایک مفید اور بروقت اقدام سمجھا گیا حالانکہ یہ الزام غلط تھا۔ جیسا کہ بعد کے انکشافات سے معلوم ہوا، یہ اسلحہ خود بھٹو نے اپنے ایجنٹوں کی معرفت، عراقی سفارت خانے کے بعض افراد کو ملا کر عراق سے درآمد کرایا تھا۔ بیچارہ عراقی سفیر بھی اس سے بے خبر تھا۔ اسے درآمد کرنے کا مقصد وہی تھا جو انہوں نے بعد میں حاصل کیا۔ یعنی نیپ (اور جمعیت) کی حکومتوں کو برطرف کرنا۔ خان عبدالولی خاں بھٹو کی اس سازش کا ایک اور مقصد بھی بیان کرتے ہیں (ملاحظہ ہو دی آؤٹ لک ۶ جولائی ۱۹۷۴ء) کہ "شط العرب کے مسئلے پر عرصے سے ایران اور عراق کے مابین تنازعہ چلا آ رہا تھا۔ اس تنازعے میں عراق کو اسلحہ روس فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا بھٹو نے اپنے ایجنٹوں کی معرفت عراقی سفارت خانے کے توسط سے عراق سے اسلحہ درآمد کرایا۔

Marfat.com

اسلحے کی اس درآمد کو نیشنل عوامی پارٹی کے سر منڈھ کے بلوچستان میں اس کی صوبائی حکومت برطرف کر دی اور شاہ ایران کو باور کرایا کہ یہ اسلحہ نیشنل عوامی پارٹی نے اس غرض سے منگوایا ہے کہ وہ ایران کے بلوچیوں کی مدد سے خلیج فارس کے کنارے واقع ایران کے چار سو میل لمبے ساحل کا محاصرہ کرلے اور اس کی سمندری تجارت کی گزرگاہ بند کردے۔ بھٹو صاحب نے دوسری طرف بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت ختم کر کے خان عبدالولی خاں کے سامنے یہ عذر پیش کیا کہ شاہ اس واقعہ پر نیشنل عوامی پارٹی سے ناراض ہیں لہٰذا وہ بلوچستان میں اس کی وزارت دیکھنا نہیں چاہتے۔

گویا بھٹو شاہ ایران کی نگاہ میں خود کو ایرانی مفاد کا محافظ بھی ثابت کرنا چاہتے تھے اور نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت بھی ختم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے یہ کھیل بڑی چالاکی اور کامیابی سے کھیلا اور کم سے کم شاہ کو، بمطابق ولی خاں، نیشنل عوامی پارٹی سے بدگمان کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر ان کے اس اقدام سے ملک کو زبردست نقصان پہنچا۔ بلوچستان کے لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ مرکزی حکومت انہیں ان کے جائز جمہوری حق سے محروم رکھنا چاہتی ہے۔ بلوچستان کے لیڈروں نے اس واقعہ پر بڑی دردمندی سے ان پر زور دیا کہ وہ انہیں ان کے حقوق واپس دے دیں اور ان کی حکومت بحال کر دیں۔ تین چار مہینے تک بلوچستان کے عوام نہایت تحمل کے ساتھ اپنے حقوق کی بازیابی کا انتظار کرتے رہے۔ ادھر حزب اختلاف کی سات جماعتوں (مسلم لیگ، جماعت اسلامی، جمعیت علمائے اسلام، جمعیت علمائے پاکستان، نیشنل عوامی پارٹی، خاکسار تحریک اور آزاد ارکان اسمبلی) پر مشتمل متحدہ جمہوری محاذ بھی بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت کی صوبائی حکومت کی بحالی کے لئے کوشاں رہا مگر بھٹو نے ان باتوں کی مطلقاً پروا نہ کی۔

مئی کے مہینے سے خبریں آنے لگیں کہ بلوچستان میں قبائل نے مرکزی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت شروع کر دی ہے۔ پھر اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے پچاس ہزار کے قریب مسلح فوج بھیجی گئی اور اس فوجی آپریشن پر کامیابی سے عملدرآمد کے لئے نواب اکبر بگٹی کی خدمات حاصل کی گئیں کیونکہ اس کام کے لئے بلوچستان میں ان سے موزوں آلۂ کار کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ اکبر بگٹی اس واقعہ سے چند ہفتے پہلے بیرون ملک کے طویل دورے سے واپس آئے تھے اس دوران نیشنل عوامی پارٹی سے ان کی ناچاقی ہو گئی تھی اور وہ نیپ سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ واپس آتے ہی انہوں نے نیپ کے خلاف

Marfat.com

شعلہ بیانی شروع کردی اور اس پر بیرون ملک سے اسلحہ درآمد کرنے اور اسے صوبے میں تقسیم کرنے کا الزام لگایا۔ وہ خود نیپ سے وابستہ رہ چکے تھے اس لئے نیپ کے خلاف ان کی الزام تراشیوں کو سلطانی گواہ کا اقبال جرم سمجھا گیا۔ چند ہفتے بعد عراقی اسلحہ کی درآمد کا واقعہ رونما ہوا۔ اسے نیپ سے منسوب کیا گیا تو اکبر بگٹی کی الزام تراشی کے پس منظر میں اس الزام کی صحت پر یقین کرنے میں لوگوں کو زیادہ تامل نہ ہوا۔ مگر اس زمانے میں یہ دلچسپ حقیقت بھی بعض ذرائع سے منکشف ہوئی کہ عراقی اسلحہ کی درآمد میں ملوث عراقی افسر جو پکڑے جانے سے پہلے ہی پر اسرار طور پر روپوش ہو گیا تھا، نواب اکبر بگٹی کے بیٹے سلیم بگٹی کا گہرا دوست تھا۔

اکبر بگٹی صاحب نے گورنر بننے کے بعد نہایت بے رحمی سے فوجی کارروائی کرائی۔ "باغی" قبائل کو خوراک کی رسد رکوادی، بڑی تعداد میں لوگوں کو گرفتار کرایا اور باقیماندہ لوگوں کو پہاڑوں پر جا کر پناہ لینے یا افغانستان بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ ایک تو یہ ہوا کہ وہاں کے عوام کے دلوں میں مرکزی حکومت کے خلاف نفرت اور بیزاری پروان چڑھی اور دوسرے یہ کہ علیحدگی پسند عناصر کے ہاتھ مضبوط ہوئے۔

اس دوران متحدہ جمہوری محاذ مسئلے کو فوجی طریقے پر حل کرنے کے بجائے اس کا سیاسی حل تلاش کرنے پر زور دیتا رہا۔ اس نے مری میں ۲۸، ۲۹ جون ۱۹۷۳ء کو بھٹو سے مذاکرات کئے اور ان کے سامنے جو پندرہ مطالبات رکھے ان میں سر فہرست بلوچستان کا مسئلہ رکھا اور مطالبہ کیا کہ وہ وہاں کے لئے سیاسی حل تلاش کیا جائے اور نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کی مخلوط حکومت بحال کر دی جائے۔ محاذ کو مذاکرات کے پہلے سے قوی امید تھی کہ صوبائی حکومت بحال کر دی جائے گی کیونکہ بجٹ جون کے مہینے میں پیش کیا جاتا ہے اور صوبائی بجٹ وزراء اعلیٰ پیش کرتے ہیں اس لئے وزارت کی بحالی ضروری تھی۔ بھٹو صاحب نے ۲۸ جون کو دن کے وقت حزب اختلاف سے مذاکرات کئے مگر رات کو آرڈیننس جاری کر کے بجٹ پیش کرنے کا اختیار بلوچستان کے گورنر کو تفویض کر دیا۔ ان کے اس مفاہمت ناپسند اقدام نے نہ صرف یہ کہ ان پر سے جمہوری محاذ کا اعتبار اٹھا دیا بلکہ یہ اقدام کر کے انہوں نے آئین کی پابندی کے معاملے میں خود کو خود سر بھی ثابت کیا کیونکہ قومی اسمبلی کا اجلاس ان دنوں جاری تھا اور ظاہر ہے کہ اسمبلی کے اجلاس کے دوران صدر مملکت کو آرڈیننس جاری

Marfat.com

کرنے کا اختیار نہیں ہوتا۔ ان کی اس حرکت سے بلوچستان کے لیڈروں میں شدید جھنجھلاہٹ اور غصّہ پیدا ہوا مگر انہوں نے اس کی مطلقاً پروا نہ کی بلکہ پیہم اسی قسم کے اقدامات کرتے چلے گئے۔

بلوچستان کے معاملے میں انہوں نے جو کیا سو کیا۔ دیگر معاملات میں بھی ان کا رویہ حد درجہ بدعہد اور معاہدہ شکن آدمی کا سا تھا۔ ہنگامی حالت کے بارے میں ان سے مذاکرات میں یہ بات منوائی گئی تھی کہ دفاعی نقطہ نظر سے اہم سرحدی علاقوں کو چھوڑ کر ملک کے باقیماندہ حصّے سے وہ ایمرجنسی اٹھا لیں گے اور بنیادی حقوق بحال کر دیں گے مگر اس پر عمل کرنے کے بجائے انہوں نے اسمبلی سے مزید چھ ماہ کی توسیع کرا لی۔ انہوں نے اس امر کا وعدہ کیا کہ پریس پر سے عائد شدہ پابندیاں اٹھا لیں گے۔ مگر اس وعدے کو ایفا کرنے کے بجائے مزید تین اخبارات کو بند کر دیا اور ان کے ایڈیٹروں کو گرفتار کر لیا۔ انہوں نے یقین دہانی کرائی کہ سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا مگر رہا کرنے کے بجائے سردار غوث بخش بزنجو، سردار عطا اللہ مینگل اور نواب خیر بخش مری جیسے لوگوں کو گرفتار کر لیا جو متحدہ جمہوری محاذ کے اکابر میں شمار ہوتے تھے۔

بھٹو صاحب نے یہ سارے اقدامات عبوری آئین کے تحت حاصل کردہ اختیارات کے ذریعے کئے۔ مستقل آئین اپریل ۱۹۷۳ء میں وہ تیار کرا چکے تھے مگر اسے نافذ نہیں کیا کیونکہ اس کے نفاذ کے لئے انہوں نے ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء کی تاریخ مقرر کی تھی۔

قرارداد لاہور کی مضحکہ خیز تاویل

مستقل آئین تیار کرنے سے پہلے انہوں نے ایک نہایت نازک مسئلے کو چھیڑ دیا۔ وہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مسئلہ تھا۔ اسے تسلیم کرنے کا خیال، اپنے حسن و قبح سے قطع نظر، بھٹو صاحب کے تضادِ عمل کا ایک شاہکار تھا۔ چند ماہ قبل تک وہ پاکستان میں، بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے سب سے بڑے مخالف تھے۔ اسمبلی کا اجلاس منعقد کرنے کے خلاف انہوں نے سب سے بڑی دلیل یہ دی کہ نامکمل اسمبلی کا اجلاس منعقد کرنا بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے مترادف ہوگا۔ انہوں نے دولت مشترکہ میں پاکستان کی رکنیت اس وجہ سے منسوخ کی کہ برطانیہ نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا تھا

Marfat.com

مگر اب صرف پانچ ماہ بعد، کوئی غیر معمولی صورت حال پیدا ہوئے بغیر اسے تسلیم کرنے کے سب سے بڑے نقیب بن کر کھڑے ہو گئے۔ بہر کیف مشرقی پاکستان کے سقوط سے یہاں کے عوام کے دلوں کا زخم ابھی مندمل نہ ہونے پایا تھا کہ انہوں نے اسے تسلیم کرنے کی بھرپور تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنے وطن اور اس کے چپے چپے سے جذباتی لگاؤ کی بنا پر عوام الناس کسی قیمت پر بنگلہ دیش کو جداگانہ مملکت ماننے پر تیار نہ تھے۔ انہیں امید تھی کہ کبھی نہ کبھی مشرقی پاکستان میں ایسی قیادت برسر اقتدار آئے گی جو پھر سے مغربی پاکستان کے ساتھ اتحاد کر کے پاکستان کو اس کی اصل شکل میں واپس لے آئے گی۔ اہل الرائے کے طبقے میں سے بھی ایک معتد بہ تعداد اسی امکان کی بنا پر اسے تسلیم کرنے کی سخت مخالف تھی جب کہ کچھ دوسرے افراد کا خیال تھا کہ اب مشرقی پاکستان کا پاکستان کے ساتھ ادغام ظاہری طور پر چونکہ خارج از امکان ہے اس لئے اسے تسلیم کیا جانا چاہیئے تاکہ اس کے بعد دوسرے ممالک بھی اسے تسلیم کر لیں اور اس طرح بنگلہ دیش کو مسلم ممالک کا قرب حاصل کرنے اور مسلم ممالک کی برادری میں شامل ہونے کا موقع مل جائے بصورت دیگر اندیشہ تھا کہ وہ مستقلاً بھارت اور اس کے سیاسی تسلط میں چلا جائے گا۔ مگر اس نوع کی رائے رکھنے والے افراد کا بھی خیال تھا کہ اسے تسلیم کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیئے۔ اسے اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جانا چاہیئے جب تک ہمارے جنگی قیدی جن میں فوجی بھی تھے اور شہری بھی واپس نہ آ جائیں۔

بھارت مشرقی پاکستان کے لئے مغربی پاکستان کے عوام کے برادرانہ جذبات سے بہت خوفزدہ تھا اور اسے اندیشہ تھا کہ کسی وقت دونوں بازوؤں کا دوبارہ اتحاد عمل میں آ سکتا ہے اس لئے اس کی عیارانہ کوشش تھی کہ پاکستان اسے جلد از جلد تسلیم کر لے۔ چونکہ پاکستانی شہریوں اور افواج کی ایک بڑی تعداد ہندوستان کے جیلوں میں نظربند تھی اس لئے ان کی رہائی اور منتقلی کے لئے اس نے شرط عائد کی کہ پہلے پاکستان بنگلہ دیش کو تسلیم کرے۔

بھٹو بھی ان ہی اسباب سے جن کی بنا پر بھارت اس کے تسلیم کئے جانے پر زور دے رہا تھا، اسے تسلیم کرنے کے لئے بے تاب تھے اس مقصد کے تحت انہوں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی تحریک شروع کر دی۔

اس تحریک کے ضمن میں یہ بات سب سے زیادہ شرمناک اور مذموم تھی کہ انہوں نے اسے

تسلیم کرنے کے لئے۔ ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور کو سب سے بڑی دلیل قرار دیا انہوں نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس قرارداد سے یہ بات منسوب کر دی کہ "اس میں دو پاکستانوں کا مطالبہ کیا گیا تھا" گویا پاکستان کا دولخت کر دیا جانا قرارداد لاہور کی تکمیل تھا لہذا بنگلہ دیش تسلیم کر لیا جانا چاہئے۔ قرارداد لاہور سے پاکستان کو دولخت کرنے کے لئے یہ استنباط اس قرارداد پر بہت بڑا ظلم تھا۔ اس سے دو پاکستانوں کی تشکیل کا الزام منسوب کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اس قرارداد کو خود قائداعظم نے نہ سمجھا تھا اور نہ ان کے بعد سے لے کر ۱۹۷۱ء تک کسی کی سمجھ میں آیا تھا۔ مسلمان زعماء کے برعکس اس کا مفہوم اندرا گاندھی، یہودیوں، روسیوں اور متحدہ پاکستان کے مخالفین نے سمجھا تھا اور اسے دولخت کر کے انہوں نے اس قرارداد کو عملی جامہ پہنایا تھا۔ ہم گذشتہ صفحات میں مجیب الرحمٰن کے چھ نکاتی فارمولے کے ضمن میں اس امر کا تذکرہ بھی کر چکے ہیں کہ انہوں نے بھی اپنے فارمولے کی حمائت میں قرارداد لاہور ہی سے استنباط کیا تھا اور اس کی شق نمبر۔ ا کی تشریح میں دعویٰ کیا تھا کہ مذکورہ قرارداد میں مطالبہ دو مسلم مملکتوں (STATES) کا کیا گیا تھا۔ ان کے اس دعوے کی، حقائق و واقعات اور معقول و منقول دلائل کی روشنی میں تنقیح کر کے ہم اس کا ابطال کر چکے ہیں جس کا اعادہ کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے تاہم اس کا تذکرہ کرنا ضروری ہے کہ جب ۱۹۶۶ء میں مجیب الرحمٰن نے چھ نکاتی فارمولا پیش کیا تو بھٹو نے اس کی پرزور مخالفت کی تھی اور اس مسئلے پر مجیب الرحمٰن کو جلسہ عام میں مناظرہ کرنے کا چیلنج دیا تھا۔ مگر تضاد عمل ملاحظہ کیجئے کہ اس کے چھ سال بعد انہوں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے لئے مجیب الرحمٰن کی ہی دلیل کو اپنا لیا۔

بھٹو نے جب قرارداد لاہور سے دلیل وضع کی تو اس دلیل کی تشہیر کے لئے ان کے مشیر اطلاعات جناب پیر علی محمد راشدی نے جنگ کراچی مورخہ ۸ مئی ۱۹۷۲ء کے شمارے میں ایک طویل مضمون لکھا۔ انہوں نے اس میں دعویٰ کیا کہ "اس وقت (۱۹۴۰ء میں) ہمارے ذہنوں میں دو ریاستوں کا تصور کارفرما تھا"۔ یہاں پر اس امر کا تذکرہ کرنا خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ ۱۹۶۶ء میں مجیب الرحمٰن نے چھ نکاتی فارمولا پیش کیا اور اس کے حق میں قرارداد لاہور سے دلیل پیش کی تو راشدی صاحب نے جنگ میں اپنے ہفتہ وار کالم میں اس دلیل کی سختی کے ساتھ تکذیب کی۔ انہوں نے اس کی تکذیب میں جو دلائل پیش کئے انہیں ان کے محولہ بالا مضمون کے جواب میں پیش

Marfat.com

کیا جائے تو نہایت مسکت ثابت ہوں گے مگر وہ چونکہ اپنے دلائل سے منحرف ہو چکے ہیں لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بجائے جناب عبدالشکور راحت کے دلائل پیش کئے جائیں جو انہوں نے راشدی صاحب کے مضمون کے جواب میں ۲۹ مئی ۱۹۷۲ء کے جسارت میں شائع کرائے۔ فاضل مضمون نگار رقمطراز ہیں کہ:

"قرار داد لاہور ۱۹۴۰ء کے مسلم لیگ سیشن میں پاس ہوئی تھی[1] اس سیشن کے بعد جو پہلا مسلم لیگ سیشن ۱۹۴۱ء میں بمقام مدراس منعقد ہوا، اس میں قائداعظم نے اپنے خطبہ صدارت کے دوران ہندوستانی مسلمانوں کی منزل ومقصود کی حیثیت سے ایک خود مختار ریاست کا ذکر کیا تھا۔ قائداعظم نے فرمایا تھا کہ:

"ہم یہ عزم کر چکے ہیں اور کسی کو اس کے متعلق غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ ہم ایک خود مختار قوم کی حیثیت کو منوائیں گے اور اس برصغیر میں ایک خود مختار ریاست قائم کریں گے"۔

"۱۹۴۶ء کے دہلی کنونشن میں جب قائداعظم کی صدارت میں سبجیکٹ کمیٹی، کھلے اجلاس میں پیش کی جانے والی قرار داد مرتب کر رہی تھی تو اس وقت کسی نے قرار داد لاہور کی ٹائپ شدہ دستاویزات میں درج لفظ STATES (جمع کے صیغہ میں) کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس موقع پر جو بات ہوئی وہ جناب اے۔ ایچ اصفہانی نے اپنی تصنیف QUAID-E-AZAM AS I KNEW HIM کے صفحہ ۱۵۱ پر لکھی ہے کہ "قائداعظم نے اسے ٹائپ کی غلطی قرار دے کر فرمایا تھا کہ دراصل جس چیز کی اہمیت ہے وہ نیت یا ارادہ ہے نہ کہ لفظ۔ اور انہوں نے حکم دیا کہ یادداشتوں کی تصحیح کر لی جائے[2]"

ان دلیلوں کو بھی چھوڑیئے۔ خود بھٹو صاحب کی رائے ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے قبل ازیں اپنی تصنیف عظیم المیہ کے صفحہ نمبر ۱۰ پر تحریر فرمائی ہے۔

---

[1] جس میں مسلمانوں کے مطلوبہ ملک کے لئے STATE کی بجائے STATES کا لفظ رقم ہو گیا تھا۔ راقم الحروف

[2] چنانچہ تصحیح کر دی گئی اور ۱۹۴۶ء کے سیشن میں تصحیح شدہ قرار داد حسین شہید صاحب نے پیش کر کے اجلاس سے منظور کرائی۔ راقم الحروف

Marfat.com

"ہمارا نقطہ آغاز ۱۹۴۰ء ہے جب ۲۳ مارچ کو ہندوستان کے مسلمانوں نے قائداعظم کی قیادت میں ایک الگ مسلم ریاست پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ تصور شیر بنگال مولوی فضل الحق نے ایک قرارداد میں پیش کیا تھا جسے قرارداد لاہور کا نام دیا گیا ہے۔ ملک کے دونوں حصوں میں بڑھتے ہوئے محاربے کے باعث چند سالوں میں قرارداد لاہور پر از سر نو بحث کا تلخ آغاز ہوا۔ پہلے ۱۹۶۶ء میں شیخ مجیب الرحمٰن اور بعد میں مولانا بھاشانی نے دعویٰ کیا کہ قرارداد لاہور میں دو مسلم ریاستوں کا مطالبہ ہے۔ ایک مشرق میں اور دوسری مغرب میں۔ یہ قرارداد کی دیانت دارانہ تعبیر و تشریح نہیں ہے۔ تخلیق پاکستان سے لے کر ۱۹۶۶ء تک اس قرارداد کو کبھی بھی سنجیدگی سے یہ معنی نہیں پہنائے گئے۔"

اگر بھٹو اپنے قول اور اپنے اقرار پر قائم رہنے والے آدمی ہوتے تو مذکورہ موقف سے منحرف ہونے کا تصور بھی ذہن میں نہیں لاسکتے تھے مگر وہ اپنے قول اور قرار پر ہمیشہ اپنی ضرورت اور اپنے مفاد کو ترجیح دینے کے عادی تھے اس لئے مذکورہ موقف سے منحرف ہونے میں انہیں چنداں تامل نہ ہوا اور انہوں نے بلا تکلف اس موقف سے متحارب موقف کو اختیار کر لیا اور بنگلہ دیش تسلیم کرنے کی تحریک زور و شور پر شروع کر دی۔ تاہم اپنی اس تحریک پر انہیں عوام کی طرف سے زبردست مزاحمت اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ملک بھر میں "بنگلہ دیش نامنظور" کی تحریک چل پڑی۔ خود انہیں نشتر پارک کراچی کے جلسہ عام میں اتنی زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا کہ انہیں جلسے میں یہ اقرار کرنا پڑا کہ "اگر عوام کو بنگلہ دیش منظور نہیں تو ہمیں بھی منظور نہیں"۔ ان کے اس اقرار کے بعد عوام کے دلوں میں بڑا اطمینان اور سکون پیدا ہوا کہ انہوں نے عوام کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔

مگر وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آئے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے ایک دوسری تدبیر تلاش کی۔ انہوں نے ۱۹۷۳ء کے آئین کے مسودے میں، جس کی تفصیل آگے آئے گی، مملکت پاکستان کی حدود کی دفعہ میں مندرجہ ذیل عبارت درج کر دی۔

دفعہ نمبر ۱۔ ذیلی دفعہ نمبر ۲ میں کہا گیا کہ " پاکستان کی حدود پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد، بلوچستان، اسلام آباد، قبائلی علاقے اور پاکستانی ریاستوں پر مشتمل ہوں گے"۔ (یعنی مشرقی پاکستان کو مملکت کی حدود سے خارج کر دیا گیا)

اسی دفعہ کی ذیلی دفعہ ۳ میں کہا گیا کہ " مشرقی پاکستان سے جب جارحیت کا خاتمہ ہو جائے گا تو

اسے بھی وفاق میں نمائندگی دی جائے گی"۔

مشرقی پاکستان کے لئے ان معصومانہ اور محبت آمیز الفاظ کے پردے میں اسے آئینی طور پر پاکستان کی مملکت کی حدود سے خارج کر دیا گیا اس کا مطلب یہ تھا کہ مشرقی پاکستان پر اب پاکستان کا کوئی آئینی حق باقی نہ رہا۔ ملک کے کسی حصے کا دشمن کے قبضے میں چلے جانے کا یہ تاریخ میں کوئی پہلا واقعہ نہ تھا۔ اس سے پہلے سینکڑوں ممالک کی سرحدیں اور علاقے دشمن کے تسلط میں جا چکے ہیں مگر ایسا کبھی سننے میں نہیں آیا کہ اپنے علاقے کو کھونے والے ملک نے اپنے دستور میں بھی اسے مملکت کی حدود سے خارج کر دیا ہو۔ حالیہ دنوں میں شام کی مثال موجود تھی، مصر کی مثال موجود تھی، اردن کی مثال موجود تھی جس کے علاقے اسرائیل کے قبضے میں چلے گئے تھے مگر ان میں سے کسی ملک نے بھی اس پر اپنا آئینی حق ساقط نہیں کیا۔ اسرائیل آج تک اسی وجہ سے عرب ممالک سے حالت جنگ میں رہتا ہے کہ عرب ممالک اپنے علاقوں پر اس کا تسلط تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ یہ تاریخ کی پہلی اور انوکھی مثال تھی کہ کسی ملک کا سربراہ اپنا علاقہ کھونے پر آنکھوں میں آنسو بھی لئے پھرتا ہو اور اس پر سے اپنا آئینی حق ساقط کرنے کے لئے بھی بیتاب ہو۔

مگر عیاری ملاحظہ کیجئے کہ مذکورہ عبارت کو دستور میں شامل کرنے کے بعد دعویٰ کیا گیا کہ حکومت ابھی تک مشرقی پاکستان کو جزو لاینفک سمجھتی ہے اور مذکورہ ذیلی دفعہ نمبر (۳) کے ذریعے اس نے اس پر اپنے استحقاق کا اعادہ کیا ہے۔ دوسری طرف عوام الناس کی سادہ لوحی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے مذکورہ ذیلی دفعہ کی شمولیت کو عوام کی فتحمندی اور رائے عامہ کے آگے بھٹو کی پسپائی قرار دیا۔

مذکورہ ذیلی دفعہ شامل کئے جانے پر بھارت کو بے حد اطمینان حاصل ہوا اور اس نے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس کے ذریعے بھٹو کی حکومت نے بنگلہ دیش کو بالواسطہ طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ بھارت کا مقصد چونکہ پورا ہو گیا تھا، اس لئے دستور کی منظوری کے چند دن بعد اس نے بنگلہ دیش کے لیڈروں کے ساتھ مئی کے پہلے ہفتے میں جو مشترکہ اعلامیہ شائع کیا اس میں جنگی قیدیوں کی واپسی کے لئے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی شرط واپس لے لی اور اس کی جگہ ایک نئی شرط کا اضافہ کر دیا جو یہ تھا کہ "پاکستان مغربی پاکستان میں مقیم بنگالیوں کو واپس کر دے اور مشرقی پاکستان میں مقیم پاکستانیوں کو اپنے یہاں بلا لے"۔

یہ نئی شرط بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی شرط کے مقابلے میں نرم نظر آتی تھی اس لئے عوام نے

Marfat.com

اس پر نہایت مسرت کا اظہار کیا۔ اخبارات نے جن میں افسوس کہ حزب اختلاف کے اخبارات بھی تھے خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ ملک کے حکمرانوں نے عوام الناس کی اس سادہ لوحی سے بڑا فائدہ اٹھایا اور جناب عزیز احمد (اس وقت کے وزیر مملکت برائے دفاع وامور خارجہ) نے اس نئی شرط کو بنگلہ دیش تسلیم کرنے کی شرط سے بھارت اور بنگلہ دیش کی دست برداری قرار دیا اور اسے ان دونوں ممالک کے مقابلے میں پاکستانی عوام کی فتحمندی قرار دیا۔

مذکورہ ذیلی دفعہ کو شامل کرنے سے بھٹو کو آگے چل کر بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے میں بڑی آسانی ہوگئی اور انہوں نے اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا کئے بغیر اسے تسلیم کر لیا۔ آئین کی مذکورہ دفعہ کے ذریعے اسے تسلیم کرنے کی گنجائش پیدا کر لی گئی تھی اس لئے اب اس اقدام کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کا راستہ بھی بند ہو گیا۔

۱۹۷۳ء کا دستور اور اس کے نفاذ سے گریز کے نتائج

مستقل آئین ۱۴، اگست ۱۹۷۳ء تک کی متعینہ مدت سے پہلے ہی تیار کر لیا گیا اور ۱۲، اپریل کو قومی اسمبلی نے اسے متفقہ طور پر منظور کر لیا۔ مگر اس آئین کو تیاری اور تکمیل کے مراحل طے کرنے کے لئے حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے مابین ایک نہایت شدید قسم کی معرکہ آرائی دیکھنی پڑی۔

مستقل آئین کا مسودہ تیار کرنے کے لئے ۲۰، اکتوبر ۱۹۷۲ء کو حکومت نے ایک ۲۵ رکنی کمیٹی تشکیل دی۔ اس میں حزب اقتدار کے پندرہ اراکین اور حزب اختلاف کے دس اراکین نامزد کئے گئے۔ حزب اختلاف کے ارکان نیشنل عوامی پارٹی، جمعیت علمائے اسلام، جماعت اسلامی، جمیعت علمائے پاکستان اور آزاد گروپ میں سے لئے گئے۔ اس کمیٹی میں حکمران جماعت کی طرف سے پیش کی گئی دستوری سفارشات پر غور کیا گیا اور بحث وتمحیث اور مفاہمت ومصالحت کے نتیجے میں دستور کے بیشتر نکات پر اتفاق رائے ہو گیا۔ ان کے متفق علیہ نکات متفقہ آئینی فارمولا کہلائے۔ بعض نکات پر سمجھوتہ نہ ہو سکا جن کے لئے حزب اختلاف کے ارکان نے اختلافی نوٹ لکھے۔ اتفاق رائے کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ آئین صدارتی طرز کے بجائے پارلیمانی طرز کا ہوگا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو حکمران جماعت کے وزیر قانون جناب

عبدالحفیظ پیرزادہ نے آئین کا جو مسوّدہ اسمبلی میں پیش کیا اس میں متفقہ فارمولا کے بہت سے نکات سے انحراف کیا گیا۔ انتظامی ڈھانچہ اگرچہ طے شدہ فارمولے کے بموجب پارلیمانی ہی رکھا گیا مگر ڈھانچے کی تبدیلی کے باوجود یہ مسودہ اپنی اندرونی صفات کے اعتبار سے عبوری آئین کی محض ایک تبدیل شدہ شکل تھا۔ پارلیمانی دستور کی جو خصوصیت اسے صدارتی دستور سے ممیز کرتی ہے، یہ ہے کہ اس میں اسمبلی کو صرف قانون سازی کا اختیار نہیں ہوتا بلکہ سربراہ انتظامیہ کے، جسے وزیراعظم کہتے ہیں، تقرر کا اختیار بھی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اسے اس امر کا بھی اختیار ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے وزیراعظم کو برطرف کر دے۔ ججوں اور افواج کے سربراہوں کے تقرر کا اختیار (وزیراعظم کے بجائے) صدر مملکت کے ہاتھ میں ہوتا ہے تاکہ وزیراعظم عدلیہ اور افواج کو اپنی مرضی کا تابع نہ بنا سکے۔ الیکشن کمشنر کے تقرر کا اختیار بھی صدر مملکت کے ہاتھ میں ہوتا ہے تاکہ وزیراعظم انتخابی مشینری کی غیر جانبداری پر اثر انداز نہ ہو سکے اور انتخابات منصفانہ طور پر منعقد ہو سکیں۔ پاکستان کے ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۴ء کے دستوری مسودوں میں اور ۱۹۵۶ء کے آئین میں یہ سب اختیارات صدر مملکت کو تفویض کیے گئے تھے۔ ہنگامی حالت کا اعلان کرنے کا اختیار بھی صدر مملکت کے ہاتھ میں ہوتا ہے مگر یہ اختیار اس شرط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے کہ ہنگامی حالت کا اعلان حالت جنگ میں کیا جائے گا۔ انہیں بنیادی حقوق کو بھی معطل کرنے کا اختیار ہوتا ہے مگر یہ بھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے کہ اسے صرف حالت جنگ میں معطل کیا جائے گا۔

مگر اس آئینی مسودے میں اسمبلی کو توڑنے کا اختیار، ججوں کے تقرر کا اختیار، افواج کے چیف آف اسٹاف کے تقرر کا اختیار اور الیکشن کمشنر کے تقرر کا اختیار بالواسطہ طور پر وزیراعظم نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور خود اپنی وزارت عظمیٰ کو اپنی قانونی میعاد کی تکمیل تک کے لئے ہر طرح سے محفوظ و مامون کر لیا تھا۔ انہیں اسمبلی کی دو تہائی اکثریت کے بغیر برطرف نہیں کیا جا سکتا تھا (حالانکہ برطرفی کے لئے ۵۱ فیصد کی اکثریت دنیا بھر میں کافی سمجھی جاتی ہے) گویا جملہ اختیارات جو عبوری آئین میں فرد واحد (صدر مملکت) کی ذات میں مرکوز کر دیئے گئے تھے، مستقل آئین میں بھی فرد واحد (وزیراعظم) کی ذات میں مرکوز کر دیئے گئے اور یہ کام اس منصوبے کے تحت کیا گیا کہ نئے آئین کے نفاذ کے بعد وزیراعظم اسی شخص کو ہونا ہے جو عبوری آئین کے دور میں صدر مملکت ہے اور وہ شخصیت ذوالفقار علی بھٹو کی تھی۔

گویا یہ دستور پاکستان کے لئے تیار نہیں کیا جا رہا تھا بلکہ ذوالفقار بھٹو کے لئے تیار کیا جا رہا تھا اور تمام کد و کاوش پاکستان کو مستحکم کرنے کے لئے نہیں کی جا رہی تھی بلکہ ذوالفقار بھٹو کو مستحکم کرنے کے لئے کی جا رہی تھی۔

اسلامی دفعات کے اعتبار سے یہ مسودہ اتنا ہی مایوس کن تھا جتنا ۱۹۶۲ء کا آئین۔ اسے ۱۹۶۲ء کے آئین کی اسلامی دفعات پر صرف اس اعتبار سے سبقت حاصل تھی کہ مملکت کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان، جو ۱۹۶۲ء کے آئین میں منسوخ کر دیا گیا تھا، بحال کر دیا گیا تھا۔ چھوٹے صوبوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے قومی اسمبلی کے علاوہ سینٹ کا قیام تجویز کیا گیا تھا مگر اسے معقول اختیارات سے محروم رکھا گیا تھا۔

اس اجمال کے بعد دستور کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے اور اندازہ کیجئے کہ وزیر اعظم کو مستحکم کرنے کے لئے اسے کیا کیا اختیارات اور آئینی تحفظات دیئے گئے ہیں اور بے چارے صدر مملکت کو کس قدر لاچار بنا دیا گیا ہے۔

دستور کی دفعہ (۵۸) میں کہا گیا ہے کہ صدر مملکت اگر چاہیں تو میعاد ختم ہونے سے پہلے ہی اسمبلی کو برطرف کر سکتے ہیں مگر اسمبلی کو برطرف کرنے کے لئے وزیر اعظم کے توثیقی دستخط ضروری ہوں گے۔ دفعہ (۵۸) میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ "وزیر اعظم اگر اسمبلی کو توڑنے کی سفارش کریں مگر صدر مملکت اس سفارش پر عمل نہ کریں تو ۴۸ گھنٹے کے بعد اسمبلی از خود ٹوٹ جائے گی"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے بعض ممالک کے دساتیر میں یہ بات شامل ہے۔ مثلاً انگلستان کے (غیر تحریری) دستور میں اس امر کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ وزیر اعظم اسمبلی توڑنے کے لئے سربراہ مملکت سے سفارش کر سکتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ امر بھی مشروط ہے کہ اس کے بعد وزارت بھی ختم ہو جائے گی مگر بھٹو نے دفعہ (۹۳) شق (۲) کے ذریعے یہ شرط حذف کر دی جس کا مطلب یہ تھا کہ اسمبلی کو اگر وزیر اعظم کی خوشنودی حاصل نہ ہو تو وہ دفعہ (۵۸) کے ذریعے اسمبلی کو برطرف کرا دے اور پھر مطلق العنان بن کے ملک پر حکومت کرتا رہے۔ یہی اختیار عبوری آئین میں صدر مملکت کو دیا گیا تھا۔

اس دفعہ کو شامل کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ صدر مملکت اگر وزیر اعظم کو برطرف کرنے کے لئے یا کسی اور غرض سے اسمبلی کو توڑنا چاہیں تو نہ توڑ سکیں مگر وزیر اعظم چاہے تو اسمبلی ٹوٹ جائے۔

Marfat.com

سپریم کورٹ کے چیف جسٹس، افواج کے چیف آف اسٹاف اور چیف الیکشن کمشنر کے تقرّر کا اختیار دفعہ (۱۷۷)، (۲۴۳) اور (۲۱۳) کے ذریعے اگرچہ صدر مملکت کو دیا گیا مگر دستور کی دفعہ (۴۸) ذیلی دفعہ (۲) اور (۳) کے ذریعے انہیں وزیر اعظم کے مشورے کا پابند کر دیا گیا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس دفعہ کی رو سے صدر مملکت کو اپنا ہر اختیار استعمال کرنے میں وزیر اعظم کے مشورے (توثیقی دستخط) کا پابند کر دیا گیا۔

دستور کی دفعہ ۲۴۸ کے ذریعے وزیر اعظم کو اپنے اختیارات کے استعمال کے معاملے میں عدالت کے سامنے جواب دہی کے امکان سے مبرّا کر دیا گیا۔ دستور کی یہ اتنی بدترین دفعہ ہے کہ اس کے بارے میں سپریم کورٹ کے ایک (ریٹائرڈ) جج جناب جسٹس بدیع الزماں کیکاؤس کا تبصرہ یہ ہے کہ "ہمارے حکمراں جو بھی جرم کریں، چاہے وہ تمام پاکستان کو قتل کر دیں۔ چاہے غداری کے مرتکب ہوں، ان پر مقدمہ نہیں چل سکتا" (روزنامہ جسارت ۔۲۴ جولائی ۱۹۷۹ء)

دفعہ (۹۶) شق (۵) میں کہا گیا کہ دس سال کی مدت تک وزیر اعظم کو اسمبلی میں دو تہائی اکثریت کے بغیر برطرف نہ کیا جا سکے گا۔

دفعہ (۲۴۳) شق (۱) کے ذریعے تینوں مسلح افواج کا سپریم کمانڈر صدر مملکت کے بجائے وزیر اعظم کو بنایا گیا۔

گورنروں کے تقرر کا اختیار دفعہ (۱۰۱) کے ذریعے بظاہر صدر مملکت کے ہاتھ میں مگر دفعہ (۴۸) کے ذریعے بالواسطہ طور پر وزیر اعظم کے ہاتھ میں دے دیا گیا حالانکہ یہ اختیار خالصتاً صدر مملکت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وزیر اعظم صرف مرکزی حکومت کی انتظامیہ کے اختیارات کا مالک ہوتا ہے۔ صوبائی انتظامیہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

دفعہ (۲۳۲) تا (۲۳۷) کے ذریعے ہنگامی حالت کا اعلان کرنے کا اختیار حاصل کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی بنیادی حقوق معطل کرنے کی گنجائش پیدا کی گئی ہے۔

دفعہ (۴۵) کے ذریعے ہر قسم کی سزاؤں کو معاف کرنے کا اختیار حاصل کیا گیا ہے خواہ وہ قتل ہو، ڈاکہ زنی ہو، اغوا ہو یا کوئی اور سنگین جرم۔

عدالتوں کے اختیارات میں بھی کئی طریقوں سے کمی کر دی گئی۔ اس سے پہلے کسی بھی دستور میں

Marfat.com

اتنی کمی نہیں کی گئی تھی۔ ججوں کے تقرر کا اختیار سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سے چھین لیا گیا اور دفعہ (۱۷۷) میں کہا گیا کہ سپریم کورٹ کے ججوں کا تقرر صدر مملکت (بذریعہ دفعہ ۴۸ وزیراعظم کے مشورے سے) کریں گے۔

عدالت کے دائرہ کار کو محدود کرنے کے لئے بذریعہ دفعہ (۲۱۲) جداگانہ انتظامی عدالتوں (ADMINISTRATIVE COURTS) کی تشکیل تجویز کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ سرکاری ملازمین، نیم سرکاری ملازمین اور لوکل باڈی کے ملازمین اپنے حقوق کی بازیابی کے لئے عام عدالتوں میں نہ جا سکیں بلکہ انتظامی عدالتوں سے رجوع کریں۔ انتظامی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف کھلی عدالتوں میں اپیل کا دروازہ مذکورہ دفعہ کی شق (۲) کے ذریعے بند کر دیا گیا۔

دفعہ (۱۰) کی شق (۳) کے ذریعے یہ اختیار حاصل کیا گیا کہ کسی بھی شخص کو احتیاطی نظربندی کے تحت گرفتار کیا جا سکتا ہے۔

مذکورہ دفعہ کی شق (۴) کے ذریعے اس کے لئے کھلی عدالت میں جانے کا راستہ بند کر دیا گیا اور اس پر سرکاری ٹریبونل کے سامنے پیش ہونے کی پابندی عائد کر دی گئی۔

دفعہ (۲۴) کے ذریعے کسی شخص کی جائیداد بلا معاوضہ چھین لینے کا اختیار حاصل کیا گیا۔

۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء سے لے کر ۲۰ اپریل ۱۹۷۲ء کے دوران یعنی یحییٰ خان کے دور حکومت اور بھٹو صاحب کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے دور کے تمام مارشل لاء قوانین، ان کے تحت جاری کئے ہوئے تمام احکامات اور ان کے کئے ہوئے تمام کاموں کو دفعہ (۲۶۹) اور (۲۷۰) کے ذریعے آئینی تحفظ عطا کیا گیا۔ واضح رہے کہ قبل ازیں ۲۰ اپریل ۱۹۷۲ء کو اسماء جیلانی کیس میں سپریم کورٹ یحییٰ خان کو غاصب قرار دے چکی تھی اور ان کے جاری کئے ہوئے تمام ضابطوں اور احکامات کو ماسوائے ایسے ضابطوں اور احکامات کے جو نظریہ ضرورت کے تحت ضروری تھے، غیر قانونی قرار دے چکی تھی۔

دستور میں وزیراعظم کے لئے یہ تمام اختیارات مخصوص کرنے کے بعد جب یہ آئین نافذ ہوا تو بھٹو صاحب نے سدارت کا بے اختیار منصب چوہدری فضل الٰہی کے حوالے کر دیا اور خود وزارتِ عظمیٰ سنبھال لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے جتنے کچھ اختیارات انہیں صدر مملکت کی حیثیت سے حاصل تھے اب وہی سب اختیارات انہیں وزیراعظم کی حیثیت سے حاصل ہو گئے۔ صدر مملکت کو آئین میں اس

Marfat.com

قدر بے اختیار کر دیا گیا کہ جب دستور منظر عام پر آیا تو اسے دیکھ کر چوہدری ظہور الٰہی نے مزاحاً کہا کہ "اس قدر بے اختیار صدر کے تقرر کے لئے اخبارات میں اشتہار دینا پڑے گا"۔

یہ تو تھیں دستوری سفارشات کی وہ دفعات جن پر حکومت نے حزب اختلاف کے ساتھ کسی قیمت پر مفاہمت نہ کی۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی دفعات تھیں جن سے حکومت کی مطلق العنان ذہنیت مترشح ہوتی تھی مگر حزب اختلاف سے مفاہمت کی غرض سے حکومت کو انہیں واپس لینا پڑا۔

جب یہ مسودہ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو اسمبلی میں پیش کیا گیا تو اسے دیکھ کر حزب اختلاف کو بڑی جھنجھلاہٹ پیدا ہوئی کیونکہ یہ مسودہ نہ صرف بے حد آمرانہ تھا بلکہ اس میں طے شدہ آئینی فارمولے کی بھی صریح خلاف ورزی کی گئی تھی۔ غم و غصے کی وجہ یہ تھی کہ مطلق العنانی کے جو اختیارات اس آئین میں وزیر اعظم کے لئے مخصوص کئے گئے تھے یہ سب اختیارات قبل ازیں عبوری آئین میں صدر مملکت کو دیئے جا چکے تھے۔ بھٹو نے ان اختیارات کو بے حد بے جا اور غیر جمہوری طریقے پر استعمال کیا تھا۔ مثلاً ملک پر ہنگامی حالت مسلط رکھی حالانکہ جنگ ختم ہوئے عرصہ گزر چکا تھا۔ ہنگامی حالت کی آڑ لے کر بنیادی حقوق کو معطل کر دیا۔ ڈیفنس آف پاکستان رولز کو عام جرائم کے مرتکبین اور سیاسی مخالفین تک کے خلاف استعمال کیا جانے لگا۔ اسمبلی سے رجوع کرنے کے بجائے آرڈیننسوں کے ذریعے قوانین بنائے جانے لگے۔ اسمبلیوں کا مصرف صرف آرڈیننسوں کی منظوری دینا رہ گیا۔ ملک بھر میں ہمہ وقت ہنگامہ مسلط رہی۔

نئے دستور کے نفاذ کے بعد وزیر اعظم ذوالفقار بھٹو کو بننا تھا اس لئے یہ قیاس کرنا چنداں مشکل نہ تھا کہ مستقل آئین کی ان دفعات کو بھی صرف خصوصی حالات میں استعمال کرنے کے بجائے عام حالات میں استعمال کیا جائے گا چنانچہ اسمبلی کی حزب اختلاف کی جماعتوں نے گفت و شنید کے ذریعے اس امر کی بڑی کوشش کی کہ حکومت اپنے مسودے سے ایسی شقیں نکال دے مگر حکمران جماعت نے بے رخی کا رویہ اختیار کیا۔ علاوہ ازیں اسمبلی کے اجلاس میں حزب اختلاف کے ساتھ نامناسب برتاؤ کیا جانے لگا اور ان کے استحقاق کو بری طرح پامال کیا جانے لگا۔ حکمران جماعت کی طرف سے یہ طرز عمل اختیار کیا گیا کہ حزب اختلاف اگر اس کے دستوری مسودے پر صاد کرتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ اپنا بنایا ہوا دستور حزب اختلاف کی مرضی کے علی الرغم اسمبلی سے پاس کرا کے نافذ کر دے گی۔ اس عزم کا کھلم کھلا

اظہار بھٹو نے ۵ جنوری ۱۹۷۳ء کو کیا۔ یہ رویہ اس رویے کے مقابلے میں جو بھٹو نے فروری/مارچ ۱۹۷۱ء میں اختیار کیا تھا بالکل متضاد تھا۔ اس موقع پر انہوں نے محض اس بنا پر اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرادیا تھا اور اس کا بائیکاٹ کرنے کی دھمکی دی تھی کہ عوامی لیگ نے اُن سے پیشگی آئینی سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔

اس طرز عمل کا عملی مظاہرہ ۲ جنوری ۱۹۷۳ء کے اسمبلی کے اجلاس میں بھی ہوا۔ حزب اختلاف کے رہنما سردار شوکت حیات نے پاکستان ٹائمز کے مضمون نگار مسٹر برکی کے خلاف جنہوں نے اپنے ایک مضمون میں حزب اختلاف کے خلاف نہایت نازیبا الفاظ استعمال کئے تھے اور انہیں ہلاکو خان اور "مین فرام بازنتائن" قرار دیا تھا، تحریک استحقاق پیش کی اور مطالبہ کیا کہ مضمون نگار نے حزب اختلاف کے ارکان کی کردار کشی کی ہے لہٰذا اسمبلی کی پریس گیلری میں ان کے داخلے پر پابندی عائد کی جائے۔ جب یہ قرارداد پیش کی گئی تو حکمراں جماعت کے ارکان نے اس کے جواب میں نہایت جارحانہ رویہ اختیار کیا اور اس تحریک کی بڑی زبردست مخالفت کی حالانکہ اسمبلی کے اراکین کے وقار کے تحفظ کی خاطر کسی اخبار نویس کے داخلے پر پابندی کا مطالبہ ایسا نہ تھا جس کی نظیر موجود نہ ہو اور جسے تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع ہو مگر چونکہ حکمراں جماعت کی نگاہ میں حزب اختلاف کی کوئی اہمیت و وقعت نہ تھی اس لئے اس نے تحریک استحقاق کی بڑی پُر شور مخالفت کی اور ان کے خلاف نہایت حقارت آمیز جملے استعمال کئے۔ انتہا یہ ہے کہ وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ نے خان عبدالولی خاں کے ساتھ (دونوں کے درمیان عمر اور سیاسی مرتبے کا تفاوت ذہن میں رہے) سخت بدکلامی کی۔ حزب اختلاف حکمراں جماعت کے اس رویئے کے خلاف ۲ جنوری ۱۹۷۳ء کے اجلاس سے واک آؤٹ کر گئی اور تحریک استحقاق منظور ہونے تک اسمبلی کا بائیکاٹ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

حکمراں جماعت نے حزب اختلاف کے ساتھ یہ حقارت آمیز رویہ اس وجہ سے اختیار کیا کہ وہ اپنے آئینی مسودے پر حزب اختلاف کے اختلافی نوٹ سے برہم تھی اور جیسا کہ اس کے رویّے سے ظاہر ہوتا تھا، یہ چاہتی تھی کہ حزب اختلاف اگر بائیکاٹ کرتی ہے تو اسے اس کی چنداں فکر نہیں۔ وہ بہرصورت آئینی سمجھوتے سے انحراف پر قائم رہے گی جبکہ حزب اختلاف کا مطالبہ بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ جو فارمولا طے ہو چکا ہے اس کا احترام کیا جائے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دستور سازی میں اس

Marfat.com

وقت ذوالفقار بھٹو اور ان کی جماعت نے اس موقف کو اختیار کر لیا تھا جو فروری/مارچ ۱۹۷۱ء میں ان کے حریف شیخ مجیب الرحمٰن نے اختیار کیا تھا اور حزب اختلاف نے اس موقف کو اپنا لیا تھا جو مجیب الرحمٰن کے مقابلے پر بھٹو نے اختیار کیا تھا مگر بھٹو کو حزب اختلاف کے لئے ان کا (بھٹو کا) موقف اختیار کرنا پسند نہ تھا اور انہوں نے ۵ جنوری ۱۹۷۳ء کو صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اپنی پسند کا دستور منظور کرائیں گے۔

آگے چل کر بھٹو نے پے در پے ایسے اقدامات کیے جس سے دستور سازی کی راہ میں مشکلات بڑھتی ہی چلی گئیں اور مفاہمت کی راہ مسدود ہوتی چلی گئی۔

قبل ازیں ۱۰ فروری ۱۹۷۳ء کو اسلام آباد میں واقع عراقی سفارت خانے میں روسی ساخت کے اسلحے کی بارہ پیٹیاں پکڑی گئی تھیں۔ انہوں نے اس معاملے میں نیشنل عوامی پارٹی کو ملوث کیا اور اس پر الزام عائد کیا کہ اسے وہ بلوچستان کے راستے سے ایران کے بلوچیوں میں تقسیم کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کی مدد سے ایران میں وہاں کی حکومت کے خلاف گڑبڑ کرا سکے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس واقعے کی عدالتی تحقیقات کرائی جاتی۔ جب جرم ثابت ہو جاتا تو اس نوع کا اقدام کیا جاتا مگر انہوں نے اس سے گریز کیا اور اپنے عائد کردہ الزام کی بنیاد پر بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی (اور جمعیت) کی حکومت ختم کر دی۔ اس اقدام کے خلاف بطور احتجاج صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ مفتی محمود نے وزارت کا استعفیٰ پیش کر دیا جسے کمال فراخدلی سے بھٹو نے منظور کر لیا۔ اس طرح سے بھٹو نے ملک کے ان دونوں صوبوں میں جہاں حزب اختلاف کی وزارتیں تھیں انہیں ختم کر دیا۔ اس سے حزب اختلاف کی جماعتوں بالخصوص نیشنل عوامی پارٹی میں قدرتی طور پر سخت غم و غصہ پیدا ہوا۔ چند دن بعد جماعت اسلامی پر ہاتھ ڈالا گیا اور امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد صاحب کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر کوٹ لکھپت جیل میں اتنا ذلت آمیز برتاؤ کیا گیا کہ میاں صاحب عدالت کے روبرو اس کی تفصیلات بیان کرنے کے لئے تخلیے کے مستدعی ہوئے۔ اس واقعے پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے شدید رنج اور دکھ کا اظہار کیا اور انہوں نے ایک بیان میں کہا کہ میں متعدد بار جیل جا چکا ہوں یہاں تک کہ ۱۹۵۳ء کی گرفتاری کے بعد مجھے موت کی سزا سنائی گئی مگر جیل کے عملے اور حکام کا رویہ ہر مرتبہ نہایت شریفانہ رہا۔ ملک میں پہلی بار ایسی حکومت آئی ہے جس کے دور میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ اس قسم کا ذلت آمیز برتاؤ کیا

Marfat.com

جارہا ہے۔

دستور سازی کے نازک لمحے میں اس نوع کے اقدامات کے ذریعے حزب اختلاف کو اشتعال دلا کر انتہا پسندی کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی گئی۔ یہ وہی حربہ تھا جو اب سے پہلے بھٹو نے عوامی لیگ اور اہل مشرقی پاکستان کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ حزب اقتدار کو من مانا دستور نافذ کرنے کا موقع حاصل ہو جائے اور اگر دستور نہیں بن پاتا ہے تو عارضی آئین ہی کو مستقل آئین کی حیثیت دے دی جائے۔

اس صورت حال کو دیکھ کر حزب اختلاف کی جماعتوں نے محسوس کیا کہ اسمبلی کے اندر کی حزب اختلاف کے علاوہ اسمبلی کے باہر بھی ان کا ایک اتحاد قائم ہونا چاہیے اور آئین سازی کے علاوہ دیگر امور میں بھی حکمراں جماعت کی مطلق العنانیوں کی مزاحمت کی جانی چاہیے۔ اس اتحاد میں اسمبلی کی حزب اختلاف کی جماعتوں کے علاوہ دیگر جماعتیں بھی شامل ہوں تاکہ یہ وسیع تر اتحاد ہو۔ چنانچہ ۲۸ فروری ۷۳ء کو اسلام آباد میں حزب اختلاف کی جماعتوں کا ایک کنونشن ہوا جس میں مسلم لیگ، نیشنل عوامی پارٹی، جماعت اسلامی، جمعیت علمائے اسلام، جمعیت علمائے پاکستان، پاکستان جمہوری پارٹی، خاکسار تحریک اور اسمبلی کے آزاد ارکان کے ۳۹ اکابر شریک ہوئے۔ چار دن کے غور و فکر کے بعد متحدہ جمہوری محاذ (یو۔ڈی۔ الیف) کے نام سے حزب اختلاف کی ایک مشترکہ تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ اس نے بارہ نکات پر مشتمل ایک ڈیکلریشن تیار کیا جو اعلان اسلام آباد کے نام سے مشہور ہوا۔ اس اعلان کا متن درج ذیل ہے۔

(۱) ہم اپنے ہم وطنوں کو محبت و اخوت اور اتحاد و تعاون کی راہ کی جانب دعوت دیتے رہیں گے اور پاکستان کی جغرافیائی وحدت اور اتحاد کا تحفظ کریں گے۔

(۲) ہم یہ عزم صمیم رکھتے ہیں کہ پاکستان کے لیے حقیقی اسلامی، جمہوری، وفاقی اور پارلیمانی دستور حاصل کر کے رہیں گے۔

(۳) ہم پاکستان کے تمام شہریوں کو ان کے بنیادی حقوق دلائیں گے اور ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

(۴) ہم عوام کو ہر قسم کے استحصال سے نجات دلائیں گے اور عام آدمی کو بنیادی ضروریات

زندگی کی فراہمی کے لئے مسلسل اور منظم جدوجہد کریں گے۔

(۵) ہم اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک ہم فسطائیت کے ہر نشان کو مٹا نہ لیں اور وطن عزیز میں آمریت نافذ کرنے کی ہر ممکن کوشش کو شکست نہ دے دیں۔

(۶) ہم قومی یکجہتی کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے صوبائی خودمختاری کی حمایت کرتے ہیں اس لئے ہم صوبائی معاملات میں مرکز کی غیر جمہوری اور ناروا مداخلت کا مقابلہ کریں گے اور قومی اتحاد کے منافی علیحدگی پسندی کے تمام رجحانات کی نہایت سختی کے ساتھ مخالفت کریں گے۔

(۷) ہم قومی پریس اور ابلاغ عامہ کے دیگر ذرائع کو غیر اخلاقی اور غیر جمہوری پابندیوں اور قدغنوں سے نجات دلائیں گے اور ان کو ایک جمہوری اور آزاد ملک کے معیار کے مطابق ان کا جائز اور صحیح مقام دلائیں گے۔

(۸) ہم طلبہ، دانشوروں، صحافیوں اور مزدوروں کو ان کے حقوق دلانے کے لئے اپنی انتھک جدوجہد جاری رکھیں گے۔

(۹) ہمارے جو فوجی اور شہری بھارت کی قید میں ہیں ہم ان کی جلد از جلد رہائی کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔

(۱۰) ہم خود بھی ہمیشہ صحت مند سیاسی اصولوں اور روایات کی پابندی کریں گے اور کسی سیاسی جماعت یا حکومت کو اجازت نہیں دیں گے کہ وہ مہذب روایات کی خلاف ورزی کرے۔

(۱۱) ہم نہایت ثابت قدمی کے ساتھ ان تمام اندرونی اور بیرونی سازشوں کے خلاف جنگ کریں گے جو نظریۂ پاکستان، قومی سالمیت اور جغرافیائی اتحاد کے خلاف کی جائیں گی۔

(۱۲) ہم غیر محدود اختیارات کے مقابلے میں عوام کو تحفظ دینے کے لئے ہنگامی حالت کی منسوخی کی کوشش کریں گے جس نے حکومت کو غیر محدود اختیارات دے کر مطلق العنان بنا دیا ہے۔

اس متحدہ جمہوری محاذ کا صدر جناب پیر صاحب پگارا شریف اور سیکریٹری جنرل جناب پروفیسر غفور احمد صاحب کو مقرر کیا گیا۔

متحدہ جمہوری محاذ نے اپنی تشکیل کے بعد ۲۳، مارچ ۱۹۷۳ء کو لیاقت باغ راولپنڈی میں یوم پاکستان کے جلسے کا پروگرام بنایا۔ جلسے کی باقاعدہ اجازت انتظامیہ سے حاصل کر لی گئی۔ لوگ اس

Marfat.com

میں بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس میں شرکت کے لئے کافی تعداد میں شرکا صوبہ سرحد سے بھی آئے مگر حکومت نے اس جلسے میں فائرنگ کرادی۔ اس فائرنگ میں مارٹر بم بھی استعمال کئے گئے جس سے بڑی تعداد میں حاضرین مارے گئے اور بے حساب زخمی ہوئے۔ جلسہ درہم برہم ہوگیا۔ عینی شاہدوں کا کہنا تھا کہ فائرنگ نے جلیانوالہ باغ کا منظر دہرادیا تھا۔

ان اشتعال انگیز حالات کے درمیان ذوالفقار بھٹو نے حزب اختلاف کو آئینی پر مذاکرات کرنے کی دعوت دی اور اس کے لئے ۲؍ اپریل کی تاریخ مقرر کی۔ حالات اس قدر اشتعال انگیز تھے اور حکمران جماعت کا رویہ اس قدر جارحانہ تھا کہ حزب اختلاف کے ارکان میں مذاکرات کے لئے مطلقاً آمادگی نہ تھی مگر متحمل مزاج لیڈروں نے مذاکرات کی دعوت کو مسترد کرنا مناسب نہ سمجھا اور دعوت قبول کرلی۔ ۲؍ اپریل کو ایوان صدر میں ذوالفقار بھٹو سے مذاکرات شروع ہوئے جس میں حکمران جماعت کی طرف سے ان کے علاوہ وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ، وزیر صحت شیخ رشید، وزیر داخلہ خان عبدالقیوم خاں، مرکزی وزیر ملک محمد اختر اور (ریٹائرڈ) میجر جنرل جمال دار خاں تھے جبکہ حزب اختلاف کی طرف سے مفتی محمود، پروفیسر غفور احمد، مولانا شاہ احمد نورانی، امیرزادہ خاں اور سردار شیر باز خاں مزاری نے شرکت کی۔ مذاکرات میں ان آئینی ترامیم پر غور کیا گیا جو قبل ازیں حزب اختلاف کی جانب سے پیر صاحب پگاڑہ حکومت کو بھیج چکے تھے (ان کا خلاصہ آئندہ سطور میں آئے گا) ۲؍ اپریل کی آخری نشست میں ذوالفقار بھٹو نے ۲۶ صفحات پر مشتمل ایک طویل تحریری مکتوب حزب اختلاف کے حوالے کیا اور خواہش کی کہ چونکہ اس میں ان کے مطالبات مان لئے گئے ہیں لہٰذا وہ بائیکاٹ ختم کرکے اسمبلی کے اجلاس میں جو ۷؍ اپریل سے دوبارہ شروع ہورہا تھا، شرکت کریں۔ اس طویل مکتوب میں آئینی ترمیمات سے متعلق صرف گنی چنی باتیں تھیں۔ ان میں ایک یہ تھی کہ وزیراعظم کو ہٹانے کے لئے دو تہائی ووٹ حاصل کرنے کی شرط پندرہ سال کے بجائے صرف دس سال کی مدت کے لئے ہوگی۔

(۲) اگر وزیراعظم کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کردی گئی ہو تو اسمبلی توڑنے کا اختیار اس کے ہاتھ میں برقرار نہ رہے گا۔

(۳) عدلیہ کے ججوں کی تقرری کے لئے مروجہ قاعدہ ہی برقرار رہے گا۔

(۴) دستور سے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح حذف کردی جائے گی۔

حزب اختلاف اس یکطرفہ ایجاب وقبول پر راضی نہ ہوئی اور اس نے مزید ترمیمات قبول کرنے پر زور دیا چنانچہ ۲۶ صفحات پر مشتمل ذوالفقار بھٹو کے "مضمون" کے جواب میں متحدہ جمہوری محاذ کی طرف سے محاذ کے صدر جناب پیر پگاڑو نے ایک مکتوب ذوالفقار بھٹو کے پاس بھیجا جس میں حزب اختلاف کی طرف سے قبل ازیں بھیجی جانے والی ترمیمات کا اعادہ کیا گیا مگر بھٹو ان تجاویز اور ترمیمات کو ماننے پر تیار نہ ہوئے۔ حزب اختلاف نے ایسی صورت حال میں دستور سازی کی کارروائی میں حصہ لینا نامناسب سمجھا کیونکہ وہ دستور سازی میں حکمراں جماعت کی طرف سے اشتعال انگیزیوں کے باوجود اس وجہ سے مخلصانہ طریقے پر شریک کار رہنا چاہتی تھی کہ مبادا دستور نہ بن سکنے کی صورت میں عبوری آئین ہی مستقل آئین کی حیثیت اختیار کرلے مگر حزب اختلاف کی دستوری ترامیم کو قبول کئے بغیر جو دستور تیار کیا جا رہا تھا وہ اپنی خرابیوں کے اعتبار سے عبوری آئین سے مطلقاً بہتر نہ تھا اس لئے اس کی تدوین کے کام سے مجتنب رہنا ہی بہتر تھا۔ گویا ایک بار پھر نہایت نازک آئینی بحران رونما ہو گیا تھا۔ حزب اختلاف کی جانب سے دستوسازی کے بائیکاٹ کے رویئے کی بنا پر حکومت اپنے مسودے میں مزید ترمیمیں کرنے پر مجبور ہوئی۔ اس نے اسلامی دفعات کے ضمن میں ۱۹۵۶ء کے دستور کی بیشتر دفعات منظور کرلیں، وزیراعظم کے اختیارات میں مزید کچھ کمی کی گئی۔ عدلیہ اور اسمبلی کے اختیارات میں اضافہ کیا گیا، بنیادی حقوق کو قدرے عدالتی تحفظ دیا گیا۔ مزید اتنی اصلاحات ہو جانے کی بنا پر حزب اختلاف نے ملک کے وسیع تر مفاد میں آئین پر متفقہ طور پر دستخط کر دیئے جس کی وجہ سے ۱۹۷۳ء کے آئین کو متفقہ آئین قرار پانے کا اعزاز حاصل ہوا اور ۱۲ اپریل کو اس کی منظوری عمل میں آئی۔

حکومت نے حزب اختلاف کی جو ترمیمات قبول کیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) مملکت کا مذہب اسلام ہوگا۔ دفعہ (۲)

(۲) قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔ دفعہ (۲۲۷) شق (۱)

(۳) دستور کے نفاذ کے ۹۰ دن کے اندر اندر اسلامی نظریاتی کاؤنسل کی تشکیل لازمی ہوگی۔ دفعہ (۲۲۸) شق (۱)

(۴) صوبائی یا مرکزی اسمبلی کی ۲/۵ اقلیت بھی کسی زیر غور قانون کو اسلامی نظریاتی کاؤنسل میں بھیجنے کی مجاز ہوگی۔ دفعہ (۲۲۹)

Marfat.com

(۵) اسلامی نظریاتی کاؤنسل کا مشورہ موصول ہونے سے پیشتر، انتہائی ضروری حالات میں کوئی قانون پاس ہو جائے اور کاؤنسل بعد میں رائے دے کہ یہ قرآن وسنت کے منافی ہے تو اس پر لازماً نظر ثانی کی جائے گی۔ دفعہ (۲۳۰) شق (۳)۔ کاؤنسل کی آخری رپورٹ موصول کے دو سال کے اندر اندر قومی اور صوبائی اسمبلیاں ان قوانین کو کاؤنسل کے مشورے کے مطابق بنانے کی پابند ہوں گی۔ دفعہ (۲۳۰) شق (۴)

(۶) وہ دفعہ حذف کر دی گئی جس کے بموجب معیشت کی بنیاد اسلامی سوشلزم قرار پائی تھی۔

(۷) مارشل لا کے دور کے قوانین دو تا ڈھائی سال کے اندر بنیادی حقوق کے مطابق کر دیئے جائیں گے وگرنہ انہیں عدالت میں چیلنج کیا جا سکے گا۔ دفعہ (۸) شق (۴)

(۸) احتیاطی نظر بندی کے نظر ثانی بورڈ کے ممبران کی تقرری کا اختیار وفاقی حکومت کے بجائے چیف جسٹس کو ہوگا۔ دفعہ (۱۰) شق (۴)۔ بورڈ کو اختیار ہوگا کہ وہ نظر بند کے خاندان کے لئے گزارہ الاؤنس مقرر کرے۔ دفعہ (۱۰) شق (۸)

(۹) اگر کوئی شخص مفاد عامہ کے خلاف سرگرمیوں کی بنیاد پر گرفتار کیا گیا تو ۲۴ ماہ میں نظر بندی کی مدت آٹھ ماہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ دفعہ (۱۰) شق (۷)

(۱۰) جائیداد کو بلا معاوضہ یا بامعاوضہ حاصل کرنے والے قانون کو کسی شخص کو نشانہ ستم بنانے کے لئے استعمال نہیں کیا جائے گا۔

(۱۱) صدر مملکت لازماً مسلمان ہوگا۔ دفعہ (۴۱) شق (۲)

(۱۲) عدم اعتماد کی تحریک پیش ہونے پر وزیر اعظم (یا وزیر اعلیٰ) کو اسمبلی توڑنے کا اختیار نہ ہوگا۔ دفعہ (۵۸) اور دفعہ (۱۱۲)

(۱۳) بجٹ سادہ اکثریت سے منظور ہو سکے گا۔

(۱۴) وزیر اعظم کے خلاف تحریک عدم اعتماد کے لئے دو تہائی اکثریت کی شرط پندرہ سال کے بجائے صرف دس سال کے لئے ہوگی۔ دفعہ (۹۶) شق (۵)

(۱۵) تین سال کے اندر اندر عدلیہ کو انتظامیہ سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔

(۱۶) سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کی برطرفی کا اختیار اسمبلی کے بجائے حسب سابق سپریم

Marfat.com

جوڈیشنل کاؤنسل کو ہوگا۔ دفعہ (۲۰۹) شق (۵) (۶) اور (۷)

(۱۷) خصوصی عدالتوں اور ٹریبونلوں کے فیصلوں کے خلاف قانونی نکات پر سپریم کورٹ میں اپیل کی جا سکے گی۔ دفعہ (۲۱۲) شق (۳)۔ کسی صورت میں بھی سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کی تنخواہوں میں کمی نہ کی جا سکے گی۔

(۱۸) افواج میں کمیشن وزیر اعظم کے بجائے صدر مملکت کے نام پر دیا جائے گا۔ دفعہ (۲۴۳) شق (۲۔ب)

متحدہ جمہوری محاذ کی مندرجہ ذیل ترمیمیں قبول نہیں کی گئیں۔

(۱) کسی قانون کے قرآن و سنّت کے منافی ہونے کا فیصلہ عدلیہ کرے گی۔

(۲) کسی کی جائیداد پر بلا معاوضہ قبضہ نہیں کیا جائے گا۔

(۳) ہنگامی حالت کا اعلان حالت جنگ کے بغیر نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی حالت جنگ کے بغیر بنیادی حقوق معطل کئے جائیں گے۔

(۴) بغیر مقدمہ چلائے کسی کو نظر بند نہیں کیا جائے گا۔

(۵) ہر شہری کو ملازمت، خوراک، کپڑا، مکان، تعلیم اور طبی امداد کی فراہمی کی حکومت ذمہ دار ہوگی۔

(۶) پریس کو آزادی دی جائے گی۔

(۷) وزیر اعظم کو اسمبلی کو توڑنے کا اختیار نہ ہوگا۔

(۸) تمام غیر ملکی معاہدے جن میں غیر ملکی قرضے اور امداد بھی شامل ہیں، واجب العمل ہونے سے پہلے منظوری کے لئے اسمبلی میں پیش کئے جائیں گے۔

(۹) ریاست کے تمام اداروں یا ان تنظیموں کو جن پر اکثریتی ملکیت ریاست کی ہو، ایوان بالا اور ایوان زیریں کی کمیٹی کی نگرانی اور احتساب تلے رکھا جائے گا اور ایسے اداروں کا بجٹ قومی اسمبلی میں پیش ہوگا۔

(۱۰) انتظامیہ کے سربراہ یعنی وزیر اعظم پر پارلیمنٹ کا کنٹرول اور بالادستی قائم کی جائے گی۔

(۱۱) چیف جسٹس کا تقرر (وزیر اعظم کے بجائے) صدر مملکت کی مرضی سے ہوگا۔ وزیر اعظم یا وزیر قانون زیادہ سے زیادہ مشورہ دینے کے مجاز ہوں گے۔

Marfat.com

(۱۲) عدالتوں پر انتظامیہ کے بجائے سپریم کورٹ کا کنٹرول ہوگا۔

(۱۳) چیف الیکشن کمشنر کا تقرر صدر مملکت (وزیراعظم کے بجائے) اپنی صوابدید سے کریں گے۔

(۱۴) انتخابات عدالتی حکام کی نگرانی میں کرائے جائیں گے اور کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کے بجائے ججوں کو ریٹرننگ افسر بنایا جائے گا۔

(۱۵) جماعتوں کی بنیاد پر (یعنی متناسب نمائندگی کے اصول پر) انتخابات کا طریقہ اختیار کیا جائے گا جس کا وعدہ حکمراں جماعت کے منشور میں کیا گیا ہے۔

(۱۶) انتخابات سے پہلے نگراں حکومت قائم کی جائے گی۔

(۱۷) رائے دہندگی کی عمر ۲۱ سال کے بجائے ۱۸ سال ہوگی۔

(۱۸) مسلح افواج کی شکایات کے ازالے کے لئے مسلح افواج کا کمیشن بنایا جائے گا

۱۹۔ سرکاری ملازمین کو اپنی ملازمتوں کے لئے آئینی تحفظ دیا جائے گا۔

۲۰۔ صوبائی حکومتوں کو مرکز کی مداخلت کے خلاف مناسب تحفظ دیا جائے گا۔ اسے ہنگامی حالت کے لبادے میں ختم نہ کیا جا سکے گا۔

۲۱۔ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء سے ۲۰ اپریل ۱۹۷۲ء کے دوران مارشل لاء کے قوانین اور ان کے تحت کئے گئے کاموں کو جو آئینی تحفظ فراہم کیا گیا ہے اسے حذف کردیا جائے گا۔

۲۲۔ بہاولپور کے مسئلے کو وہاں کے باشندوں کی مرضی کے مطابق حل کیا جائے گا۔

اس امر کے باوجود کہ مندرجہ بالا ترمیمات حکومت نے قبول نہ کیں، حزب اختلاف نے آئین کا خیر مقدم کیا۔ اس کا خیر مقدم اس بنا پر کیا گیا تھا کہ حزب اختلاف چاہتی تھی کہ ملک عبوری آئین سے نجات پائے اور ہنگامی حالت کا، جو جنگ ختم ہونے کے بعد بھی گزشتہ ۱۵ سال سے مسلط چلی آرہی تھی، خاتمہ ہو۔ مگر وائے افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ حکومت نے ۱۲ اپریل ۱۹۷۳ء کو اسے منظور کر لینے کے باوجود اس کا نفاذ ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء تک التوا میں رکھا۔ ۱۴ اگست کو اسے نافذ کیا اور دوسرے دن پھر سے ہنگامی حالت کا اعلان کردیا جس کی وجہ سے بنیادی حقوق معطل ہو گئے اور اس سے جو فوائد متوقع تھے وہ حاصل نہ ہو سکے۔ بھٹو حکومت پہلے دن سے مطلق العنانی کی جس روش پر قائم چلی آرہی تھی، بدستور قائم رہی۔ اس دوران وہ مسئلے جو پہلے سے موجود چلے آرہے

Marfat.com

تھے زیادہ سنگین ہو گئے اور انہیں حل کرنا سب سے ترجیحی مسئلہ بن گیا۔ ان میں سب سے اہم مسئلہ بلوچستان اور سرحد میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کی حکومت کی بحالی کا تھا۔

آئین میں پے در پے ترامیم — آئینی مفاہمت کے ساتھ بدعہدی

آئین بنے ابھی ایک سال کا بھی عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس میں پے در پے ترمیمات کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ مئی ۱۹۷۴ء سے ستمبر ۱۹۷۶ء کے مختصر سے عرصے میں پانچ مرتبہ اسے ترمیمات کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ طرزِ عمل قانوناً جائز سہی مگر اخلاقاً سخت قابل اعتراض تھا کیونکہ یہ آئین حکمراں جماعت اور حزب اختلاف کے مابین باہمی افہام و تفہیم کے نتیجے میں تیار ہوا تھا اس لئے اصلاً اس کی حیثیت ایک دستاویزِ معاہدہ کی تھی۔ حزب اختلاف کو اعتماد میں لئے بغیر اس میں کسی قسم کی ترمیم کرنا ویسا ہی تھا جیسے کوئی فریق معاہدے کی دستاویز کی خلاف ورزی کرے اس لئے حکمراں جماعت کا کم سے کم انہیں اپنی میعاد حکمرانی کے دوران اس میں یکطرفہ طور پر کسی قسم کی ترمیم لانا اخلاقاً بڑی بدعہدی کی بات تھی مگر اس کا ضمیر اس احساس سے عاری رہا۔

محولہ بالا ترمیموں میں سے پانچویں مرتبہ کی ترمیم نہایت دور رس مضمرات کی حامل تھی اس لئے اس کے منظور کئے جانے پر ملک بھر میں ہلچل سی مچ گئی۔

یہ ترمیم دستور کی دفعہ ۱۹۹ میں کی گئی جو عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) کے دائرہ اختیار

Marfat.com

(JURISDICTION) سے متعلق تھی۔

اس دفعہ میں ترمیمات کے ذریعے عدالت عالیہ کے اختیارات میں جو پہلے ہی مطلوبہ اور مروجہ مقدار سے کم تھے، مزید کمی کر دی گئی اور اس قدر کمی کر دی گئی کہ عدالت عالیہ شہریوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ کرنے سے معذور ہو گئی۔ اس ترمیم کے خاص خاص نکات یہ تھے:

۱۔ امتناعی نظر بندی (PREVENTIVE DETENTION)، خواہ وہ کسی قانون کے تحت عمل میں آئی ہو، عدالت عالیہ اس نظر بندی کے حکم کو معطل کرنے کی مجاز نہ ہو گی۔

۲۔ امتناعی نظر بندی کے کسی قانون کے تحت گرفتار کئے جانے والے کسی فرد کو عدالت عالیہ ضمانت پر رہا نہ کر سکے گی۔

۳۔ کسی شہری کو جس کے خلاف کسی بھی جرم میں اور کسی بھی تھانے میں مقدمہ درج کر لیا گیا ہو یا اس کے خلاف کسی عدالت یا ٹربیونل میں شکایت دائر کر دی گئی ہو عدالت عالیہ ضمانت پر رہا نہیں کر سکے گی اور نہ کوئی عبوری حکم جاری کر سکے گی۔

۴۔ عدالت عالیہ کوئی ایسا حکم بھی نہیں جاری کر سکے گی جو پولیس کو مقدمہ دائر کرنے سے روک دے۔

۵۔ ایمرجنسی کے تحت جس قدر قوانین بنے ہیں ان کو اعلیٰ عدالتوں میں چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔

ان ترمیمات کے ذریعے اصلی کلہاڑا عدالتوں کی گردن پر نہیں چلایا گیا بلکہ شہریوں کے بنیادی حقوق کی گردن پر چلایا گیا حالانکہ شہریوں کے بنیادی حقوق یعنی جان و مال، عزت و آبرو، نقل و حرکت، اجتماع اور اظہار خیال کی آزادی کو دنیا بھر کے تمام دساتیر میں سب سے زیادہ تقدس اور تقدم حاصل ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے دساتیر میں یہ صراحت لکھا ہوتا ہے اور خود پاکستان کے دستور کی دفعہ (۸) شق (۱) میں بہ وضاحت مرقوم ہے کہ کوئی قانون جو بنیادی حقوق کے منافی ہو گا، کالعدم سمجھا جائے گا۔ مگر حکمران جماعت نے اس کی مطلقاً پرواہ نہ کی۔ اس نے بنیادی حقوق پر پہلا وار تو امتناعی نظر بندی کے قوانین، دستور میں شامل کر کے کیا جو دفعہ (۱۰) کی شق (۳) اور (۴) میں مرقوم ہیں، دوسرا وار ہنگامی حالت کے اعلان کی شکل میں کیا گیا کیونکہ اس کے ذریعے بنیادی حقوق قانوناً معطل ہو جاتے ہیں اور اس دوران ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتاریوں اور نظر بندیوں کی گنجائش قانوناً نکل آتی ہے اور تیسرا وار عدالت عالیہ کے اختیارات میں تخفیف کی صورت میں کیا گیا۔

Marfat.com

عدالت عالیہ کے اختیارات میں محولہ بالا تخفیف کا، جو آئین کی دفعہ ۱۹۹ میں ترمیمات کے ذریعے کی گئی پس منظر یہ تھا کہ امتناعی نظر بندی کے عام قانون اور ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتاری کے اختیار کو حکومت نے نہایت بے جا اور غیر منصفانہ طریقے پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ان قوانین کے ذریعے حزب اختلاف کو کچلنا چاہتی تھی۔ مظلومین نے اپنے بنیادی حقوق کے تحفظ کے لئے عدالتوں سے رجوع کرنا شروع کر دیا اور عدالتوں نے جہاں کہیں نظر بندی کے ان قوانین کو بے جا طور پر استعمال ہوتے دیکھا، عبوری احکامات جاری کر کے گرفتار شدگان کو رہا کرا دیا۔ عبوری احکامات رہائی کے نتیجے میں بہت سے ایسے لوگ جو حکومت کے خاص طور پر مشق ناز تھے رہا ہو گئے، مثلاً چوہدری ظہور الٰہی، ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی، جناب الطاف حسن قریشی، جناب حنیف رامے، راجہ منور اور جناب خاکوانی وغیرہ۔ حکومت کو اعلیٰ عدالتوں کی یہ جسارت بہت ناگوار گزری لہذا وزیر اعظم بھٹو نے طے کیا کہ اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات میں تخفیف کر دی جائے اور کسی گرفتار شدہ شہری کی رہائی کے لئے عبوری حکم جاری کرنے کا اختیار اس سے سلب کر لیا جائے۔

حکومت آئین میں محولہ بالا ترمیمات کو روبہ عمل لانے کے لئے اس قدر بے تاب تھی کہ اسے اسمبلی سے بعجلت منظور کرانے کے لئے اس نے مروجہ پارلیمانی قاعدوں اور ضابطوں کو پامال کرنے میں بھی عار محسوس نہ کیا۔ اس صورت حال کی واقعہ نگاری جناب الطاف حسن قریشی نے بڑے جامع الفاظ میں کی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں کہ[۱]

" (محولہ بالا ترمیمات کے لئے) ہماری حکومت نے جو طریقہ اختیار کیا وہ شکوک و شبہات سے اٹا ہوا تھا۔ قومی اسمبلی کا اجلاس ایک ماہ سے جاری تھا مگر اس طویل عرصے میں حکومت نے کانوں کان کسی کو خبر نہ ہونے دی کہ وہ اجلاس رواں میں آئین کا ڈھانچہ بدل دینا چاہتی ہے۔ اگست کے آخر میں رمضان کا مہینہ شروع ہوا اور اپوزیشن کے بیشتر اراکین اپنے گھروں کو چلے گئے۔ پھر اچانک ۳۱ اگست کی رات کو ترمیمی بل کا مسودہ قومی اسمبلی کے اراکین میں تقسیم کیا گیا اور یکم ستمبر کو وہ بل قومی اسمبلی میں باقاعدہ

---

[۱] تفصیلی مطالعے کے لئے ملاحظہ ہو فاضل مصنف کا رقم کردہ کتابچہ "بھٹو کا عہد ستم" صفحات ۲۳ تا ۴۲ شائع کردہ مکتبہ اردو ڈائجسٹ۔ لاہور

Marfat.com

طور پر پیش ہوا۔ اپوزیشن کے ایک ہی قابلِ ذکر مقرر مولانا ازہری موجود تھے۔ انہوں نے اپنی بساط کی حد تک اس برق رفتاری کی مخالفت کی اور اس بل کو رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے مشتہر کئے جانے کا مطالبہ کیا۔ مگر ہر معقول تجویز بے رحمی سے مسترد کر دی گئی۔ آئین میں یہ واضح طور پر درج ہے کہ ہر ترمیمی بل کو ایک کمیٹی کے سپرد ہونا چاہیئے اور اس کی سفارشات کے ساتھ ایوان ترمیمی بل کی دفعات پر بحث کر سکتا ہے۔ اس طریقہ کار میں کچھ وقت لگ جانے کا احتمال تھا اور غالباً حکومت خفیہ مقاصد کے لئے دستور میں فوری ترمیم چاہتی تھی۔ چنانچہ سرکاری بنچوں کی طرف سے یہ تحریک پیش ہوئی کہ آئین کی یہ دفعہ معطل کر دی جائے۔ بے پناہ اکثریت کا حامل ہونے کی بنا پر حکومت کی یہ تحریک منظور ہو گئی اور ترمیمی بل پر ایوان میں بحث کا آغاز ہو گیا۔"

" وزیر قانون (ملک محمد اختر) جوشِ وفاداری میں یہ بل چشم زدن میں منظور کرا لینا چاہتے تھے مگر جناب عبدالحفیظ پیرزادہ نے اوپر کا اشارہ پا کر مداخلت کی اور بل پر غور و خوض دو روز کے لئے ملتوی کرا دیا۔

۴ ستمبر کو جمعہ تھا۔ قومی اسمبلی نے بل پر باقاعدہ بحث شروع کی۔ اپوزیشن کے مقتدر رہنما اسلام آباد پہنچ گئے تھے مگر ان کو تیاری کے لئے مناسب وقت میسر نہ آیا تھا۔ انہوں نے کچھ اور مہلت دینے کی استدعا کی مگر اقتدار کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ خود وزیر اعظم بھٹو بہ نفس نفیس ایوان میں موجود تھے اور جناب حفیظ پیرزادہ کو بطور خاص اس موقع کے لئے تیار کیا گیا تھا...... اتوار کے دن قومی اسمبلی کی چھٹی ہوتی ہے مگر غیر معمولی عجلت سے کام لیتے ہوئے اس روز بھی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا گیا اور ترمیمی بل منظور کر لیا گیا۔"

محولہ بالا ترمیمی بل کو منظور کرانے کے لئے اسمبلی کے احاطے میں دہشت کی فضا پیدا کی گئی اور حزب اختلاف کے ارکان کو جن میں مفتی محمود کی ذات گرامی بھی شامل تھی، فیڈرل سیکیورٹی فورس کے کارندوں کے ذریعے ڈنڈا ڈولی کے طریقے پر اسمبلی کے ایوان سے زبردستی اٹھا کر اسمبلی کی عمارت سے باہر سڑک کی دوسری جانب پھینک دیا گیا۔ حزب اختلاف کے ساتھ ایسی شرمناک نظیر مشکل سے ہی کہیں ملے گی۔

اس قانون کو اس قدر عجلت کے ساتھ منظور کرانے کی وجہ کیا تھی؟ یہ سطور بالا میں بیان کی

Marfat.com

جاچکی ہے۔ حکومت اپنے مخالفین کو، جنہیں وہ امتناعی نظر بندی کے قوانین کے تحت گرفتار کرتی چلی آرہی تھی اور جنہیں اسی قانون کے ذریعے آئندہ بھی پامال کئے رکھنا چاہتی تھی وہ اعلیٰ عدالتوں کے عبوری احکامات کے ذریعے رہا ہونے لگے تھے۔ حکومت کو عدالتوں کی یہ جرأت مندی گوارا نہ تھی لہٰذا آئین میں ترمیم کرکے عدالتوں کے اختیارات میں تخفیف کردی گئی۔ اس ترمیم کے مضمرات کیا رہے؟ اسے بھی آپ جناب الطاف حسن قریشی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

"ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت دو قسم کے اقدامات کئے جاسکتے ہیں۔ امتناعی نظر بندی یا کسی جرم کے تحت مقدمے میں گرفتاری۔ امتناعی نظر بندی کے سلسلے میں اب یہ ترمیم ہوئی ہے کہ عدالت عالیہ اب گرفتاری سے پہلے ضمانت لے سکتی ہے اور نہ گرفتاری کے بعد۔ اگر حکومت اپنے کسی سیاسی مخالف کو امتناعی نظر بندی کے تحت گرفتار کرلے تو خاصی مدت تک کوئی عدالت دخل نہیں دے سکتی خواہ حکومت کا یہ اقدام کھلی بدنیتی پر مبنی ہو۔

ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت مقدمے کے اندراج کی صورت میں اعلیٰ عدالتیں کچھ اور بے بس کردی گئی ہیں۔ کسی تھانے میں کسی جرم کے تحت جونہی مقدمہ درج ہوا، عدالت عالیہ کا دائرہ اختیار ختم یا محدود ہوگیا۔ اس مقدمے میں اعلیٰ عدالتیں ضمانت نہ لے سکیں گی اور نہ مقدمے کے بارے میں کوئی عبوری حکم جاری کرسکیں گی اور نہ پولیس کو مقدمہ درج کرنے سے روک سکیں گی خواہ یہ کتنا ہی واضح ہو کہ وہ مقدمہ ذاتی انتقام یا اختیارات کے ناجائز استعمال کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے"۔

"ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت جوں ہی کوئی مقدمہ خصوصی ٹریبونل کے زیر تصرف آجائے گا، اس کے بعد اعلیٰ عدالتیں اس ٹریبونل کی کارروائی، احکام اور فیصلوں میں مداخلت نہ کرسکیں گی چاہے ٹریبونل کو مقدمہ سننے کا اختیار ہی نہ ہو، خواہ ٹریبونل قانون کی غلط تعبیر اور اطلاق کر رہا ہو۔ ہاں آخری سزا سنانے کے بعد ہائی کورٹ میں اپیل کی جاسکتی ہے"۔

"اس نئے طریقہ کار کے تحت کسی شہری کو بڑی آسانی سے ڈیڑھ دو سال کے لئے جیل میں رکھا جاسکتا ہے۔ پہلے، سماعت پر آٹھ دس ماہ لگ جائیں گے۔ اس کے بعد ہائی کورٹ میں اپیل داخل ہونے تک پانچ چھ ماہ اور گزر جائیں گے اور کچھ وقت اپیل کی سماعت اور فیصلے میں بھی صرف ہوگا"۔

Marfat.com

جناب الطاف حسن قریشی نے یہ مضمون ایسے زمانے میں قلمبند کیا جو بھٹو کے بدترین جبروت اور استبداد کا دور تھا۔ اگر اس میں ایک جملہ بھی خلاف واقعہ ہوتا تو وہ ،جو پہلے سے ستم کا نشانہ بنتے آ رہے تھے، ان کے غضب کا نشانہ بننے سے بچ نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا بھٹو دورِ حکومت میں اس مضمون کی اشاعت بجائے خود اس کے مندرجات کی صحت و واقعیت کا کافی ثبوت ہے۔ اس لئے مذکورہ آئینی ترامیم پر مزید تبصرے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ جناب الطاف قریشی نے اپنے اس مضمون میں حکمراں جماعت کو اس انسان کش اقدام کے عواقب سے بھی متنبہ کیا تھا جو ایک الہامی حقیقت کی طرح درست ثابت ہوا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ :

"کیا معلوم وہ وفاقی وزراء جنہیں آج اپنے یا اپنے آقا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، کل (خود اپنی) ضمانت قبل از گرفتاری کے لئے عدالت عالیہ کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہوں۔ دن تو بدلتے رہتے ہیں۔"

ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ چشمِ فلک نے اور وطن عزیز کے کروڑوں باشندوں نے یہ عبرتناک منظر دیکھا کہ مذکورہ ترمیمات کو اسمبلی سے منظور کرانے اور کرنے والے افراد خود اپنے ہی منظور کئے ہوئے ترمیمی قانون کے شکنجے میں کسے گئے اور اس سے نکلنے کے لئے وہ عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹاتے نظر آئے۔

۱۹۷۷ء کے عام انتخابات اور بھٹو کے خلاف عوامی تحریک کا آغاز

ان اقدامات کے ذریعے جن کا گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے حزبِ اختلاف پوری طرح بھٹو صاحب کے شکنجے میں جکڑ گئی۔ دفعہ ۱۴۴ کے ذریعے جلوسوں اور جلسوں پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔ امتناعی نظربندی کے قوانین کے ذریعے جیل کے دروازے ان پر وا کر دیئے گئے اور عدالتوں کے اختیارات میں تخفیف کر کے، جیل سے باہر نکلنے کا راستہ ان پر بند کر دیا گیا۔ ان اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ متبادل قیادت ملک سے ناپید ہو گئی اور عوام بھٹو صاحب کو ملک کی ناگزیر برائی سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔

جب یہ صورت حال حسب منشاء پیدا ہو گئی تو انہوں نے ۷ جنوری ۱۹۷۷ء کو لیکا یک عام انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا حالانکہ خود ان کے اپنے بنائے ہوئے آئین کے بموجب اسمبلی کی میعاد اگست تک تھی۔ مہینوں پہلے انتخابات منعقد کرانے میں مصلحت یہ مضمر تھی کہ انہوں نے حزب اختلاف کو مکمل طور پر بے دست و پا کر کے خود کو واحد مرد میدان بنا لیا تھا۔ انتخابات جیتنے کے لئے حالات ان کے حق میں اس قدر موافق اور سازگار ہو چکے تھے کہ اسے ان ہی ایام میں منعقد کرانا، اسے میعاد اقتدار کی آخری مدت تک لے جانے سے بدرجہا محفوظ تر تھا لہٰذا انہوں نے انتخابات کے لئے ۷ مارچ کی تاریخ مقرر کر دی۔

مذکورہ اعلان اس قدر لیکایک تھا کہ حزب اختلاف کی سیاسی جماعتوں کے پاس تیاری کے لئے صرف دو ماہ کی مختصر سی مدت رہ گئی مگر حزب اختلاف کی جماعتوں نے جب تیاری شروع کی تو بھٹو صاحب اسے دیکھ کر سخت دہشت زدہ رہ گئے۔ (تقریباً) تمام جماعتیں ۲۴ گھنٹے کے اندر بالکل خلاف توقع طور پر، متحد ہو گئیں اور ان سب نے پاکستان قومی اتحاد کے نام سے اپنا ایک متحدہ محاذ بنا لیا۔ اس اتحاد کے قیام سے قوم کو بھٹو صاحب کے مقابلے پر ایک مضبوط متبادل قیادت میسر آ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہفتوں میں پوری قوم اس اتحاد کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی۔ قومی اتحاد کے دو ماہ کا یہ پورا عرصہ ملک بھر میں عدیم النظیر جلسوں اور جلوسوں کے انعقاد میں گزرا۔ قومی اتحاد کے رہنماؤں کی قیادت میں اتنے بڑے بڑے جلوس نکالے گئے اور اتنے بڑے بڑے جلسے کئے گئے کہ ماضی میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ حزب اختلاف کی اس غیر متوقع کامیابی نے بھٹو صاحب کی راتوں کی نیند اڑا دی۔ منصفانہ انتخابات کے ذریعے دوبارہ منتخب ہونے کا یقین اب خواب و خیال نظر آنے لگا۔ ناچار انہوں نے دھاندلی کے ذریعے انتخابات جیتنے کا منصوبہ تیار کیا اور ۷ مارچ کو اس منصوبے پر پوری تن دہی کے ساتھ عمل کیا گیا۔ دھاندلی کے جو خاص خاص طریقے استعمال کئے گئے وہ یہ تھے:

۱۔ تمام اضلاع کے کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کو ان کے ماتحت اضلاع سے متعینہ تعداد میں پیپلز پارٹی کے امیدواروں کو منتخب کرانے کے لئے کوٹہ مقرر کر دیا گیا۔

۲۔ بہت سی نشستوں پر قومی اتحاد کے امیدواروں کو کاغذات نامزدگی داخل کرنے کا موقع

Marfat.com

نہیں دیا گیا۔ بھٹو صاحب نے خود اپنی نشست پر بھی ایسا ہی طرزِ عمل اختیار کیا۔ ان کے حریف مولانا جان محمد عباسی کو اغوا کر لیا گیا اور کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی تاریخ تک حبسِ بے جا میں رکھا گیا۔ جس کی وجہ سے ان کے واحد حریف کاغذات نامزدگی داخل کرنے سے محروم ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے خود کو بلا مقابلہ منتخب کرا لیا۔ یہی پالیسی پنجاب اور سندھ کے وزراء اعلیٰ کو بلا مقابلہ منتخب کرانے کے لئے ان کے حریفوں کے ساتھ اختیار کی گئی۔

۳۔ بیلٹ پیپر چھپنے کے بعد بڑی تعداد میں پولیس سے غائب کر دیئے گئے اور پولنگ کے دن پیپلز پارٹی کے امیدواروں کے حق میں نشانات لگا کر انہیں تھوک کے حساب سے ڈبوں میں ڈالا گیا۔

۴۔ بعض پولنگ اسٹیشنوں پر پولنگ کے دوران چائے کا وقفہ کر کے قومی اتحاد کے پولنگ ایجنٹوں کو پولنگ کے کمرے سے باہر کر دیا گیا اور ان کی عدم موجودگی میں پیپلز پارٹی کے امیدوارں کے حق میں ووٹ ڈال دیئے گئے۔

۵۔ پولنگ افسروں سے بیلٹ پیپر اور نشان لگانے والی مہر چھین لی گئی اور ان پر پیپلز پارٹی کے امیدواروں کے حق میں نشانات لگا کر ڈبوں میں ڈالے گئے۔

۶۔ کئی پولنگ اسٹیشنوں پر جہاں قومی اتحاد کی کامیابی کا یقین تھا، سرے سے پولنگ کرائی ہی نہیں گئی۔ اس کے بغیر پیپلز پارٹی کے امیدواروں کی کامیابی کا اعلان کر دیا گیا۔

۷۔ خواتین کے پولنگ اسٹیشنوں میں سے بہت سی جگہوں پر قومی اتحاد کی ایجنٹ خواتین کو باہر نکال دیا گیا۔

۸۔ قومی اتحاد کے امیدواروں کے ووٹ ڈبوں سے نکال کر جلا دیئے گئے۔

۹۔ جہاں کہیں ممکن ہوا ووٹوں کی گنتیاں بدل دی گئیں اور ٹیلی ویژن و ریڈیو پر پیپلز پارٹی کے ہارے ہوئے امیدواروں کی کامیابی کا اعلان کر دیا گیا۔

اسی طرح سے جہاں جو غلط طریقہ فائدہ مند نظر آیا اسے بلا تکلف استعمال کیا گیا۔ ان سب مذموم کوششوں کے ذریعے اکثر نشستوں پر پیپلز پارٹی کی کامیابی کا اعلان کر دیا گیا۔

حکومت جیتنے کو تو جیت گئی مگر اس نوع کی خود ساختہ کامیابی پر وہ خود بہت سراسیمہ ہوئی کیونکہ اسے پہلے سے بھرے ہوئے عوام کے غیض و غضب کا نشانہ بننے کا اندیشہ نظر آنے لگا لہٰذا اس

Marfat.com

نے دوسرے دن سے ملک بھر میں پھر سے دفعہ ۱۴۴ لگادی حالانکہ جیتنے والی پارٹی دوسرے دن اپنی کامیابی کا جشن منایا کرتی ہے۔

اس نوع کے انتخابات کے خلاف شدید ترین قسم کا غم وغصہ پیدا ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام نے قومی اتحاد کی ہدایت پر صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا جو ۱۰ مارچ کو ہونے والے تھے، بائیکاٹ کردیا۔ یہ بائیکاٹ اس قدر مکمل اور کامیاب تھا کہ پولنگ اسٹیشنوں پر اس روز دھول اڑتی نظر آتی۔ پیپلز پارٹی تنہا امیدوار رہ گئی تھی مگر اسے اتنے آدمی بھی میسر نہ آرہے تھے جو قابلِ ذکر تعداد میں ووٹوں کی پرچیاں اس کے ڈبوں میں ڈال سکیں۔ ناچار اس موقع پر بھی پیپلز پارٹی نے جعلی ووٹ اپنے ڈبوں میں ڈلوائے۔

اس جعلی کامیابی کے خلاف اپنے تنفر کا اظہار کرنے کے لئے عوام نے ۱۱ مارچ کو ملک بھر میں مکمل ہڑتال کی۔ قومی اتحاد نے الیکشن کمشنر جناب (جسٹس) سجاد احمد جان سے مطالبہ کیا کہ وہ انتخابات کے جعلی نتائج کو کالعدم قرار دے کر دوبارہ انتخابات کرائیں۔ مگر انہوں نے اس مطالبے کو ماننے سے انکار کردیا۔ انتخابی نتائج کو کالعدم قرار دلانے کے لئے" ۱۴ مارچ سے ملک بھر میں عوامی تحریک شروع کردی گئی۔ کراچی، حیدرآباد، لاہور، ملتان، فیصل آباد، کوئٹہ، پشاور غرضیکہ جگہ جگہ قومی اتحاد کے زیر قیادت بڑے بڑے جلوس نکالے گئے مگر "حکومت" یا الیکشن کمیشن نے اس تحریک کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ حکومت نے اس تحریک کو کچلنے کے لئے پولیس فورس اور ایف۔ ایس۔ ایف استعمال کی اور چیف الیکشن کمشنر نے ۲۱ اور ۲۲ مارچ کی درمیانی رات کو جعلی انتخابات کے نتائج جاری کردیئے۔

قومی اتحاد کے صدر جناب مفتی محمود نے صدر مملکت جناب فضل الٰہی چوہدری کو ایک طویل مکتوب ارسال کیا جس میں انتخابات کی دھاندلیوں کی نشاندہی کی گئی اور ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے اختیار خاص کو استعمال کرکے انتخابی نتائج کو کالعدم قرار دے دیں مگر صدر مملکت نے اس استدعا کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ اس کے برعکس انہوں نے قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا اور بھٹو صاحب کو وزارت سازی کی دعوت دے دی۔

قبل ازیں بھٹو صاحب نے ۱۲ مارچ کو ایک نشری تقریر کی جس میں انہوں نے دوبارہ انتخابات

Marfat.com

کے مطالبے کو مسترد کر دیا اور کہا کہ "یہ ایک طے شدہ معاملہ ہے اور ناقابلِ گفت و شنید ہے"۔ تاہم انہوں نے قومی اتحاد کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اپنے حصے کی کچھ نشستوں کی پیشکش بھی کی۔

قومی اتحاد نے یہ پیش کش پائے حقارت سے ٹھکرا دی اور اپنی جیتی ہوئی نشستوں پر سے بھی اپنے منتخب امیدواروں سے بطور احتجاج استعفیٰ دلوا دیا۔ اس لئے قومی اسمبلی کا جو اجلاس ہوا اس میں تنہا پیپلز پارٹی کے امیدواروں نے شرکت کی۔

جب قومی اتحاد کے احتجاج کو پیہم نظر انداز کرتے ہوئے نوبت یہانتک پہنچا دی گئی کہ اسمبلی کا اجلاس بھی منعقد کر لیا گیا اور وزارت بھی بنالی گئی تو اتحاد نے تین مطالبات پیش کر دیئے جو یہ تھے کہ:

۱۔ بھٹو صاحب وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دیں۔

۲۔ چیف الیکشن کمشنر مستعفی ہوں اور

۳۔ فوج اور عدلیہ کی نگرانی میں از سر نو انتخابات کرائے جائیں۔

قومی اتحاد نے ان مطالبات کو منوانے کے لئے ملک گیر تحریک شروع کر دی۔ اس سہ نکاتی مطالبے نے اتنی ہمہ گیر مقبولیت حاصل کی کہ اسے روکنے کے لئے "حکومت" نے یکے بعد دیگرے ملک کے مختلف شہروں کو فوج کو حوالے کر دیا اور پاکستان قومی اتحاد کے اکابر کو گرفتار کر لیا جن میں جناب مفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خاں، جناب ایر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خاں، میاں طفیل محمد، پروفیسر غفور احمد، بیگم نسیم ولی، جناب شیر باز خاں مزاری اور سردار عبدالقیوم وغیرہ شامل تھے۔

کرفیو اور مارشل لا کے باوجود صورت حال معمول پر نہ لائی جاسکی کیونکہ قوم بھٹو صاحب کی زیادتیوں پر سخت بپھری ہوئی تھی۔ عوام کے پیش کردہ سہ نکاتی مطالبے کی طرف سے انکی بے التفاتی کی مدت جیوں جیوں دراز ہوتی گئی، عوام کا غیض و غضب بڑھتا گیا۔ حکومت نے اسے دبانے کے لئے لاٹھی چارج، شیلنگ اور فائرنگ کے حربے استعمال کئے جس سے ہر روز بڑی تعداد میں بے گناہ شہری ہلاک اور زخمی ہونے لگے۔ اس بے رحمانہ برتاؤ نے عوامی تحریک کو مزید جلا بخش دی اور صورت حال یہاں تک پہنچ گئی کہ اب مختلف طبقہ زندگی کے لوگوں کے جدا جدا جلوس نکلنے لگے عورتوں کے، بچوں کے، نابیناؤں کے، وکیلوں کے، طالبعلموں کے، غرضیکہ پوری قوم اس تحریک میں شریک ہوگئی۔

Marfat.com

جب حالات کسی طور پر بھی قابو میں آتے نظر نہ آئے تو بھٹو صاحب نے ۲۳ اپریل کو قومی اتحاد کے صدر جناب مفتی محمود سے جو ان دنوں سہالہ ریسٹ ہاؤس میں محبوس تھے، ملاقات کی اور انہیں مذاکرات کی پیش کش کی۔ مفتی محمود نے مذاکرات کی پیش کش کی منظوری کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا کہ وہ (بھٹو صاحب) سہ نکاتی مطالبے کو ماننے کا اعلان کریں۔ اس کے بعد اس کی تفصیلات طے کرنے کے لئے مذاکرات کئے جائیں گے مگر وہ اس شرط کو ماننے پر تیار نہ ہوئے۔

ادھر پاکستان سے باہر بھی، عالم اسلام میں پاکستان کے اس اندرونی بحران پر سخت تشویش محسوس کی جانے لگی۔ سعودی عرب، ابوظبی، لیبیا، کویت، مصر وغیرہ نے بہت تشویش کا اظہار کیا۔ فرمان روائے سعودی عرب شاہ خالد کی ہدایت پر پاکستان میں متعین سعودی سفیر فضیلت مآب ریاض الخطیب نے بھٹو صاحب اور مفتی محمود سے علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں کر کے انہیں مذاکرات پر آمادہ کیا۔ مفتی محمود صاحب سے انہوں نے یہ خواہش کی کہ وہ وزارت عظمیٰ کے عہدے سے بھٹو صاحب کی برطرفی کے مطالبے سے دست بردار ہو جائیں اور بھٹو صاحب سے انہوں نے یہ خواہش کی کہ وہ دوبارہ انتخابات کرانے اور الیکشن کمیشن کی تشکیل نو کے مطالبے کو تسلیم کر لیں۔

ان ہی دنوں دو واقعات نے انتخابی نتائج کی صحت و غیر جانبداری کے بارے میں حکومت کے تمام دعاوی کا قلعہ مسمار کر دیا۔ الیکشن کمیشن نے جب انتخابی بدعنوانیوں کی تحقیق شروع کی تو چوبیس حلقوں میں اتنی بڑی دھاندلیوں کا انکشاف ہوا کہ اس نے مزید اسی (۸۰) حلقوں کے انتخابی نتائج سربمہر کرا دیئے۔ حکومت الیکشن کمیشن کے اس اقدام سے بوکھلا گئی کیونکہ اس کی دھاندلیاں عیاں ہو گئی تھیں اور اسے اپنی "جیتی ہوئی" نشستیں بھی ہاتھ سے جاتی نظر آنے لگیں۔ حکومت کی گھبراہٹ کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے ۱۲ مئی کو وہ آرڈیننس واپس لے لیا جس کے بموجب الیکشن کمیشن کو انتخابی دھاندلیوں کے تکمیل ثبوت کی صورت میں انتخابی نتائج کو کالعدم کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ چیف الیکشن کمشنر نے ایک اخباری بیان میں جو سنسر شپ کی پابندیوں کی وجہ سے ماسوائے گرانی روزنامہ ملت کے کسی اخبار میں شائع نہ ہو سکا، انتخابی دھاندلیوں کا کھلے الفاظ میں اعتراف کر لیا اور رائے دی کہ دوبارہ انتخابات کرائے جائیں۔ انہوں نے اپنے بیان میں

کہا کہ :

" اتنی بڑی دھاندلی ہمارے تصور سے بالاتر ہے۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ انکوائری کی طوالت میں جانے کے بجائے نئے سرے سے انتخابات کرائے جائیں۔"

انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ نئے الیکشن کمیشن کا سربراہ بننا نہیں چاہتے تاہم اگلا الیکشن کمیشن ایسا ہو جسے اس قسم کی دھاندلیوں کے تدارک اور سدباب کے مکمل اختیارات حاصل ہوں اور جو مکمل طور پر بااختیار ادارہ ہو۔

ان دونوں واقعات نے دوبارہ انتخابات کے خلاف حکومت کے موقف کی کمر توڑ دی۔ اس پر زور عوامی تحریک کے دباؤ کی بنا پر جو بھٹو صاحب کے خلاف چل رہی تھی اور چیف الیکشن کمشنر کے مندرجہ بالا اقدام اور بیان کی بنا پر دوبارہ انتخابات کے انعقاد سے انکار کے موقف پر قائم رہنا بھٹو صاحب کے لئے بہت مشکل ہو گیا اور ان کے لئے فضیلت مآب سفیر سعودی عرب کا مشورہ ماننے کے علاوہ چارہ نہ رہا۔ ان حالات سے مجبور ہو کر بھٹو صاحب نے ایک بار پھر پاکستان قومی اتحاد سے رابطہ قائم کیا۔ اس کام کے لئے انہوں نے سردار عبدالقیوم خاں، سابق صدر آزاد جموں و کشمیر کو وسیلہ بنایا۔ انہیں ۱۹، مئی ۷۷ کو جیل سے رہا کیا گیا اور بھٹو صاحب نے انہیں اپنی سہ نکاتی پیشکش کے ساتھ قومی اتحاد کے اکابر کے پاس روانہ کیا کہ سردار عبدالقیوم انہیں بھٹو صاحب سے مصالحتی بات چیت پر آمادہ کریں۔ چار نکاتی پیشکش میں کہا گیا تھا کہ

(۱) قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے دوبارہ انتخابات کرائے جائیں گے۔

(۲) نئے الیکشن کمیشن کی تشکیل کی جائے گی جس کا ڈھانچہ پاکستان قومی اتحاد کی تجاویز کے مطابق ہوگا۔

(۳) چاروں صوبوں میں (وزارت کی جگہ پر) گورنر راج ہوگا۔ گورنروں کا تقرر قومی اتحاد کے مشورے سے کیا جائے گا۔

(۴) مرکز میں عبوری حکومت قائم کی جائے گی جس کے وزیراعظم بھٹو ہوں گے۔

سردار قیوم اس چار نکاتی پیشکش کو لے کر قومی اتحاد کے لیڈروں کے پاس گئے۔ انہوں نے جناب مفتی محمود، پروفیسر غفور احمد، مولانا شاہ احمد نورانی، جناب اصغر خاں وغیرہ سے جیلوں میں جا کر

Marfat.com

ملاقات کی اور بھٹو صاحب کی مذکورہ بالا پیش کش انہیں دکھائی۔ ان لیڈروں نے ان نکات پر مذاکرات کی پیشکش قبول کر لی۔

مذاکرات میں حصہ لینے کے لئے قومی اتحاد نے اپنے صدر جناب مفتی محمود، نوابزادہ نصراللہ خاں، اور پروفیسر غفور احمد کو نامزد کیا جبکہ بھٹو صاحب کی ٹیم میں جناب عبدالحفیظ پیرزادہ اور مولانا کوثر نیازی شریک ہوئے۔

مذاکرات ۳ جون سے شروع ہوئے مگر مذاکرات کی میز پر بھٹو صاحب نے مصالحتی فارمولے کا جو مسودہ پیش کیا وہ ان کی مذکورہ بالا چار نکاتی پیشکش سے یکسر مختلف تھا۔ چنانچہ قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم نے اسے مسترد کر دیا۔ اس طرح بات چیت میں تعطل پیدا ہو گیا۔ ناچار بھٹو آہستہ آہستہ اپنی چار نکاتی پیش کش کی طرف واپس آئے۔ انہیں ان کی پیش کش کی طرف واپس لانے کے لئے قومی اتحاد کی ٹیم کو مذاکرات کی میز پر نو مرتبہ بیٹھنا پڑا جب کہیں جا کے ۱۵ جون کو معاہدہ طے پایا۔ اس میں طے ہوا کہ:

۱۔ حکومت انتخابات کو کالعدم قرار دے کر قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ دے گی اور از سر نو انتخابات کرائے گی۔

۲۔ الیکشن کمیشن بھی توڑ دیا جائے گا۔ اس کی تشکیل نو قومی اتحاد کے مشورے سے عمل میں آئے گی۔ نئے انتخابات ۷ اکتوبر کو منعقد ہوں گے۔

اس معاہدے کو روبہ عمل لانے کے لئے طے ہوا کہ ایک عمل درآمد کاؤنسل قائم کی جائے گی جس میں فریقین کے پانچ پانچ نمائندے ہوں گے اور یہ ہر مسئلے میں اتفاق رائے سے فیصلہ کرے گی۔ ان کے مابین اگر کسی مسئلے میں اختلاف رائے ہوا تو سپریم کورٹ سے رجوع کیا جائے گا جو ۲۷ گھنٹے کے اندر اندر اپنا فیصلہ دے گی۔

قومی اتحاد کی مذاکراتی ٹیم اس مصالحتی فارمولے کو منظور کرانے کے لئے اپنی مرکزی کاؤنسل میں لے گئی۔ مرکزی کاؤنسل نے اس کی منظوری دے دی مگر اس بے اعتمادی کی بنا پر جو بھٹو صاحب کی ذات سے قدم قدم پر پیدا ہوتی چلی آ رہی تھی، اس نے اندیشہ محسوس کیا کہ آگے چل کر کسی بھی مرحلے پر بھٹو صاحب عمل درآمد کاؤنسل کے فیصلوں کے ساتھ بدعہدی کر سکتے ہیں کیونکہ اس کاؤنسل کو کوئی آئینی حیثیت نہیں دی گئی تھی۔ لہٰذا اتحاد کی مرکزی کاؤنسل نے اپنی منظوری کے

Marfat.com

ساتھ یہ شرط بھی عائد کر دی کہ ایک آئینی ترمیم کے ذریعے (جو غالباً بذریعہ آرڈیننس ہوتی) عمل درآمد کاؤنسل کو آئین کا حصہ بنایا جائے اور حکومت کو اس کے فیصلوں کا پابند بنایا جائے۔ بھٹو صاحب کے سامنے جب یہ شرط پیش کی گئی تو وہ بھڑک اٹھے کیونکہ وہ تو عمل درآمد کاؤنسل کو بااختیار انتظامی ادارہ بنانے پر بھی بہ دقّت تمام تیار ہوتے تھے ورنہ اسے وہ محض ایک مشاورتی ادارے کی حیثیت دینا چاہتے تھے جو انتخابات کے انعقاد میں محض اپنے مشورے پیش کرنے کی مجاز ہوتی، فیصلے کرنے اور اپنے فیصلوں کو نافذ کرانے کی مجاز نہ ہوتی۔ لہٰذا معاہدے میں طے کردہ اس کی بااختیار حیثیت کو جب آئینی تحفظ دینے کا مطالبہ کیا گیا تو وہ سیخ پا ہو گئے۔ انہوں نے ۳، اور ۴ جولائی کی درمیانی رات کو ایک پریس کانفرنس میں اس مطالبے پر سخت برہمی کا اظہار کیا اور یہ دھمکی دی کہ اب وہ بھی نئے مطالبات پیش کریں گے۔ اس سے یہ بات بالکل ثابت ہو گئی کہ ان کے بارے میں قومی اتحاد کی بدگمانی درست تھی کہ معاہدے سے انحراف کرنے کے لئے معاہدے میں گنجائش رکھنا چاہتے ہیں دریں حالات عمل درآمد کاؤنسل کو آئینی تحفظ نہیں ملا تو وہ آگے چل کر اسے ایک غیر موثر ادارہ بنا دیں گے۔ بھٹو صاحب کی محولہ بالا دھمکی نے مذاکرات کی تمام کامیابیوں پر پانی پھیر دیا۔ اور قوم ایک خطرناک موڑ پر پہنچ گئی۔

۱۹۷۷ء کا مارشل لا ـــــ ایک ناگزیر اقدام

اس دوران بھٹو کے دستِ راست غلام مصطفےٰ کھر نے راولپنڈی میں ایک جلوس نکالا جس کے شرکا بغیر کسی ضرورت اور جواز کے مسلّح تھے۔ اس مسلح جلوس کا مقصد عوام اور پاکستان قومی اتحاد کو خوفزدہ کرنا تھا تاکہ وہ مجوزہ عمل درآمد کاؤنسل کو آئینی تحفظ دینے کے مطالبے سے دستبردار ہو جائے یا بھٹو صاحب کے ارادوں کی راہ میں مزاحم نہ ہو۔ اس قسم کے جلوس ان ہی دنوں

Marfat.com

چند دیگر شہروں میں بھی نکالے گئے۔

باخبر حلقوں کو یہ خبر بھی ملی کہ بھٹو صاحب نے ملک بھر میں بڑے پیمانے پر خوں ریزی اور لوٹ مار کا پروگرام بنایا ہے۔ اسے روبہ عمل لانے کے لئے خود اپنی کابینہ کے بعض مقتدر وزراء کو قتل کرا کے اس کا الزام قومی اتحاد کے سر منڈھنے کی اسکیم ہے۔ یہ کام فیڈرل سیکورٹی فورس کے سادہ پوش کارندوں کے ذریعے انجام دیا جاتا اور پھر لاہور، کراچی، فیصل آباد، ملتان اور دیگر شہروں میں رات کے وقت بجلی بند کر کے بڑے بڑے بازاروں اور صرافہ کی دکانوں کو لوٹنے کے لئے فیڈرل سیکورٹی فورس کے کارندوں اور غنڈوں کو اذنِ عام ہوتا۔ اس طرح سراسیمگی اور لاقانونیت پیدا کر کے ملک بھر میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا جاتا۔

اس خون ریز منصوبے کی ایک جھلک ۳، اور ۴ جولائی کی درمیانی رات کو منعقد ہونے والی بھٹو صاحب کی کابینہ کی آخری میٹنگ میں بھی دیکھنے میں آئی جس میں مسلح افواج کے تینوں چیف آف اسٹاف بشمول جنرل ضیا الحق کی موجودگی میں پیپلز پارٹی کے وزیروں نے کھلم کھلا خوں ریزی کی باتیں کیں۔

مذاکرات کی ناکامی کے بعد قوم ایک نازک موڑ پر پہنچ گئی تھی۔ ایک طرف اقتدار پر ایک غیر منتخب حکومت قابض ہو گئی تھی اور دوسری طرف قوم اسے تسلیم کرنے پر راضی نہ تھی۔ محاذ آرائی کی اس کیفیت نے ملک کا امن و امان اور نظم و نسق درہم برہم کر دیا تھا۔ پہیہ جام ہڑتالیں ہونے لگی تھیں۔ کارخانے بند رہنے لگے تھے۔ تجارتی اور معاشی سرگرمیاں تعطل کا شکار ہو گئی تھیں۔ اسکول کالج بند ہو گئے تھے۔ ملک کو اس بحران سے نکالنے کا کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ ایسی صورت حال میں فوج کی مداخلت ناگزیر بن گئی۔

فوج نے بھی صورت حال کو محسوس کیا اور ۴ اور ۵ جولائی کی درمیانی رات کو اس نے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا۔

مارشل لا کی حکومت نے اس رات کو حکمراں جماعت اور حزب اختلاف کی سربرآوردہ شخصیتوں کو بھی حفاظتی تحویل میں لے لیا۔ سابق حکومت کے اکابر میں وزیر اعظم بھٹو، جناب عبدالحفیظ پیرزادہ، مولانا کوثر نیازی، جناب حامد رضا گیلانی، جناب غلام مصطفےٰ کھر، جناب ممتاز بھٹو، شیخ رشید، ڈاکٹر غلام حسین، اور (ریٹائرڈ) جنرل ٹکا خاں وغیرہ تھے اور حزب اختلاف کے لیڈروں میں جناب مفتی محمود، نواب زادہ

Marfat.com

نصراللہ خاں، پروفیسر غفور احمد، ایرمارشل (ریٹائرڈ) اصغر خاں، جناب شیر باز خاں مزاری، مولانا شاہ احمد نورانی اور پیر پگاڑو وغیرہ۔ حکومت نے دونوں فریقوں کے ارکان کو نہایت آرام و عافیت کے ساتھ رکھا اور دوران نظر بندی ان کے مرتبے کے بموجب ہر ممکن سہولت فراہم کی۔ حکومت کا مقصد انہیں مستقلاً نظر بند رکھنا نہ تھا بلکہ مارشل لا کے قیام کے خلاف ممکنہ رد عمل سے ملک کو محفوظ رکھنا مقصود تھا اس لئے جب عوام کی طرف سے کسی قسم کا کوئی ناخوشگوار ردِ عمل رونما نہ ہوا تو تین ہفتے کے بعد تمام نظر بندوں کو رہا کر دیا گیا۔ بھٹو ۲۸ جولائی کو رہا ہوتے اور رہائی کے بعد وہ سیدھے لاڑکانہ پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی انہوں نے ایک نہایت اشتعال انگیز تقریر کی۔ انہوں نے اپنے استقبال کے لئے آنے والے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

"جو شخص مجھے ووٹ نہیں دے گا وہ سندھی نہیں اور سندھی کی اولاد نہیں ہوگا۔"[1]

تعصب کے زہر میں بجھی ہوئی ان کی اس تقریر سے جو ملک کے تمام اخبارات میں بشمول پیپلز پارٹی کے اخبارات کے، شائع ہوئی۔ صاف اندازہ ہو گیا کہ بھٹو اب صوبائی تعصبات کو بھڑکا کر ملک کے

---

[1] ان کی تقریر کے اس جملے سے بظاہر تو یہ مترشح ہوتا ہے جیسے بھٹو صاحب بڑے زبردست سندھی قوم پرست تھے مگر ان کے ساڑھے پانچ سالہ دورِ حکومت پر یا ایوب خاں کے زمانے میں ان کے دورِ وزارت پر نگاہ ڈالی جائے تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں ایک بھی ایسا قابل ذکر کام نہیں کیا جس سے اہل سندھ کو کوئی اجتماعی فائدہ حاصل ہوا ہو۔ اس کے برعکس ایسے متعدد اقدامات کئے جو، خواہ کسی اور مقصد کی خاطر کئے گئے ہوں، اہل سندھ کو زبردست اجتماعی نقصان پہنچا۔ ان میں سب سے بیّن مثال تعلیمی اداروں کو نیشنلائز کرنے کی ہے۔ قبل ازیں صوبے میں تعلیم کی اشاعت میں سرکاری شعبے کے علاوہ نجی شعبہ بھی اپنے پورے مقدور کے ساتھ شریک تھا۔ صوبے کے آدھے سے زیادہ اسکول اور کالج نجی شعبے نے قائم کئے تھے اور وہی اسے نجی وسائل اور عطیات سے چلا رہے تھے۔ نیشنلائز کر دینے کا نقصان یہ ہوا کہ نجی درسگاہوں کے مصارف کا بار بھی سرکاری خزانے پر پڑ گیا۔ اس وقت سرکاری خزانے سے نجی درسگاہوں پر جو رقم خرچ کی جا رہی ہے وہ سرکاری درسگاہوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس خطیر رقم سے صوبے کے گاؤں گاؤں میں اسکول کھولے جا سکتے تھے۔

Marfat.com

باقیماندہ صوبوں کو بھی باہم متصادم کرانا چاہتے ہیں۔ وہ بہت پہلے سے، بالخصوص اپنے پانچ سالہ اقتدار کے دوران سندھ میں درپردہ طور پر تعصب پروری کے لئے ضروری تیاریاں کر رہے تھے اس وجہ سے سندھ کی پیپلز پارٹی کی ذہنی تربیت پاکستان پرستی کے بجائے سندھ پرستی کے خطوط پر ہوئی تھی کیونکہ وہ باقیماندہ ملک کو بھی صوبائی تعصبات کی آگ میں خاکستر کرنا چاہتے تھے۔ مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کے لئے انہوں نے مغربی پاکستان کے عوام کے دلوں میں مشرقی پاکستان کے خلاف تعصب اور نفرت کے ہی جذبات پیدا کئے تھے اور اسے اس قدر پروان چڑھا دیا تھا کہ ملک کے اس پورے بازو کے عوام نے اپنی مرضی مشرقی پاکستان کے خلاف استعمال کرنے کے لئے بھٹو صاحب کے حوالے کر دی تھی۔ انہوں نے عوام کی مرضی کا مختار کل بن جانے کے بعد اسے مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کے لئے استعمال کیا تھا۔ مذکورہ تقریر سے صاف اندازہ ہو گیا کہ اب وہ اسی طریقے پر سندھ کے عوام کی مرضی کو ہاتھ میں لے کر دوسرے صوبوں کے خلاف محاذ آرائی کی نیت باندھ چکے ہیں لہٰذا ملک کو بھٹو صاحب کی تخریب کاری سے بچانے کے لئے ان کی گرفتاری ضروری ہو گئی اور انہیں مارشل لا کے حکم ۱۲ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔

ان کی بیگم، نصرت بھٹو نے اپنے شوہر کی گرفتاری کے خلاف سپریم کورٹ میں حبس بے جا کا مقدمہ دائر کیا جس میں کہا گیا کہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیا الحق نے ان کے شوہر کے خلاف بے بنیاد الزامات عائد کئے ہیں اس لئے گرفتاری کا یہ حکم بدنیتی پر مبنی ہے۔

مستغیثہ کے وکیل جناب یحییٰ بختیار نے عدالت میں یہ موقف اختیار کیا کہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے ملک کا نظم و نسق غیر قانونی طریقے پر اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ ان کا یہ اقدام بغاوت کے مترادف ہے اس لئے ان کے اقتدار اور مارشل لا کو غیر قانونی قرار دیا جائے۔

حکومت کی طرف سے مقدمے کی پیروی جناب اے۔ کے بروہی نے کی اور جناب شریف الدین پیرزادہ نے عدالت کے افسر قانون کی حیثیت سے کام کیا۔

جناب بروہی صاحب نے مقدمے میں یہ موقف اختیار کیا کہ مارشل لا کے نفاذ سے ۱۹۷۳ء کا آئین اس طرح متاثر ہو گیا ہے کہ معناً ایک نیا قانون ملک کا بنیادی قانون ہو گیا ہے جس کے سربراہ جنرل ضیا الحق ہیں۔ اس باریک بحث کا مقصد جنرل ضیا کو "غیر قانونی قابض اقتدار" کے الزام سے بچانا

Marfat.com

تھا جو اسماء جیلانی کیس کی متابعت میں جنرل یحییٰ کی طرح ان پر عائد ہوتا تھا۔ جناب شریف الدین پیرزادہ نے یہ بحث کی کہ ملک کو خانہ جنگی سے بچانا اتنا ضروری تھا کہ مارشل لا کے تحت بھٹو کی حکومت ختم نہ کی جاتی تو ملک کی سلامتی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔ "نظریۂ اشد ضرورت" نے یہ قانونی بنیاد فراہم کر دی ہے۔

نو ججوں پر مشتمل سپریم کورٹ کے فل بنچ نے مقدمے کی سماعت کی۔ یہ بنچ جس کے سربراہ چیف جسٹس جناب سید انوار الحق تھے جناب جسٹس وحید الدین، جناب جسٹس محمد افضل چیمہ، جناب جسٹس محمد اکرم، جناب جسٹس دوراب پٹیل، جناب جسٹس قیصر خان، جناب جسٹس محمد حلیم، جناب جسٹس غلام صفدر شاہ اور جناب جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ پر مشتمل تھا۔

عدالت نے ۱۰ نومبر ۷۷ء کو مقدمے کا فیصلہ سنایا اور مستغیثہ کی درخواست متفقہ طور پر خارج کر دی۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں جناب شریف الدین پیرزادہ کی بحث قبول کی۔

عدالت نے اپنے فیصلے میں ۷ مارچ ۷۷ء سے لے کر ۵ جولائی ۱۹۷۷ء تک رونما ہونے والے تمام اہم واقعات کا جائزہ لیا جس میں انتخابات میں کی جانے والی دھاندلیاں، ان دھاندلیوں کے خلاف الیکشن کمیشن کی کارروائی، دھاندلیوں کے خلاف چیف الیکشن کمشنر کا کھلا اعتراف، دھاندلیوں کے ارتکاب پر بھٹو صاحب کے خلاف خیبر سے کراچی تک اٹھنے والا شدید ترین احتجاجی ایجی ٹیشن، اس ایجی ٹیشن کو کنٹرول کرنے میں سول آرمڈ فورسز کی ناکامی، ایجی ٹیشن کے دوران واقع ہونے والے بھاری جانی و مالی نقصان، اس دوران ملک کے کئی شہروں میں مارشل لا اور کرفیو کے نفاذ، بھٹو صاحب کی جانب سے ریفرنڈم کرانے پر آمادگی، قومی اتحاد کے ساتھ مذاکرات کرنے پر آمادگی، ان مذاکرات میں از سر نو انتخابات کرانے کے مطالبے پر بھٹو صاحب کی سپراندازی، مذاکرات کے آخری مرحلے میں بھٹو صاحب کی جانب سے پیدا کردہ تعطل، غلام مصطفیٰ کھر کی جانب سے قومی اتحاد کے خلاف اشتعال انگیز تقاریر، حکومت پنجاب کی جانب سے وسیع پیمانے پر اسلحے کی تقسیم اور ملک کی اقتصادی اور تعلیمی سرگرمیوں کے تعطل کا جائزہ لیا اور اپنے فیصلے میں کہا کہ ان واقعات پر غور کرنے کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ۷ مارچ کے بعد مسٹر بھٹو کا ملک پر حکومت کرنے کا آئینی اور اخلاقی اختیار بری طرح مجروح ہو گیا اور ان کی انتظامیہ کو امن و امان قائم رکھنے، عام نظم و نسق بحال کرنے، تعلیمی سرگرمیاں جاری

Marfat.com

رکھنے اور اقتصادی زندگی برقرار رکھنے میں زبردست مشکلات پیش آنے لگیں۔ اس طرح ملک میں سنگین سیاسی بحران پیدا ہو گیا اور ملک کی اتھارٹی ختم ہو کر رہ گئی۔ یہ ایسی صورت حال تھی جس کا آئین میں کوئی مداوا نہ تھا۔ ان حالات میں مسلح افواج نے مداخلت کی اور ملک کو انتشار اور خون ریزی سے بچا کر اس کی سلامتی اور سالمیت کا تحفظ کیا۔ فوج نے ایک دوسرے کے مدمقابل گروہوں کو الگ الگ کیا اور مزید خون ریزی روکی۔ اگرچہ یہ اقدام آئین کے منافی تھا مگر قانونِ ضرورت (LAW OF NECESSITY) کے تحت ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۵ جولائی کو مارشل لا کے نفاذ کا ملک بھر میں خیر مقدم کیا گیا اور عوام نے جو چار ماہ سے زبردست ہنگاموں سے سخت پریشان تھے، سکون کا سانس لیا۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں یہ تیسرا موقع تھا جب عدالت نے قانون ضرورت کو قانون مروجہ سے ماورا قانون کے طور پر استعمال کر کے ملک کو سیاسی بحران سے نکالا تھا۔ پہلی بار عدالت عظمیٰ نے اس قانون کو ۱۹۵۵ء میں استعمال کیا تھا جب دستور ساز اسمبلی کے منظور کئے ہوئے ۴۴ ایسے قوانین کو جن کی گورنر جنرل سے منظوری حاصل نہیں کی گئی تھی، غیر قانونی قرار پانے سے بچانے کے لئے اس نے گورنر جنرل کو گزشتہ تاریخ سے منظوری دینے کی اجازت دی تھی۔ عدالت نے اگر قانون ضرورت کو استعمال نہ کیا ہوتا تو محولہ بالا ۴۴ قوانین کے تحت کئے ہوئے تمام کام غیر قانونی ہو جاتے جن میں اسٹیٹ بنک کا قیام، اس کے جاری کئے ہوئے سکے، صوبائی اسمبلیاں، ان کے بنائے ہوئے قوانین، ان قوانین کے تحت قائم کی ہوئی عدالتیں سب کی سب کالعدم ہو جاتیں۔ اور ملک میں ایسا بحران رونما ہوتا جس کا کوئی علاج نہ تھا (اس کی تفصیل صفحہ ۴۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

عدالت عظمیٰ نے قانونِ ضرورت کو دوسری بار اسماء جیلانی کیس میں ۲۰ اپریل ۱۹۷۲ء کے فیصلے میں استعمال کیا جس میں یحییٰ خاں کی حکومت کو غیر قانونی قرار دیا گیا تھا مگر ان کے کئے ہوئے ایسے فیصلوں اور اقدامات کو جو ملک کے مفاد میں ضروری تھے، قانونی تحفظ دیا گیا تھا۔ اس موقع پر بھی اگر عدالت عظمیٰ قانونِ ضرورت کو استعمال نہ کرتی تو یحییٰ خاں کے ایسے تمام اقدامات جو روزمرہ کے ملکی معاملات کو چلانے کے لئے ناگزیر طور پر کرنے پڑے تھے، کالعدم ہو جاتے اور ان کے کالعدم ہو جانے سے بے اندازہ نقصان رونما ہوتا۔

Marfat.com

تیسری بار جب اس قانون کو استعمال کیا گیا تو اسے استعمال کرنا کس قدر ضروری تھا یہ سطور بالا میں بہ صراحت بیان کیا جا چکا ہے۔

آئینی مسائل منزل بہ منزل

گذشتہ صفحات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت آپ پر اچھی طرح واضح ہو گئی ہو گی کہ اس امر کے باوجود کہ یہ ملک دو جدا جدا جغرافیائی وحدتوں کی صورت میں وجود میں آیا اور ان دونوں کے مابین ایک ہزار میل کی دوری حائل تھی، جس دن یہ ملک وجود میں آیا اسے ایک بھی آئینی تنازعے کا سامنا نہ تھا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جغرافیائی انفصال کے باوجود دونوں صوبوں کے عوام ذہنی اور نظریاتی اعتبار سے ایک تھے۔ عملی اعتبار سے بھی انہوں نے ایک ہونے کا ثبوت دیا۔ ساتھ رہنے کی خواہش ان کے دلوں میں اتنی شدید تھی کہ اس کے لئے ہر صوبے کے عوام نے اپنے مفادات کی قربانی کی تاریخی نظیریں قائم کیں۔ اس ملک کو بنانے کے لئے پنجاب کے مسلمانوں نے اپنے سینکڑوں سال پرانے لسانی خطے کو مشرقی اور مغربی پنجاب میں تقسیم کرایا۔ اسی طرح سے بنگال کے مسلمانوں نے اپنی لسانی وحدت کو دونیم کیا اور اپنی آزادانہ مرضی سے اسے ہزار میل دور واقع ایک جغرافیائی خطّے سے نظریاتی بندھن میں جوڑا جو تاریخ کا بے نظیر واقعہ ہے۔ سلہٹ کے مسلمانوں نے اپنے صوبے آسام سے کٹ کر بنگال میں شامل ہونا گوارہ کیا۔ اس طرح سے سندھ کے باشندوں نے ہزار میل دور سے آئے ہوئے بے گھر انسانوں کو اپنی سرزمین پر بسایا اور ان کی نہایت خوش دلانہ مہمان نوازی کی۔ باہر سے آنے والوں کو خوش دلی کے ساتھ اپنی سرزمین پر بسانے کی دنیا میں کہیں نظیر نہیں ملتی۔ باہر والے امریکہ میں جا کر آباد ہوئے مگر وہاں کے سرخ نژاد ہندیوں (RED INDIANS) نے ان کا استقبال نہیں کیا بلکہ باہر والوں کو آباد ہونے کے لئے ان سے جنگ کرنی پڑی۔ باہر والے ہندوستان میں بھی آباد ہوئے مگر ان کی آمد کا خیر مقدم نہیں کیا گیا بلکہ بزور شمشیر ان کی مزاحمت کی گئی۔ باہر والے جنوبی افریقہ میں بھی آباد ہوئے مگر انہیں اس کے لئے توپ اور بندوق کا سہارا لینا پڑا۔ ظہور پاکستان نے ہجرت مدینہ کی تجدید کی کہ مقامی باشندوں نے باہر والوں کا خیر مقدم کیا۔ اسی طریقے پر بنگال کے مسلمانوں نے لاکھوں مہاجرین کو خوش آمدید کہا۔ ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں نے یہ جاننے

Marfat.com

کے باوجود کہ ان کی کل تعداد کو پاکستان کے لئے ہجرت کرنا ممکن نہ ہوگا، اس مملکت کے قیام میں حصہ لیا اور ہندوؤں کی ناراضگی مول لی۔

جہاں جغرافیائی اور لسانی تعصبات سے بے نیازی کا یہ عالم ہو وہاں ملک کے لئے دستور کی تیاری کیا مسئلہ بن سکتی تھی؟ اس لئے جب یہ ملک بنا تو اسے کسی قسم کے دستوری تنازعے کا سامنا نہ تھا۔ اس کی اسمبلی کے کرنے کا کام صرف یہ تھا کہ وہ اسلامی نظریۂ حیات اور اسلام کے احکام کو دستوری دفعات کے سانچے میں ڈھال دے تاکہ ملک کی تعمیر نو اس کے تقاضوں کے مطابق عمل میں آسکے۔ دوئم یہ کہ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ایسی ترمیمیں کردے کہ وہ پاکستان کی انتظامی ضروریات کو بہ حسن و خوبی پوری کر سکیں۔ مذکورہ ایکٹ میں دو ترمیمیں ضروری تھیں۔ ایک یہ کہ پاکستان کے دونوں بازو چونکہ ایک دوسرے سے ہزار میل کی دوری پر واقع تھے اور دارالسلطنت مغربی بازو میں واقع تھا اس لئے اختیارات کی وفاقی فہرست کے ایسے محکمے جو صوبائی حکومت کے تحت بھی چلائے جا سکتے ہوں مثلاً ریلوے، پانی و بجلی کے محکمے، صنعتی ترقیات کے محکمے وغیرہ صوبوں کو دے دیئے جاتے تاکہ ان محکموں کے بارے میں دارالسلطنت سے احکامات منگوانے میں جو غیر معمولی تاخیر ہوتی تھی اس سے مشرقی پاکستان محفوظ رہتا۔ دوسری ترمیم یہ کہ شہری آزادیوں کو من مانے طور پر سلب کرنے کے لئے سیفٹی ایکٹ، سیکوریٹی ایکٹ، فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن وغیرہ نام کے جو قوانین انگریزی راج نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں شامل کر رکھے تھے انہیں منسوخ کر دیا جاتا یا ان کے تحت کی جانے والی نظربندیوں کے خلاف کھلی عدالت میں چارہ جوئی کا دروازہ کھول دیا جاتا۔

مگر بدقسمتی سے یہ کام نہیں کئے گئے۔ دستور کو اسلام کے قالب میں ڈھالنے کی اہمیت بھی نہیں پہچانی گئی اور ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں مطلوبہ ترمیمات سے بھی گریز کیا گیا۔ چنانچہ دستور کا پہلا مسودہ ستمبر ۱۹۵۰ء میں جب منظر عام پر کیا تو مذکورہ بالا اقدامات سے اغماض برتنے کی بنا پر عوام الناس کی طرف سے اس کی زبردست مخالفت کی گئی اور حکومت کو اسے واپس لینے پر مجبور کر دیا گیا۔

چند ماہ بعد ۱۹۵۱ء میں پنجاب اور صوبہ سرحد کی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات میں دونوں صوبوں میں حکمران جماعتوں نے دوبارہ منتخب ہونے کے لئے ہر ممکن قسم کی دھاندلی کی۔ مخالف امیدواروں کو انتخابات میں کھڑا ہونے سے روکنے کی کوشش کی گئی۔ ان کے کاغذات نامزدگی

مسترد کرائے گئے، بوگس ووٹنگ کرائی گئی، حزب مخالف کے امیدواروں کے ڈبے کھلوائے گئے، ان کے ووٹوں کی پرچیاں غائب کرائی گئیں اور ان سب طریقوں سے اپنی مرضی کے نتائج تیار کرائے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کا راستہ مسدود ہو گیا۔ اس کے بعد دستوری مسائل کی فہرست میں اس نئے مسئلے کا اضافہ ہوا کہ آئین میں ایسے تحفظات شامل کئے جائیں جن کے ذریعے حکومت کو دھاندلی کرنے سے روکا جا سکے۔ حزب اختلاف کی جماعتوں نے ہر موقع پر اس کے لئے تجاویز اور مشورے الیکشن کمیشنوں کو پیش کئے مگر حکومت نے کسی اصلاحی تجویز کو منظور نہ ہونے دیا۔

ہمارے حکمرانوں نے حکمرانی کا آغاز اس نظریئے پر کیا کہ انہیں تادم زندگی حکمراں رہنا ہے۔ اس نظریئے کے بموجب ایک کام تو یہ کیا گیا کہ وزیراعظم نے اپنی پارٹی کی صدارت کا منصب بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا جس کی وجہ سے وہ اپنی پارٹی کے احتساب کے "خطرے" سے محفوظ ہو گئے۔ دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ اسمبلی میں حزب اختلاف کو ابھرنے اور منظم ہونے کا موقع نہ دیا۔ حالانکہ مروجہ جمہوری نظام کے ڈھانچے میں خواہ وہ صدارتی طرز کا ہو یا پارلیمانی طرز کا، حزب اختلاف ایوان جمہوریت کا ایک اہم ستون ہوتی ہے جسے منہدم کر دیا جائے تو جمہوریت آمریت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ حزب اختلاف کو دبانے کے ساتھ ایک کام یہ کیا گیا کہ بے لاگ پریس کی نشوونما کے راستے میں قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں۔ اگر کبھی پریس نے حکومت پر کوئی تنقید کی تو اس کے لئے زندہ رہنا مشکل بنا دیا گیا۔ اس سلسلے میں ٹائمز آف کراچی اور روزنامہ ڈان کی نظیریں بڑی عبرت ناک ہیں۔ اول الذکر اخبار کو ۱۹۵۲ء میں حکومت کے خلاف محض ایک کارٹون شائع کرنے پر بند کر دیا گیا جس کی بحالی کے لئے اسے عدالت سے رجوع کرنا پڑا۔ ڈان کی حکومت پنجاب کے سرکاری اداروں میں خریداری پر محض اس بنا پر پابندی عائد کر دی گئی کہ اس نے صوبے کے وزیراعلیٰ جناب فیروز خاں نون پر تنقید کی تھی۔ چھوٹے اخبارات کے ساتھ جو ناروا زیادتیاں کی گئیں ان کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ ان تدبیروں کے ذریعے حکمراں جماعت نے اپنے احتساب کے تمام امکانی ذرائع بند کر دیئے۔ مگر ان اقدامات نے دو آئینی مسئلے بھی پیدا کر دیئے۔ ایک یہ کہ سیاسی جماعتوں کو کام کرنے اور منظم ہونے کے لئے آئینی تحفظات دیئے جائیں اور دوسرا یہ کہ پریس کی آزادی کو آئینی تحفظ فراہم کیا جائے۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۴ء تک ملک ۱۹۳۵ء کے برطانوی آئین کے تحت ہی چلتا رہا۔ یہ گویا اسلام

سے گریز کی ایک شکل تھی۔ اس گریز کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں ایک نظریاتی خلا نمودار ہو گیا۔ یہ خلا بتدریج وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ بدقسمتی سے ملک کے دونوں بازوؤں کے مابین ایک ایسا ملک حائل تھا جو پاکستان کا بدترین دشمن تھا۔ اس نے اس خلا سے فائدہ اٹھایا۔ مشرقی پاکستان پر پہلے سے اس کا تعلیمی اور ثقافتی اثر تھا۔ اس نے وہاں کے مسلمانوں میں بنگلہ قومیت کا نظریہ رائج کرنے اور اس کے ساتھ مغربی پاکستان کے خلاف تنفر پیدا کرنے کی کوششیں شروع کر دیں اور اس مقصد کے لئے سرکاری زبان کے مسئلے کو موضوع بنایا۔ ۱۹۵۰ء کے آئینی مسودے میں اردو کو ملک کی واحد سرکاری زبان بنانا طے کیا جا چکا تھا۔ یہ ضروری بھی تھا کیونکہ یہی زبان ملک کے دونوں بازوؤں کے مابین رابطے کا ذریعہ تھی مگر ہندوؤں نے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ پاکستان کی کل آبادی میں وہ اعدادی اکثریت کے حامل ہیں لہٰذا بنگلہ کو بھی سرکاری زبان ہونا چاہیئے (حالانکہ ان ہندو بنگالیوں نے مغربی بنگال میں کبھی اس کو سرکاری زبان بنانے کی مہم نہیں چلائی) اس پروپیگنڈے کے نتیجے میں وہاں کے مسلمان اس قدر جذباتی ہو گئے کہ انہوں نے ۱۹۵۲ء میں مشرقی پاکستان میں بڑا فساد برپا کر دیا۔ اس دن سے سرکاری زبان کا مسئلہ بھی آئین کا حل طلب مسئلہ بن گیا۔

۱۹۵۳ء میں گورنر جنرل نے جو محض آئینی سربراہ تھے، وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کو بغیر کسی جواز کے برطرف کر دیا۔ اس سے وہاں کے عوام میں مغربی پاکستان اور مرکزی حکومت کے خلاف بڑی نفرت اور بیزاری پیدا ہوئی۔ نفرت اور بیزاری کے بطن سے وہ ۲۲ نکاتی منشور ظہور پذیر ہوا جس کی بنیاد پر وہاں کے جگتو فرنٹ نے ۱۹۵۴ء کے انتخابات لڑے اور حکمراں جماعت کو شکست فاش دی۔ اس ۲۲ نکاتی منشور میں مشرقی پاکستان کے لئے غیر معمولی حد تک صوبائی خود مختاری طلب کی گئی تھی۔ گویا ۱۹۵۴ء تک پہنچتے پہنچتے صوبائی خود مختاری بھی ایک اہم آئینی مسئلہ بن گئی۔

۱۹۵۴ء کے دستور میں یہ تمام مسئلے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اطمینان بخش طریقے پر حل کر دیئے گئے۔ اس میں ملک کو وفاقی پارلیمانی نظام کے تحت چلانے کے لئے ایک ایسا ڈھانچہ تجویز کیا گیا جو سب کے لئے بلا لحاظ علاقہ لائق اطمینان تھا۔ محکموں کو صوبوں اور وفاقی حکومت کے مابین تقسیم کرتے وقت اس امر کو اچھی طرح ملحوظ رکھا گیا تھا کہ اس سے مرکزی حکومت کا استحکام بھی متاثر نہ ہو اور صوبوں کو اپنے مسائل خود اپنی صوبائی حکومت کے ہاتھوں حل کرنے کا موقع بھی ملے۔ مرکزی حکومت

Marfat.com

میں ایوان زیریں اور ایوان بالا کے مابین نشستوں کی تقسیم اگرچہ مروجہ طریقے پر ہی کی گئی تھی کہ ایوان زیریں میں نشستوں کا تعین آبادی کی بنیاد پر ہو جبکہ ایوان بالا میں مساوی بنیادوں پر، مگر دونوں ایوانوں کے لئے نشستوں کا تعین ایسے حکیمانہ طریقے پر کیا گیا تھا کہ دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں ملک کے دونوں بازوؤں کی نشستوں کی تعداد مساوی ہو جاتی تھی۔ نشستوں کی تقسیم کا یہ اصول بہت پسند کیا گیا اور اس کے واضع کے نام پر محمد علی (بوگرہ) فارمولا کہلایا۔ ایسا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہو جس میں دونوں بازوؤں کے علاقائی مفادات متصادم ہوتے ہوں تو اسے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں پیش کیا جا سکے اور وہاں کسی ایک بازو کو دوسرے بازو پر اعدادی غلبہ حاصل نہ ہو۔ تعداد دونوں بازوؤں کے ارکان کی مساوی ہو۔ ایسی حالت میں مشترکہ ایوان جو فیصلہ کرتا ظاہر ہے کہ اس پر علاقائی غلبہ پرستی کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

زبان کے مسئلے نے اس وقت تک بڑی جذباتی شدت اختیار کر لی تھی جس سے قومی وحدت کو اندیشہ لاحق ہو گیا تھا لہٰذا قومی وحدت کے مفاد پر لسانی وحدت کو قربان کر کے اردو اور بنگلہ دونوں کو ملک کی سرکاری زبانیں قرار دے دیا گیا تھا۔ اس فیصلے کا یہ پہلو نہایت قابلِ تحسین تھا کہ اردو اور بنگلہ دونوں ملک کے دونوں بازوؤں کی سرکاری زبانیں بنائی گئی تھیں۔ ایسا نہ تھا کہ اردو صرف مغربی پاکستان کی زبان بنائی گئی ہو اور بنگلہ صرف مشرقی پاکستان کی۔ اگر اس فیصلے کو نفاذ میں آنے کا موقع مل گیا ہوتا تو زبان کے مسئلے کی جذباتی گرمی کب کو ختم ہو چکی ہوتی اور وہ لسانی منافرت پیدا نہ ہوتی جو بعد میں ہوئی۔

شہری آزادیوں کے تحفظ کے لئے پوری طرح تو نہیں مگر خاصی حد تک تحفظات دیئے گئے تھے اور طے کیا گیا تھا کہ صدر مملکت ہنگامی حالت کا اعلان کرنا ضروری سمجھیں تو چھ ماہ کے اندر اسمبلی سے اس کی منظوری حاصل کی جائے گی۔ اگر اسمبلی سے منظوری حاصل نہیں کی گئی یا اگر اسمبلی نے منظوری نہ دی تو ہنگامی حالت ختم ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہنگامی حالت کے نافذ ہو جانے کی صورت میں شہری آزادیاں اور بنیادی حقوق جو معطل ہو جاتے ہیں اور جس کے تحت حکومت کو کسی شخص کی گرفتاری کا حق حاصل ہو جاتا ہے، وہ اسمبلی کی منظوری کے بغیر حاصل نہ رہ سکے گا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دستور کی عمارت قراردادِ مقاصد پر اٹھائی گئی تھی اور ملک کے قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق وضع کرنے اور مملکت کو اسلامی اصولوں پر چلانے کے لئے

Marfat.com

تمام ضروری انتظامات کئے گئے تھے۔ ان سب باتوں کے علاوہ عدالت ہائے عالیہ (HIGH COURTS) کو حکومت کے اقدامات کے خلاف اجرائے پروانہ (WRITS) جاری کرنے کا اختیار دیا گیا تھا جس سے ۱۹۳۵ء کا برطانوی ایکٹ محروم تھا۔

اگر ۱۹۵۴ء کے اس آئین کو نفاذ کا موقع مل جاتا تو پاکستان اب تک نہایت مضبوط اور مستحکم ملک بن چکا ہوتا۔ کسی قسم کا صوبائی یا لسانی تعصب ہوتا اور نہ کسی قسم کا پیچیدہ دستوری مسئلہ رونما ہوتا مگر بدقسمتی سے گورنر جنرل غلام محمد نے اس دستور کی تیاری کے عین آخری مرحلے میں دستور ساز اسمبلی توڑ دی جس سے آئین سازی کا یہ تمام کام برباد ہوگیا۔

پھر تقریباً دو سال بعد ۱۹۵۶ء کا آئین بنا۔ اس وقت تک مرکزی اسمبلی کی ہیئت میں ایک بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ یہ اسمبلی صوبائی اسمبلیوں کے ارکان میں سے منتخب کی گئی تھی۔ مشرقی پاکستان کے ۱۹۵۴ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی جگہ جگتو فرنٹ نے لے لی تھی۔ اس میں غالب اکثریت تنگ نظر صوبہ پرست اور ہندو نواز ارکان کی تھی اس لئے مرکزی اسمبلی کے لئے وہاں سے اسی قسم کے ارکان منتخب ہو کے آئے۔ ۱۹۵۶ء کے دستور کو ۱۹۵۴ء کے نمونے پر مرتب کرنے میں ان کی علاقہ پرستی اور لادینیت حائل ہوگئی۔ اس وقت دستور سازی کو جس دشواری کا سامنا تھا وہ یہ تھی کہ اگر ۱۹۵۴ء کا دستور اپنانے پر زور دیا جاتا تو مشرقی پاکستان اسے قبول کرنے پر کبھی تیار نہ ہوتا اور اگر اہل مشرقی پاکستان کے مطالبات کے بموجب دستور تیار کیا جاتا تو اسلام سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا اور مرکزی حکومت کے استحکام سے بھی کیونکہ وہ ۲۱ نکاتی منشور کا علم تھامے ہوئے تھے جس میں اتنی زیادہ صوبائی خودمختاری طلب کی گئی تھی کہ اس کے ساتھ مرکزی حکومت کا چلنا امر محال تھا۔ خوش قسمتی سے قوم کو چوہدری محمد علی کی قیادت حاصل تھی جو حب الوطنی اور اسلام دوستی کے علاوہ معاملات کو سلجھانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انہوں نے پیہم سعی و کاوش کے بعد آئین سازی کے بحران پر آخر کار قابو پا لیا اور کچھ لو اور کچھ دو کے اصول کے تحت ایک ایسا فارمولا تیار کیا جو ملک کے دونوں بازوؤں کے لئے قابل قبول بن گیا۔ انہوں نے مرکزی حکومت کے مزید کچھ محکمے صوبوں کو دیئے مگر آئین کی اسلامی دفعات پر ان کی رضامندی حاصل کر لی اور ۱۹۵۴ء کے دستور میں جو اسلامی دفعات شامل تھیں وہ تمام کی تمام ۱۹۵۶ء کے دستور میں شامل کیں۔ انہوں نے ان سے ایک بات اور منوائی اور وہ مرکزی اسمبلی میں ملک کے دونوں

بازوؤں کے لئے نشستوں کا مساوی ہونا تھا۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کی تدوین سے پہلے مغربی پاکستان میں ون یونٹ بن چکا تھا جس کے بعد ملک میں صوبوں کی تعداد کم ہو کر صرف دو رہ گئی تھی۔ ملک میں اعدادی اکثریت (۵۶ فیصد) مشرقی پاکستان کو حاصل تھی مگر انہیں اس امر پر آمادہ کیا گیا کہ مرکزی اسمبلی میں وہ مغربی پاکستان کے مساوی نشستیں قبول کر لیں گے۔ اس سے بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مرکز میں دو ایوان بنانے کی حاجت نہ رہی۔

۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۶ء کے آئین میں بجز اس کے کوئی فرق نہ تھا کہ اول الذکر میں دو ایوانی مقننہ تجویز کی گئی تھی جبکہ مؤخر الذکر میں ایک ایوانی۔ باقی جو فرق تھا وہ بہت معمولی نوعیت کا تھا۔ صرف ایک مسئلہ تھا جس پر تصفیہ نہ ہو سکا تھا اور وہ طریقۂ انتخاب کا مسئلہ تھا کہ وہ جداگانہ طرز کا ہو یا مخلوط طرز کا۔ اس کے بارے میں آئین میں طے کیا گیا کہ صوبائی اسمبلیوں کے مشورے سے مرکزی اسمبلی بعد میں اسے طے کرے گی اور بلاشبہ یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ اس مسئلے میں جو فیصلہ بعد میں اکتوبر ۱۹۵۶ء میں، مرکزی اسمبلی نے کیا وہ مخلوط انتخاب کو اختیار کرنے سے بھی بدتر تھا۔

۱۹۵۶ء کے آئین نے بھی اس وقت کے تقریباً تمام آئینی مسائل حل کر دیئے تھے اور اگر اسے کام کرنے کا موقع مل جاتا تو اس سے وہی فوائد برآمد ہوتے جو ۱۹۵۴ء سے متوقع تھے۔ مگر ہم سب کی بدقسمتی کہ ۱۹۵۸ء میں یہ دستور منسوخ کر دیا گیا اور اس کی جگہ مارشل لا نے لے لی۔ مارشل لا ۴۴ ماہ بعد اگرچہ اٹھا لیا گیا اور اس کی جگہ صدارتی نظام قائم کیا گیا مگر اس میں اور مارشل لا میں اپنی روح، مزاج اور صفات کے اعتبار سے ذرہ برابر کوئی فرق نہ تھا۔ حکمرانی کا جو مطلق العنان اختیار مارشل لا کے نظام میں ایوب خان کو بحیثیت فرد واحد حاصل تھا، صدارتی نظام میں بھی یہ سب کے سب اختیارات ان کے ہاتھ میں برقرار رہے۔ ان میں سے ذرہ برابر کوئی اختیار کسی اور کو تفویض نہیں کیا گیا۔ اسمبلی ضرور بنائی گئی مگر اس کی حیثیت خود مختار مقننہ کی نہ تھی بلکہ صدر کے ایک مشاورتی ادارے کی تھی۔ عدلیہ کے اختیارات میں بھی کمی کر دی گئی اور سیاسی نظربندوں کے مقدمات کی سماعت کا اختیار اس سے چھین لیا گیا۔ پریس کو تابع مہمل بنانے کے لئے پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس جاری کیا گیا اور اس قانون کو اس بے دردی کے ساتھ استعمال کیا گیا کہ آزاد پریس کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا۔ بہت سے اخبارات کو خرید کر سرکاری اخبار بنا دیا گیا اور اسے چلانے کے لئے سرکاری اہتمام میں ایک

Marfat.com

پریس ٹرسٹ قائم کر دیا گیا۔ ڈیفنس آف پاکستان رولز کو جسے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے موقع پر نافذ کیا گیا تھا جنگ ختم ہونے کے بعد بھی نافذ العمل رکھا گیا اور اسے اپنے مخالفین کو گرفتار کرنے کے لئے مزید ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اسلام کے ساتھ عملاً معاندانہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا۔ ملک کے نام میں تحریف کر کے اسے اسلامی جمہوریہ پاکستان سے صرف جمہوریہ پاکستان بنا دیا گیا۔ ۱۹۵۶ء کے دستور کی ایسی تمام دفعات کو جو اسلامی قانون کے نفاذ کا ذریعہ بنتیں ۱۹۶۲ء کے دستور میں شامل ہونے نہیں دیا گیا اور بالغ رائے دہی کے ذریعے بلاواسطہ ارکانِ اسمبلی منتخب کرانے کے بجائے بنیادی جمہوریتوں کا انوکھا نظام رائج کیا گیا۔

ایوب خاں کے ان سب اقدامات سے روزمرہ کے معمولات میں تو بظاہر کوئی خاص فرق رونما نہیں ہوا مگر ان اقدامات سے تین بڑے نقصانات رونما ہوئے۔ ایک یہ کہ ملک کی نظریاتی نہج تبدیل ہو گئی۔ دوسرا یہ کہ جمہوری نظام کا ڈھانچہ ٹوٹ گیا اور صوبوں کو آئین میں جو اختیارات دیئے گئے تھے انہیں استعمال کرنے کا اختیار انہیں عملاً حاصل نہ ہو سکا۔ اس اختیار کو بھی بالواسطہ طور پر مرکزی حکومت ہی استعمال کرتی رہی۔ اس مطلق العنانی کو جو ملک کے دونوں بازوؤں کے لئے یکساں طور پر پریشان کن تھی، مشرقی پاکستان میں زیادہ کرب کے ساتھ محسوس کیا گیا کیونکہ دارالسلطنت مغربی پاکستان میں واقع تھا اس لئے دارالسلطنت سے جاری ہونے والے مستبد احکامات کو مشرقی پاکستان پر مغربی پاکستان کی بالادستی سمجھا گیا۔ اس کی وجہ سے علیحدگی کے رجحان کو تقویت پہنچی اور اس کا کم سے کم ردِعمل صوبائی خود مختاری میں اضافے کے مطالبے کی صورت میں رونما ہوا۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ نے اس مطالبے کے لئے جلتی پر تیل کا کام دیا حالانکہ جنگ کے دنوں میں وہاں کے عوام کا جذبۂ حب الوطنی بھی اسی عروج پر تھا جس عروج پر مغربی پاکستان کے عوام کا، مگر جب جنگ بندی ہوئی تو وہاں کے عوام نے محسوس کیا کہ ان کی سالمیت حد درجہ غیر محفوظ تھی۔ بروایت جناب مہدی علی صدیقی، پرنسپل اسلامیہ لاکالج کراچی، جناب نورالامین نے خود ان سے ایک خصوصی انٹرویو میں مشرقی پاکستان کے عوام کے احساس عدم تحفظ کا ان کے سامنے اظہار کیا تھا۔ اگر چین نے مشرقی پاکستان کی طرفداری نہ کی ہوتی تو ہندوستان نہایت آسانی کے ساتھ اسے ختم کر چکا ہوتا۔ عدم تحفظ کے اس احساس نے مرکزی حکومت کے خلاف سخت غم و غصہ پیدا کیا۔ اسی احساسِ عدم تحفظ نے مجیب الرحمٰن کو چھ نکاتی

Marfat.com

فارمولا پیش کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اور اسی احساس کی بناپر یہ فارمولا بہت کم وقت میں مشرقی پاکستان میں مقبول عام ہوگیا کیونکہ اس میں مشرقی پاکستان کے لئے جداگانہ فورج بنانے کا مطالبہ بھی شامل کیا گیا تھا۔ اس کی مقبولیت سے مجیب الرحمٰن جیسے علاقہ پرست لیڈر کو غیر معمولی سیاسی قوت حاصل ہوئی ۔ یہی سیاسی قوت گول میز کانفرنس کو ناکام بنانے کا سبب بنی۔

ایوب خاں کے مستبد اور مطلق العنان دور حکومت نے اور مسائل کے علاوہ جن کا سطور بالا میں تذکرہ کیا گیا ایک اور مسئلہ پیدا کیا وہ سابقہ جمہوری ڈھانچے یعنی وفاقی پارلیمانی حکومت کی بحالی کا تھا کیونکہ برصغیر میں جمہوری نظام کو (صدارتی کے بجائے) پارلیمانی ڈھانچے پر استوار کیا گیا تھا اور ایک پارلیمینٹیرین سے لے کر عام ووٹر اور اخبار بین تک ہر شخص کی ذہنی تربیت پارلیمانی جمہوریت کے خطوط پر ہوئی تھی۔ اسی نظام پر پاکستان کے دونوں بازوؤں کا بھی کامل اتفاق رائے تھا۔ اس لئے تمام سیاسی جماعتوں کی ملی جلی کوشش یہ تھی کہ بالغ رائے دہی اور پارلیمانی جمہوریت کا نظام بحال ہو جائے۔

یہ امر اس ملک کے عوام اور سیاسی جماعتوں کی حب الوطنی اور امن پسندی کا ثبوت تھا کہ انہوں نے مطلق العنان نظام کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے غیر آئینی راستہ اپنانے سے گریز کیا۔ کوئی گوریلا جنگ شروع نہیں کی گئی اور نہ سول نافرمانی کی تحریک چلائی گئی بلکہ پُرامن طریقے پر پہلے مطالبات کے ذریعے اور پھر انتخابات کے ذریعے اس نظام سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی گئی ۔ ۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخابات میں ایوب خاں کے مقابلے پر مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کی امیدواری اسی مقصد کے تحت تھی کہ مطلق العنانی کا خاتمہ ہو اور جمہوریت واپس آئے۔ بنیادی جمہوریتوں اور (نام نہاد) صدارتی نظام کا خاتمہ ہو اور بالغ رائے دہی اور پارلیمانی جمہوریت بحال ہو۔ گویا ایوب خاں اور مادر ملت کا مقابلہ دو شخصیتوں کا مقابلہ نہ تھا بلکہ دو نظاموں کا مقابلہ تھا۔

ایوب خاں نے سرکاری مشینری استعمال کر کے یہ انتخاب جیت لیا۔ یہ اختیارات کا نہایت بے جا اور ناروا استعمال تھا جس پر عوام میں غم و غصے کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔ ایوب خاں نے اس طرح انتخابات کے ذریعے قیادت کی تبدیلی کا راستہ بند کر دیا۔ اس کے بعد حزب اختلاف نے تحریک چلا کے جمہوری نظام بحال کرانے کی تدبیر اختیار کی اور آٹھ نکاتی مطالبہ کی حمایت میں تحریک چلائی جس کے نتیجے میں ایوب خاں کو گول میز کانفرنس منعقد کرنی پڑی۔

گول میز کانفرنس کو ایک گہری سازش کے ذریعے یحییٰ، بھٹو اور بھاشانی نے مل کر ناکام بنا دیا۔ سازشیوں کے مشورے کے مطابق مجیب الرحمٰن نے پیرول پر رہا ہو کر کانفرنس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ اور مکمل رہائی کی شرط عائد کر دی۔ اگر وہ پیرول پر رہا ہوتے تو کانفرنس میں چھ نکات پر اصرار نہ کرتے بلکہ ایوب خاں کی طرف سے جو بھی فارمولا پیش کیا جاتا یا کانفرنس کے شرکا میں جمہوریت کی بحالی کے لئے جس فارمولے پر بھی اتفاق رائے ہو جاتا، مجیب الرحمٰن بسر و چشم اس پر راضی ہو جاتے کیونکہ اگرتلہ سازش کیس ان کے گلے کا پھندا بن چکا تھا۔ بحالی جمہوریت کے فارمولے کو ایک بار تسلیم کر لینے کے بعد ان کا چھ نکاتی فارمولا از خود ختم ہو جاتا کیونکہ اسے تسلیم کر لینے کا مطلب یہ ہوتا کہ ۱۹۶۲ء کے آئین میں جتنی خود مختاری تجویز کی گئی ہے اس پر وہ راضی ہیں۔

کانفرنس، مجیب الرحمٰن کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ناکام ہو گئی۔ یہ المیہ سہی مگر اس ناکامی نے جمہوریت کی بحالی کا راستہ مسدود نہیں کر دیا تھا۔ اس کے بعد بھی اگر ایوب خاں چاہتے تو اس طریقہ کار کے بموجب جس پر مجیب الرحمٰن کے ماسوا باقیماندہ لیڈروں کو اتفاق تھا، جمہوریت بحال کر سکتے تھے۔ یعنی ۱۹۶۲ء کے آئین میں دو ترمیمیں کر دی جاتیں جس کے بموجب بنیادی جمہوریتوں کے ذریعے انتخابات کے بجائے بالراست انتخابات کا طریقہ رائج کر دیا جاتا اور صدارتی طرز حکومت کو ختم کر کے وفاقی پارلیمانی طرز حکومت بحال کر دیا جاتا۔ مگر انہوں نے ایسا نہ کیا۔ یحییٰ خاں اس وقت تک حکومت کے معاملے میں اس قدر دخیل ہو چکے تھے کہ ایوب خاں کے لئے ایسا کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ یحییٰ خاں کے اثر و نفوذ کا ہی نتیجہ تھا کہ انہوں نے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو ایوب خاں سے اقتدار اپنے نام وثیقہ کرا لیا۔

یحییٰ خاں نے بارہا دعویٰ کیا کہ انہوں نے اقتدار چھینا نہیں بلکہ ایوب خان نے انہیں تفویض کیا ہے تاکہ وہ امن و امان بحال کر سکیں۔ وہ اگر اس دعوے میں سچے تھے تو انہیں امن و امان بحال کرنے کے بعد اقتدار اس فارمولے کے بموجب جس پر کانفرنس میں اتفاق رائے ہو چکا تھا، عوامی نمائندوں کو منتقل کر دینا چاہئے تھا مگر انہوں نے ایسا نہ کیا اس کے بجائے انہوں نے تین ایسے اقدامات کر ڈالے جس کا یہ ملک ہرگز خواہاں نہ تھا۔ ان کے ان اقدامات سے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ ان اقدامات میں سے ایک ون یونٹ کا توڑ دیا جانا تھا دوسرا دونوں بازوؤں کے مابین نشستوں کی مساوات کا ختم کیا جانا تھا۔ ان دونوں اقدامات کے نتیجے میں مرکزی حکومت کا وہ ڈھانچہ ٹوٹ گیا جس پر پارلیمانی حکومت کی عمارت کھڑی

Marfat.com

کی جاتی تھی۔ اسے توڑ دینے کے بعد ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ایک متبادل ڈھانچہ تیار کیا جاتا۔ ۱۹۵۴ء کا آئینی مسودہ متبادل ڈھانچے کی حیثیت رکھتا تھا جس میں محمد علی فارمولے کے بموجب دونوں ایوانوں میں نشستوں کا تعین کر دیا گیا تھا مگر یحییٰ خاں نے یہ متبادل ڈھانچہ تیار نہیں کرایا۔ یہ کام انہوں نے انتخابات کے بعد منتخب ہونے والی اسمبلی کے سپرد کر دیا۔ منتخب ہونے والی اسمبلی پر یہ پابندی بھی عاید کر دی کہ وہ ۱۲۰ دن کے اندر آئین بنالے ورنہ وہ خود بخود ٹوٹ جائے گی۔ یہ بات یحییٰ خاں کو خوب اچھی طرح معلوم رہی ہو گی کہ ۱۹۵۶ء کا آئین تیار ہونے میں نو سال لگے تھے اس لئے ۱۲۰ دن میں نیا آئین بننا امر محال ہے۔ غالباً اسی امکانی دشواری کی بنا پر انہوں نے آئین سازی کے لئے حد درجہ مختصر مدت متعین کی تھی تاکہ دستور نہ بن سکے، اسمبلی ٹوٹ جائے اور وہ اقتدار پر مسلط رہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے آئین سازی کے لئے ایک لیگل فریم ورک آرڈر بھی دیا تھا اس میں دستور سازی کو ملک کے اساسی نظریات کے دائرے میں محدود رکھنے کی پابندی عائد کی تھی۔ اسمبلی کے ارکان پر لیگل فریم ورک آرڈر کے اندر رہ کے دستور بنانے کا حلف اٹھانے کی شرط رکھی تھی اور اس فریم ورک سے انحراف کرنے پر دستور کی منظوری روک لینے کا اختیار بھی انہوں نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ بظاہر یہ سب اقدامات ملک کی سلامتی اور اساسی نظریئے کے لئے تحفظات کی حیثیت رکھتے تھے مگر ۱۹۵۴ء کے آئین کو یا ۱۹۵۶ء کے آئین کو اپنانے کا آسان راستہ اختیار کرنے کے بجائے ایک دشوار گزار راستہ اختیار کرنے کا آخر کیا مقصد تھا، بجز اس کے کہ دستور سازی پر پھر سے ایک بحران پیدا ہو جائے؟

یہ بات بھی سب کو صاف نظر آ رہی تھی کہ دستور سازی میں صوبائی خودمختاری کا طے شدہ مسئلہ پھر سے چھڑے گا۔ چھ نکاتی فارمولا بھی ابھر سکتا ہے۔ ایسے حالات میں ون یونٹ کا توڑ دیا جانا اور نشستوں کی مساوات کو ختم کرنے کا مطلب اس کے سوا کیا تھا کہ صوبائی خودمختاری کے ساتھ ساتھ نشستوں کی تقسیم کا قضیہ بھی کھڑا ہو جائے؟

انتخابات میں عوامی لیگ کی غیر معمولی کامیابی اور اسمبلی میں اسے حاصل ہونے والی اکثریت مطلقہ (ASOLUTE MAJORITY) دیگر حیثیتوں سے پریشان کن بات سہی، اس اعتبار سے اطمینان بخش بات تھی کہ ۱۲۰ دن کے اندر دستور بننا ممکن العمل ہو گیا تھا۔ اس سے کچھ اور نہ ہوتا تو کم سے کم جمہوریت تو بحال ہو ہی جاتی۔ یہ امر بھی قطعی تھا کہ مرکزی اقتدار کا حقدار بن جانے کی وجہ

Marfat.com

سے اب عوامی لیگ چھ نکاتی منشور کو علانیہ یا درپردہ ترک کر دے گی اور مضبوط مرکز کا حامل دستور بنائے گی ورنہ کم سے کم اتنے اختیارات مرکز کے ہاتھ میں ضرور رہنے دے گی جتنے اس وقت تک اسے حاصل تھے۔

مگر یہ صورت حال جہاں ملک کے مفاد میں لائقِ اطمینان تھی وہاں یحییٰ خاں کے لئے موجب بے اطمینانی تھی۔ بے اطمینانی میں مبتلا ہونے والی دوسری شخصیت بھٹو کی تھی جو اتفاق سے یحییٰ خاں کے دوست بھی تھے۔ چنانچہ ان دونوں نے باہمی سازش کے تحت مجیب الرحمٰن سے مطالبہ کیا کہ وہ برسرِ عام چھ نکات میں ترمیم کی یقین دہانی کرائیں۔ مجیب الرحمٰن برسرِ عام اس قسم کی یقین دہانی کرانے سے معذور تھے اس لئے اسمبلی کا اجلاس نہیں ہونے دیا گیا اور علیحدگی پسندی کا الزام دھر کے مجیب الرحمٰن اور ان کی جماعت کے ساتھ ایسی محاذ آرائی کی گئی جو مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے اور اس کے سقوط پر منتج ہوئی۔

اس مسئلے میں سب سے سنسنی خیز بات یہ ہے کہ مجیب الرحمٰن نے یحییٰ خاں اور بھٹو کے حسبِ خواہش چھ نکاتی فارمولے میں مناسب ترمیمیں کر دی تھیں اور مشرقی پاکستان میں مامور مارشل لا کے ذمہ دار حکام کے ذریعے یحییٰ خاں تک پہنچوا بھی دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود یحییٰ خاں محاذ آرائی کے راستے پر گامزن رہے۔ مطلوبہ ترمیمیں کروا لینے کے بعد بھی محاذ آرائی برقرار رکھنا اور اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دینا ملک کے ساتھ کھلی ہوئی دشمنی تھی جس پر قوم کو ان دونوں کے ساتھ دشمنوں کا برتاؤ کرنا چاہئے تھا مگر ہم سب کی بے خبری کہ ہم پر اس واقعے کا انکشاف برسوں بعد ہوا۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ بات مان لی جائے کہ محولہ بالا ترمیمی فارمولا ایک من گھڑت بات ہے مجیب الرحمٰن آخر وقت تک چھ نکات پر ہی مصر رہتے تو ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ چھ نکات پر مبنی دستور کو قبول کرنا اس بات سے بدرجہا بہتر بات ہوتی کہ ملک کے دونوں بازوؤں کے مابین محاذ آرائی کرائی جائے اور ایک بازو کو خون ریزی کے ذریعے علیحدگی کے راستے پر دھکیلا جائے۔ اگر چھ نکات پر مبنی دستور بنتا تو ملک کے دونوں بازو کم سے کم ایک کنفیڈریشن کے ذریعے ایک دوسرے سے وابستہ رہ سکتے تھے۔ اہلِ مشرقی پاکستان کو اگر یہ رشتہ بھی گوارہ نہ ہوتا تو وہ بہت خوش اسلوبی کے ساتھ علیحدہ ہو سکتے تھے۔ چھ نکات پر مبنی دستور بننے کی صورت میں مغربی پاکستان کو یہ خوف دامن گیر تھا کہ ون یونٹ

Marfat.com

توڑا جا چکا ہے اس لئے اس کے چاروں صوبوں کو بھی اتنی ہی خود مختاری دینی پڑے گی جتنی کی خواہاں مشرقی پاکستان ہے۔ اس اندیشے سے مغربی پاکستان کو بچانے کے لئے عوامی لیگی قیادت نے مغربی پاکستان کے صوبوں کا ایک علاقائی وفاق (ZONAL FEDERATION) قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی اور واقعہ یہ ہے کہ علاقائی وفاق مسئلے کا بہترین حل تھا۔ مگر اس معقول تجویز کو بھٹو صاحب نے مسترد کر دیا۔

مشرقی پاکستان کا سقوط ایک اندوہناک حادثہ سہی، اب پاکستان کے آنے والے دن نہایت خوشگوار ہونے چاہئیں تھے کیونکہ مغربی پاکستان کے صوبوں کے مابین ان تنازعات کا وجود نہ تھا جو مغربی اور مشرقی پاکستان کے مابین تھے۔ زیادہ سے زیادہ ایک مسئلہ تھا جس پر بعض صوبوں میں کسی قدر بے اطمینانی تھی وہ مسئلہ ون یونٹ کا تھا۔ چھوٹے صوبے ون یونٹ پر کسی قدر ناخوش تھے۔ سو اسے یحییٰ خاں نے قبل ازیں توڑ دیا تھا۔ اسے توڑنے سے جو نقصان پہنچنا تھا پہنچ چکا تھا۔ اب اس سے فائدے حاصل ہونے چاہئیں تھے یعنی چھوٹے صوبوں کی تالیف قلب کر دی گئی تھی۔ اس لئے اب چاروں صوبے باہم مل کر ہم آہنگی اور باہمی تعاون کے ساتھ مل کر ترقی اور خوشحالی کے راستے پر آگے بڑھ سکتے تھے۔

اس کام کی ابتدا یہاں سے ہونی چاہئے تھی کہ مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد اقتدار اسمبلی کو منتقل کیا جاتا۔ یحییٰ خاں ۲۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کو منعقد کی جانے والی اسمبلی کے اجلاس کے لئے ایک آئینی مسودہ تیار کرا چکے تھے اور یہ بھی طے کر چکے تھے کہ اب اسمبلی پر دستور بنانے کی ذمہ داری نہیں ڈالی جائے گی بلکہ اس کا کام صرف یہ ہوگا کہ وہ ان کے پیش کردہ دستوری مسودے میں نوّے ۹۰ دن کی مہلت میں جتنی کاٹ چھانٹ کرنا چاہتی ہو کر لے۔ اس کے بعد یہی مسودہ ملک کا مستقل دستور ہوگا۔ اگر وہ اس فیصلے پر عمل درآمد کراتے تو آگے چل کر کسی قسم کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ نئے دستور کے تحت مرکز میں اور سندھ و پنجاب میں پیپلز پارٹی حکومت بناتی اور بلوچستان و سرحد میں نیپ اور جمعیت علماء اسلام وزارتیں بناتیں۔ مگر یحییٰ خاں کا یہ واحد معقول فیصلہ بھی روبہ عمل نہ آسکا۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ذوالفقار بھٹو جب اقوام متحدہ کے اجلاس سے واپس آئے تو اقتدار ان کے حوالے کر دیا گیا۔ عام خیال یہ ہے کہ بھٹو کے نام اقتدار کی منتقلی یحییٰ خاں کی رضامندی سے عمل میں نہ آئی بلکہ چوٹی کے فوجی افسروں لیفٹیننٹ جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم کی اثراندازی سے عمل میں آئی تھی۔ سبب خواہ کچھ بھی رہا ہو، بھٹو صاحب پر واجب تھا کہ وہ اقتدار خود اپنے

ہاتھ میں نہ لیں بلکہ اسمبلی کو منتقل ہونے دیں ۔ وہ ایسا کرتے تو مطلق العنان حکمرانی کی جگہ پر جمہوریت بحال ہو جاتی بلکہ جمہوریت کی تاریخ میں ایک نظیر قائم ہو جاتی اور اس سے جمہوریت کی تعمیر نو اور استحکام میں مدد ملتی ۔ بھٹو صاحب کی ذات کو اس سے مطلقاً نقصان نہ پہنچتا ۔ اسمبلی میں اکثریت مطلقہ انکی جماعت کو حاصل تھی لہذا اقتدار کے مالک وہی بنتے مگر انہوں نے اسمبلی کے ہاتھ سے اقتدار لے کر اس کا ممنون احسان ہونا پسند نہ کیا کیونکہ وہ ، جیسا کہ ان کے بعد کے اقدامات نے ثابت کیا ، اسمبلی کے تابع رہنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اسمبلی کو تابع بنا کر رکھنا چاہتے تھے ۔

اقتدار کے منصب پر فائز ہونے کے بعد انہوں نے پے در پے ایسے اقدامات کئے جن سے یہاں بھی صوبوں (کم سے کم سرحد اور بلوچستان) اور مرکز کے مابین محاذ آرائی کا آغاز ہو گیا ۔ اور نت نئے آئینی مسائل نمودار ہونے لگے ۔

بھٹو ایک منتخب رہنما ہونے کے باوجود چار ماہ تک مارشل لا ایڈ منسٹریٹر بنے رہے ۔ اس کے بعد انہوں نے عبوری آئین بنوایا ۔ اپنے منشور میں کئے گئے وعدے کے برعکس اسے پارلیمانی کے بجائے صدارتی طرز پر مرتب کرایا ۔ صدارتی بھی ایسا کہ دنیا کے کسی صدارتی دستور سے اس کی کوئی مماثلت نہ ہو ۔ یعنی اسمبلی کے اختیارات بھی اپنے ہاتھ میں لے لئے ۔ اب اسمبلی ان کی مرضی کے خلاف کوئی قانون نہیں بنا سکتی تھی ۔ انہوں نے اس امر کا بھی اختیار حاصل کر لیا کہ وہ جب چاہیں اسمبلی کو برطرف کر دیں ۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اسمبلی کے توسط سے اقتدار حاصل کرنے میں گریز کی وجہ ان کے ان اقدامات سے ہی سمجھ میں آئی ۔ اب وہ اسمبلی کے تابع نہیں تھے بلکہ اسمبلی ان کی مرضی کے تابع تھی ۔ اسمبلی سے انہوں نے اس انتہا درجے کی تابعداری کرائی کہ مارشل لا کو ۱۴ اگست ۱۹۷۲ تک برقرار رکھنے کی رضامندی حاصل کی جو اسمبلی کے لئے بڑے شرم کی بات تھی ۔

اسمبلی کو پوری طرح تابع بنا لینے کے بعد ان میں اتنی ہمت ہوئی کہ وہ بلوچستان اور سرحد میں بھی ، وہاں کی اکثریتی پارٹیوں کو نظر انداز کر کے اپنی پسند کی حکومتیں بنائیں ۔ ان کے "نئے پاکستان" کا یہ دوسرا بڑا مسئلہ تھا جسے نئے پاکستان کے خالق نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا تھا ۔ اس پر ان دونوں صوبوں میں بے اطمینانی کا اور مرکزی حکومت کے خلاف غم و غصہ کا پیدا ہونا فطری امر تھا ۔

اس کے بعد انہوں نے زبان کے مسئلے کو لیا اور اس طے شدہ مسئلے کو کہ اردو ملک کی سرکاری

Marfat.com

زبان ہو گی، متنازعہ مسئلہ قرار دیا اور بنگلہ کے اخراج کے بعد سندھی کو اس کی جگہ دلانے کے لئے سندھ میں اسے صوبے کی سرکاری زبان بنانے کا بل منظور کرایا۔ اس طرح یہ ملک جس نے ۲۵ سال بعد دولسانی تقضیئے سے نجات پائی تھی اسے صرف چند ماہ بعد پھر سے دولسانی ملک بنا دیا۔ ان کی اس حرکت کی وجہ سے جہاں سندھیوں اور غیر سندھیوں کے مابین فسادات ہوتے وہاں کراچی کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تحریک نے شدت حاصل کی۔ چند ماہ کی مختصر سی مدت میں نئے پاکستان کے خالق نے تین آئینی مسائل تخلیق کر دیئے۔

بلوچستان اور سرحد میں حزب اختلاف کی صوبائی حکومتوں کا وجود انہیں گوارہ نہ ہوا اور عراقی اسلحے کی درآمد کو نہایت بے جا طور پر نیشنل عوامی پارٹی سے منسوب کر کے ان کی حکومتیں انہوں نے ختم کر دیں۔ ان کے اس ناروا اقدام سے وہاں کے عوام میں مرکز کی طرف سے صوبوں کی حق تلفی اور محرومی کا احساس پیدا ہوا۔ اس اقدام نے ایک نیا آئینی مسئلہ پیدا کیا۔ وہ یہ کہ مرکزی حکومت کو صوبائی حکومت کی برطرفی کا اختیار نہیں ہونا چاہیئے حالانکہ یہ اختیار مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ابتدا سے چلا آ رہا تھا۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی دفعہ ۹۲ الف میں اس امر کی گنجائش رکھی گئی تھی کہ ضرورت پڑنے پر مرکزی حکومت صوبائی حکومت کو ختم کر کے وہاں متبادل نظام قائم کر سکتی ہے۔ آئین میں یہ گنجائش اس وجہ سے رکھی گئی تھی کہ اگر کسی سبب سے صوبے کی انتظامی مشینری نظم و نسق بحال رکھنے میں ناکام ہو جاتے یا کوئی شورش برپا ہو جائے تو مرکزی حکومت بالراست مداخلت کے ذریعے صورت حال پر قابو پا سکے۔ آزادی کے بعد ہندوستان نے بھی اس قانون کو اپنے دستور میں برقرار رکھا اور پاکستان نے بھی۔ ہندوستان کے دستور میں اس کی موجودگی اس کے دستور کی بہت بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے اور اسی دفعہ کی موجودگی کی وجہ سے دستوریات کے عالمی ماہرین اسے بیک وقت دو جداگانہ دساتیر کی خصوصیات کا حامل قرار دیتے ہیں کہ یہ بیک وقت وفاقی بھی ہے اور وحدانی بھی۔ عام حالات میں یہ وفاقی ہے اور جب ضرورت محسوس ہو تو محض ایک صدارتی فرمان کے ذریعے اسے وحدانی بنایا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں یہ دفعہ ہمیشہ برقرار رکھی گئی ہے اور لوقت ضرورت اسے استعمال بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً ۱۹۴۹ء میں پنجاب میں نواب ممدوٹ کی وزارت اسی قانون کے ذریعے ختم کی گئی۔ ۱۹۵۲ء میں تحریک ختم نبوت کے زمانے میں ممتاز دولتانہ کی وزارت اسی قانون کے ذریعے برطرف ہوئی۔ ۱۹۵۴ء میں فضل الحق

کی وزارت کی برطرفی اسی قانون کے تحت عمل میں آئی یا ایوب کھوڑو کو اسی قانون کے تحت وزارت عالیہ سے ہٹایا گیا مگر ان تمام مواقع پر اس قانون کو بہت سوچ سمجھ کے اور نہایت احتیاط کے ساتھ استعمال کیا گیا جس کی وجہ سے اس قانون کے خلاف کوئی عمومی شکایت یا بے چینی یا احساس حق تلفی پیدا نہیں ہوا مگر بھٹو نے اس قانون کو نہایت بے جا اور ناروا طریقے پر استعمال کیا جس کی وجہ سے مذکورہ صوبوں کی طرف سے مطالبہ کیا جانے لگا کہ مرکز کو صوبائی حکومت کی برطرفی کا اختیار نہیں ہونا چاہیے۔

ہنگامی حالت کا اعلان کرنے کا اختیار بھی ہر ملک کے آئین میں مرکزی حکومت کو حاصل ہوتا ہے اور اس اعلان کے ساتھ ہی شہریوں کے بنیادی حقوق معطل ہو جاتے ہیں۔ مگر جمہوری ممالک میں حکومتیں اس اختیار کو صرف حالت جنگ میں استعمال کرتی ہیں یا پھر ایسی حالت میں جب ملک میں کوئی بغاوت یا شورش برپا ہو گئی ہو۔ حالت جنگ ختم ہوتے ہی یا بغاوت فرو ہوتے ہی ہنگامی حالت ختم ہو جاتی ہے۔ ہنگامی حالت کے دوران بنیادی حقوق کُل کے کُل معطل نہیں کئے جاتے بلکہ صرف شہری آزادیاں معطل کی جاتی ہیں۔ یعنی حکومت کسی شہری کو اگر چاہے تو گرفتار کر سکتی ہے۔ عدالتوں کو اس کی گرفتاری کے خلاف مقدمے کی سماعت کا اختیار نہیں ہوتا۔ مگر بھٹو صاحب نے اسے حالت جنگ ختم ہونے کے بیس۲۰ ماہ بعد ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء کو اٹھایا۔ اس تاریخ کو ۱۹۷۳ء کا آئین نافذ کرنے کے بعد، ستم ظریفی دیکھئے کہ دوسرے دن سے پھر اسے مسلط کر دیا۔ اس پورے عرصے میں بے شمار آدمیوں کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کیا گیا۔ گویا یہ دفاعی قانون تشدد کا ایک ہتھیار بن گیا جسے حکومت نے اپنے سیاسی مخالفین کے علاوہ عام شہریوں کے خلاف بھی جا و بے جا طور پر استعمال کیا۔ ان حرکتوں کی وجہ سے یہ قانون شہریوں کے لئے ایک عذاب بن گیا۔

۱۹۷۳ء کا آئین حکومت اور سیاسی جماعتوں کے مابین مفاہمت کی نہایت اچھی اور قابل قدر دستاویز تھا مگر اس کے فوائد جب ہی سامنے آ سکتے تھے جب اس پر ایمانداری کے ساتھ عمل بھی کیا جاتا۔ اس دستور میں شہریوں کو اور صوبوں کو جتنا کچھ اور جو کچھ دیا گیا تھا اس سے فائدہ اٹھانے اور متمتع ہونے کا انہیں موقع نہیں دیا گیا کیونکہ اس دستور کے نفاذ کے دوسرے ہی دن پھر سے ہنگامی حالت نافذ کر دی گئی۔ دوسری طرف حکومت نے جو اختیار اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا اسے ہنگامی حالت کے پردے میں بڑی بے دردی کے ساتھ استعمال کیا۔ مثلاً نئے آئین کے نفاذ کے بعد بھی بلوچستان اور

Marfat.com

سرحد میں حزب اختلاف کی وزارتیں بحال نہیں کی گئیں۔ حالانکہ حزب اختلاف نے اس آئین پر دستخط کر کے بڑی عالی ظرفی کا ثبوت دیا تھا۔ ڈیفنس آف پاکستان رولز کو بھی بدستور استعمال کیا جاتا رہا۔

اسمبلی اور صدر مملکت کے اختیارات کو بھی بالواسطہ طور پر وزیر اعظم کے ہاتھ میں مرتکز کر دینے کے نتائج بعد کے آنے والے دنوں میں قوم نے نہایت بھیانک شکل میں دیکھے۔ الیکشن کمشنر کے عہدے پر وزیر اعظم کی پسند کا آدمی مامور ہوا جس کی وجہ سے ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں وزیر اعظم نے من مانے انتخابی نتائج مرتب کرائے اور اقتدار پر دوبارہ تسلط حاصل کر لیا۔ اگر الیکشن کمشنر کا تقرر صدر مملکت کی مرضی سے ہوتا تو غالب امکان اس امر کا تھا کہ انتخابات میں اس نوع کی بدعنوانیاں نہ ہونے پاتیں جو ہوئیں۔ اگر ہوتیں تو صدر مملکت الیکشن کمشنر کے خلاف کارروائی کر سکتے تھے۔

افواج پاکستان کو وزیر اعظم کے اختیار میں دے دینے کا نقصان یہ ہوا کہ انہوں نے بلوچستان کے سیاسی مسئلے کو فوجی قوت کے زور پر دبانا چاہا اور اس سے بلوچستان میں محاذ آرائی اور خون ریزی کی کیفیت پیدا ہوئی جس کی تلخی آج تک قائم ہے۔ اگر یہ اختیار صدر مملکت کے ہاتھ میں ہوتا تو اس امر کا ہرگز اندیشہ نہ تھا کہ صدر مملکت سیاسی تنازعات میں فوج کو استعمال کریں گے۔

چیف جسٹس کے تقرر کا اختیار وزیر اعظم کے ہاتھ میں آ جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی پسند کے جج کو اس عہدے پر فائز کرنے کے لئے وزیر اعظم نے ریٹائرمنٹ کی عمر میں توسیع کا قانون بنایا۔ اگر صدر مملکت کے ہاتھ میں یہ اختیار ہوتا تو وہ ریٹائرمنٹ کی عمر کے معاملے میں سابقہ روایات سے انحراف کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ صدر مملکت کے اختیارات میں وزیر اعظم کی مذکورہ بالا دخل اندازیوں کی وجہ سے اس وقت یہ بھی ایک اہم آئینی مسئلہ ہے کہ وزیر اعظم اور صدر مملکت کے مابین اختیارات کی تقسیم میں توازن پیدا کیا جائے۔ یعنی وزیر اعظم سے وہ اختیارات چھین کر صدر مملکت کو واپس کئے جائیں جو ۱۹۷۳ء کے آئین میں وزیر اعظم نے غصب کر لئے تھے۔

سرکاری ملازمین کے لئے انتظامی عدالتوں (ADMINISTRATIVE COURTS) کا قیام بظاہر تو بڑی اچھی بات تھی کہ اس سے عام عدالتوں پر مقدمات کا بوجھ کم ہو جاتا اور انتظامی عدالتوں کے ذریعے فیصلے جلد حاصل ہوا کرتے مگر اس کے فیصلوں کے خلاف کھلی عدالت میں اپیل کا راستہ بند کر دیا گیا جس سے ثابت ہوا کہ انتظامی عدالتوں کے قیام کا اصل مقصد سرکاری ملازمین کو وزیر اعظم کا

Marfat.com

تابع فرمان بنائے رکھنا ہے۔ چنانچہ سرکاری ملازمین بلاچون وچرا وزیراعظم کے احکام کی تابعداری کرنے لگے یہاں تک کہ ان سے قتل اور اقدام قتل تک کے کام کروائے جانے لگے۔

حزب اختلاف کو اور مخالف سیاسی کارکنوں کو کچلنے کے لئے کھلی عدالتوں کا دروازہ بند کرکے خصوصی عدالتیں (TRIBUNALS) قائم کی گئیں ان کی وجہ سے جیل خانے سیاسی کارکنوں سے بھر گئے۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے زمانے میں لاتعداد افراد جیلوں میں بند کردیئے گئے۔ اگر خصوصی عدالتیں قائم نہ کی جاتیں یا کھلی عدالتوں میں اپیل کرنے کا دروازہ کھلا رہتا تو یہ صورت حال پیدا نہ کی جاسکتی تھی۔

اسمبلی کو توڑ دینے اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کو مسترد کر دینے کا اختیار، بالواسطہ طور پر وزیراعظم کے ہاتھ میں دے دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۷۳ء کا آئین حزب اختلاف سے منظور کرا لینے کے بعد وزیراعظم نے اس میں پے درپے پانچ بار ترمیمیں کرڈالیں جس کی وجہ سے آئین کی بہت سی خوبیاں معنوی اعتبار سے ختم ہوگئیں۔ عوام کے بنیادی حقوق کے تحفظ کا جو تھوڑا بہت اختیار عدالتوں کے ہاتھ میں باقی رہ گیا تھا اسے بھی ان ترمیمات کے ذریعے غصب کرلیا گیا۔ ان ترمیموں کے ذریعے وزیراعظم نے حزب اختلاف کے ساتھ صریح دھوکہ کیا۔ اگر اسمبلی کے اختیارات پر وزیراعظم کی بالادستی نہ ہوتی تو وہ دھوکہ دہی نہیں کرسکتے تھے۔ اس لئے یہ بھی ایک اہم آئینی مسئلہ ہے کہ ان ترمیموں کو آئین سے حذف کیا جائے۔

اسلامی قانون کا نفاذ ـــــ ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل

پاکستان کی تہائی صدی کی تاریخ میں پہلی بار حکومت نے اسلامی نظام کے نفاذ کی ضرورت کو صحیح طریقے پر محسوس کیا۔ اس کام کی ضرورت کو محسوس کرنا نہایت قابل قدر بات ہے کیونکہ ملک کی گزشتہ

Marfat.com

تیس سالہ تاریخ نے یہ بات پوری طرح عیاں کردی تھی کہ اسلامی نظام کے قیام کے ذریعے سے غفلت نے ملک میں جو نظریاتی خلا پیدا کیا ہے اسے صوبائی ونسلی تعصبات اور لادینیت پُر کررہی ہے۔ تعصبات اور لادینیت نے اگر اس خلا کو پوری طرح پُر کرلیا تو ایک طرف بحیثیت مسلمان اہل وطن کا تشخص مٹ جائے گا دوسری طرف ملک کا سیاسی وجود بھی منتشر ہو جائے گا۔

حکومت نے اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا کہ مارچ سے جولائی تک ملک کے طول وعرض میں جو تحریک چلائی گئی ہے وہ بادی النظر میں بھٹو صاحب کی برطرفی یا الیکشن کے دوبارہ انعقاد کے لئے سہی، مگر درحقیقت اس ملک میں نظام مصطفیٰ کے قیام کی خاطر تھی۔ جس بات نے اس حقیقت کو ثابت کیا وہ یہ تھی کہ تحریک کو کچلنے کے لئے جب بھٹو صاحب نے تشدد کا حربہ استعمال کرنا شروع کیا اور جلسوں اور جلوسوں میں شریک ہونا، موت کو دعوت دینے کے مترادف بن گیا تو اس کے بعد عوام گھروں سے کلمہ پڑھ کر، اپنے اہل خانہ سے قصور معاف کرا کے اور اپنی گردنوں میں قرآن مجید لٹکا کر، ان جلوسوں میں شرکت کی غرض سے نکلنے لگے۔ اس نے یہ بات قطعی طور پر ثابت کردی کہ عوام بھٹو کے خلاف اسلام کی خاطر اور نظام مصطفیٰ کی خاطر برد آزما ہیں۔

اسلامی قانون کے نفاذ کا کام اس نقطے سے شروع کیا گیا جہاں تک پاکستان کی سابقہ حکومتیں گزشتہ تیس سالوں میں بدقت تمام بلکہ با دل نخواستہ چیونٹی کی رفتار سے پہنچی تھیں۔ گزشتہ سالوں میں صرف اس قدر کام ہوا تھا کہ قرارداد مقاصد پاس کی گئی تھی، تمام قوانین کو قرآن وسنت کی روشنی میں از سر نو وضع کرنا طے کیا گیا تھا اور اس کام کے لئے ایک اسلامی نظریاتی کاؤنسل بنائی گئی تھی۔

حکومت نے اس نقطے سے کام کو آگے بڑھایا۔ سب سے پہلے ستمبر ۱۹۷۷ء میں کاؤنسل مذکور کی تشکیل نو کی گئی۔ جناب ریٹائرڈ جسٹس افضل چیمہ کی سربراہی میں مولانا ظفر احمد انصاری، جناب خالد اسحاق، مولانا شمس الحق افغانی، مفتی سیاح الدین کاکا خیل، مولانا محمد تقی عثمانی، علامہ جعفر حسین مجتہد وغیرہ اس کاؤنسل کے ارکان مقرر کئے گئے اور انہیں یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے ترجیحات (PRIORITIES) مقرر کریں اور قرآن وسنت کے احکامات کی قانون کی شکل میں تدوین (CODIFICATION) کا کام کریں تاکہ ان کا نفاذ عمل میں آسکے۔

کاؤنسل کے مشورے سے حکومت نے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل ابتدائی اقدامات کئے۔

۱۔ تمام مروجہ عدالتی قوانین کے لئے اعلیٰ عدالتوں کو اختیار تفویض کیا گیا ہے کہ وہ جن قوانین کو سمجھتے ہوں عدالتی فیصلے کے ذریعے قرآن وسنت کے منافی قرار دیں۔

فیڈرل شریعت کورٹ کو اس امر کا اختیار دیا گیا ہے کہ عوام جس قانون کے بارے میں اس سے رجوع کریں وہ یہ فیصلہ دے کہ وہ قانون قرآن وسنت کے منافی ہے یا موافق؟ مذکورہ دونوں قسم کی عدالتوں کو اس نوع کا اختیار تفویض کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ جس قانون کو قرآن وسنت کے منافی قرار دیں گی اس قانون کے تحت فیصلہ دینے کی کوئی عدالت مجاز نہ رہے گی اور ان قوانین کی جگہ اسلام کے عدالتی قوانین لے لیں گے۔

چنانچہ ملک کے شہریوں کے رجوع کرنے پر ہماری مذکورہ عدالتیں تعزیرات پاکستان اور ضابطۂ فوجداری کے متعدد قوانین کو خلاف شریعت قرار دے چکی ہیں۔ ان قوانین میں تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۵۴، ۵، ۳۰۲ اور ضابطۂ فوجداری کی دفعات ۳۴۵ (۷)، ۴۰۱، ۴۰۲ اور ۴۰۲ بی اور شیڈول کے متعلقہ حصّے دفعہ ۳۴، ۳۰۴ اے، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۳۱، ۳۲۹، ۳۳۳، ۳۳۵، ۳۳۸ شامل ہیں لہٰذا اب کوئی عدالت ان قوانین کے تحت فیصلے نہیں دے سکے گی۔

۲۔ شراب کی خرید وفروخت قانوناً ممنوع قرار دے دی گئی ہے اور شراب کی دکانیں بند کردی گئی ہیں۔ اس کا اتنا فائدہ سامنے آچکا ہے کہ شراب کی علانیہ خرید وفروخت بند ہوگئی ہے اور اس کی وجہ سے شراب نوشی میں بلاشبہ قابلِ لحاظ حد تک کمی واقع ہوئی ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ پرانے شراب خور اگر کسی طرح چوری چھپے اپنا یہ مذموم شغل جاری رکھنے میں کامیاب رہے جب بھی ان کی یہ خوئے بد اگلی نسل کو منتقل نہ ہوسکے گی۔

۳۔ اسلام کے عدالتی قوانین میں سے ایسے قوانین کو جنہیں حدود کہتے ہیں، ان میں سے چار قوانین کو ۲۳، مارچ ۱۹۷۹ء سے نافذ کردیا گیا ہے۔ یہ زنا، تہمتِ زنا (قذف) چوری و ڈاکہ زنی اور شراب نوشی کے ارتکاب پر قرآن وسنت کی مقرر کردہ سزائیں ہیں۔ ان جرائم پر مقدمہ چلانے کے لئے مخصوص عدالتیں قائم کی گئیں ہیں جو فیڈرل شریعت کورٹ کہلاتی ہیں۔ ان کا مرتبہ ہائی کورٹ کے مساوی ہے اور یہ عدالتیں ہائی کورٹ کے منتخب ججوں پر مشتمل ہیں۔

شریعت کورٹ کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت کے لئے ایک شریعت اپیل بنچ قائم کی گئی ہے جو سپریم کورٹ کے ہم مرتبہ ہے اور سپریم کورٹ کے ججوں پر مشتمل ہے۔

۴۔ نظام زکوٰۃ کو قائم کرنے کے لئے ملک بھر میں گاؤں، تحصیل، ضلع، صوبہ اور مرکز کی بنیاد پر

Marfat.com

کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں جن میں عوام میں سے نمائندے منتخب کئے گئے ہیں۔ ان کمیٹیوں کو صاحب صاحب نصاب سے زکوٰۃ وصول کرنے کا اختیار دیا گیا ہے اور ان کو وصول کردہ رقم مستحق افراد میں تقسیم کرنے کا اختیار بھی دیا گیا ہے۔ حکومت نے راست طور پر خود اپنے اہتمام میں بھی بنک کے کھاتہ داروں سے نصف ارب سے زیادہ کی زکوٰۃ وصول کی ہے۔ مستحقین میں اس کی تقسیم کا کام گزشتہ رمضان المبارک کے مہینے سے شروع کر دیا گیا ہے۔ سردست چار قسم کے افراد کو زکوٰۃ کے مستحقین کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے یعنی یتیم، بیوہ، جسمانی معذورین اور دینی مدرسوں کے طلبا۔ علاوہ ازیں حکومت نے اپنی طرف سے اس فنڈ میں سوا دو ارب روپے کی خطیر رقم دی ہے۔ توی امید ہے کہ آنے والے برسوں میں جب اہلِ وطن اس نظام کی برکات کو دیکھیں گے تو خود اپنی مرضی سے زکوٰۃ نکالنا شروع کر دیں گے اور ان کے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ بھی عمالِ حکومت کو حاصل ہونے لگے گی۔

۵۔ اقامت صلوٰۃ کے لئے ملک بھر کے سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر کو ہدایت جاری کی گئی ہے کہ وہ دفتری اوقات کار میں وقفہ دیں اور اس وقفے میں نماز باجماعت کا اہتمام کریں۔ اس ہدایت پر عمل کرانے کے لئے سرکاری طور پر اب تک کسی قسم کی سختی نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی محاسبہ کیا گیا ہے کہ اس ہدایت پر عمل درآمد کی کیفیت کیا ہے مگر ایک عام آدمی بھی جسے سرکاری دفاتر سے سروکار رہتا ہو بہ چشمِ خود دیکھ سکتا ہے کہ بہت سے دفاتر میں اس ہدایت پر بڑی خوش دلی کے ساتھ عمل درآمد ہو رہا ہے۔

۶۔ روزہ اسلام کا تیسرا بنیادی رکن ہے۔ اب سے پہلے بھی بلاشبہ حکومت عامتہ الناس سے روزے کا احترام کرواتی رہی ہے اور کھلے عام یا سرِ راہ کھانا پینا ممنوع رہا ہے مگر ہوٹلوں نے روزہ خوروں کو ایک زبردست جائے پناہ مہیا کر رکھی تھی جس کے دروازوں پر رمضان کے مہینے میں پردے آویزاں کر دئے جاتے تھے اور ان پردوں کے پیچھے خورد و نوش کا شغل عام دنوں سے زیادہ دھڑلے کے ساتھ جاری رہتا تھا یہ پردے روزہ نہ رکھنے کے لئے ترغیب کا سبب بنا کرتے تھے۔ مگر اب رمضان کے ایام میں تمام ہوٹل حکماً بند رکھے جاتے ہیں۔ اس لئے ان ایام میں روزہ رکھنا روزہ نہ رکھنے سے زیادہ باعثِ آسودگی ثابت ہونے لگا ہے۔

۷۔ سودی کاروبار جو اسلام کے بنیادی محرمات و ممنوعات میں سے ہے، اسے مٹانے کے

لئے ضروری اقدامات روبہ عمل لائے جارہے ہیں۔ اس ضمن میں ایک قدم یہ اٹھایا گیا ہے کہ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کی جانب سے تعمیر مکان کے لئے دیئے جانے والے قرضوں پر سود کی وصولیابی ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔ اس کی جگہ پر متبادل اسکیم وضع کی گئی ہے کہ ان قرضوں سے تعمیر ہونے والے مکان کی تعمیری لاگت کا اور اس کے ماہوار کرائے کا تعین کیا جائے گا۔ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کل تعمیری لاگت میں سے اپنے جاری کردہ رقم کی نسبت سے اپنا حصہ ماہوار کرائے کی رقم سے وصول کیا کرے گی۔ یہ گویا شرکت کا اصول ہوا۔ پھر جب اس کا قرضہ اسے واپس مل جائے گا تو وہ مکان کے کرائے کی رقم سے دست کش ہو جائے گی۔

دوسرا اقدام اس ضمن میں یہ کیا گیا ہے کہ نیشنل انوسمنٹ ٹرسٹ (NIT) اور انوسمنٹ کارپوریشن آف پاکستان کے منافع کو اب حقیقتاً سود سے پاک کر دیا گیا ہے لہٰذا ان اداروں میں سرمایہ کاری کرنا شرکت و مضاربت کے کاروبار میں شرکت کرنا ہے جس میں اب ہر شخص بلا تکلف شرکت کر سکتا ہے۔

بلا سود معیشت رائج کرنے کے لئے تیسرا اقدام تیاری کے مراحل میں ہے اور وہ یہ ہے کہ بینکاری کے پورے نظام کو سودی کاروبار کی بنیادوں سے اکھیڑ کر شرکت و مضاربت کے اصولوں پر کھڑا کیا جائے۔

اگر ہمارے ماہرین نے بلا سود معیشت رائج کرنے کا کام خلوصِ دل اور محنت کے ساتھ کیا تو چند برسوں میں عامۃ الناس اس کا فائدہ محسوس کریں گے کیونکہ سودی معیشت کے بارے میں ساری دنیا یہ بات اب ماننے لگی ہے کہ یہ نظام دولت کو عامۃ الناس کی جیبوں سے کھینچ کر چند ہاتھوں میں مرتکز کر دیتا ہے۔ یہ محض خیال نہیں حقیقت ہے جسے دنیا میں ہر جگہ بچشم سر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہودیوں کی جیبوں میں دنیا کے کونے کونے سے دولت جو کھنچ کر جمع ہو رہی ہے وہ ان کے سودی کاروبار کا ہی کرشمہ ہے۔ وہ اس میں حصہ لینے میں سب سے پیش پیش تھے اس لئے سب سے زیادہ دولت انہوں نے اکٹھی کی۔ اس ظالمانہ نظام کو دنیا کے ہر خطے سے مٹایا جانا چاہئے۔ کہیں اور سے نہیں ملتا تو کم سے کم مسلم ممالک سے ضرور ختم ہونا چاہئے کیونکہ ہمارے نزدیک یہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے۔

۸۔ عریانیت کی حوصلہ شکنی کے لئے ٹیلی ویژن پر رقص کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

Marfat.com

۹۔ خلفائے راشدین اور اہلِ بیت کی شان میں گستاخی کرنے کی سخت ممانعت کر دی گئی ہے۔ اس مقصد کے لئے آئین کی دفعہ ۲۹۷ میں اضافہ کیا گیا ہے جس کے بموجب گستاخی کرنا قابلِ تعزیر جرم قرار دیا گیا ہے۔ گستاخی کے مرتکبین تین سال قید با مشقت یا جرمانے یا دونوں سزاؤں کے مستوجب ہوں گے۔

۱۰۔ اسلامی قانون کے ماہرین پیدا کرنے کے لئے قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں ایک شریعت فیکلٹی کی گئی ہے۔

۱۱۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا کام جو ہوا ہے وہ یہ ہے کہ صدر مملکت نے علماء کانفرنس منعقدہ اسلام آباد میں اعلان کر دیا ہے کہ ملک میں اسلامی نظام کا قیام ان ۲۲ نکات کی مطابقت میں کیا جائے گا جو ملک کے مختلف مکاتبِ فکر کے ۳۱ اکابر علماء نے ۱۹۵۱ء میں مدون کئے تھے۔ (اس کا تفصیلی متن صفحہ ۳۸ پر ملاحظہ فرمائیے) یہ ۲۲ نکات بلاشبہ پاکستان کو ایک فلاحی اسلامی مملکت بنانے کے لئے بہترین رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسلامی نظام کے قیام کی طرف کئے جانے والے ان اقدامات کو پورے عالم اسلام میں تحسین اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے اور پورا عالم اسلام اس کی کامیابی کا آرزومند ہے۔ عالم اسلام کے چوٹی کے ماہرین قانون، ججوں اور علماء کرام نے اس کام کے لئے اپنا دست تعاون بڑھایا ہے۔ مسعودی عرب، شام، اردن، سوڈان، اومان، کویت، انڈونیشیا، بھارت، ایران اور دیگر متعدد ممالک کے ماہرین اس کام کو دیکھنے کے لئے اور اپنی صدق دلانہ خدمات پیش کرنے کے لئے پاکستان تشریف لا چکے ہیں اور اس کام کو دیکھ کر بیرون پاکستان کے علماء کرام اور ماہرین قانون کا حوصلہ اس قدر بڑھا ہے کہ انہوں نے اکتوبر ۱۹۷۹ء کے مہینے میں اسلامی کانفرنس کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی سہ روزہ شریعت کانفرنس منعقدہ اسلام آباد میں یہ سفارش کی ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان ماہرین قانون اور علماء کرام پر مشتمل مستقل بنیادوں پر ایک اسلامی قانون کمیشن بنایا جائے جو دنیا کے ہر خواہشمند مسلمان ملک کے لئے قانون کی تدوین (CODIFICATION) کا کام کرے۔

مگر نظریاتی تبدیلی کا کام مار دھاڑ اور قتل و غارت گری کے ذریعے نہیں ہوا کرتا کہ چند ہفتوں میں اسے انجام دے کر تبدیلی لے آئی جائے۔ نظریاتی تبدیلی کا کام ایک صبر آزما کام ہے جس کے لئے وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے برس دو برس میں اس سے ثمر آوری کی توقع کرنا بڑی عجلت پسندی ہو گی۔

Marfat.com

باب دوم

اسلامی نظام کی راہ میں رکاوٹیں

اسلامی نظام کا نفاذ عوام کی دیرینہ آرزو سہی مگر ہمارے اپنے ملک کے حالات کی روشنی میں اس کے نفاذ کے لئے دو باتیں لازمی اقتضا کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک یہ کہ ملک کی سیاسی وحدت برقرار رہے۔ دوئم یہ کہ قوم اسلام پر متحد و متفق رہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اس وقت ہمارے ملک کو ان دونوں معاملات میں خطرات درپیش ہیں۔ اگر ان خطرات کو دور نہ کیا گیا تو وہ ملک ہی ختم ہو جائے گا جہاں ہم اسلامی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں یا وہ قوم مٹ جائے گی جو اسلامی نظام کی خواہاں کہلاتی ہے۔ سیاسی وحدت کو خطرہ ان عناصر کی طرف سے لاحق ہے جو صوبائی خود مختاری میں بے حساب اضافے کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور بلا روک ٹوک اپنے مطالبے کا پرچار کر رہے ہیں جبکہ قومی وحدت کو خطرہ ان کی طرف سے لاحق ہے جو مسلمانوں کو فرقوں میں بانٹ رہے ہیں۔ یہ دونوں ہی طرح کے عناصر تنگ نظر، کوتاہ خیال اور عاقبت نا اندیش ہیں جنہیں یہ نظر نہیں آتا کہ اگر یہ ملک ختم ہو گیا تو وہ نام وری اور کامرانی حاصل کرنے کے بجائے تاریخ کا سبق عبرت آموز بن کر رہ جائیں گے یا ان کے دھڑے بندیوں کی بنا پر اس خطۂ ارض کی مسلمان قوم ٹوٹ گئی تو وہ تاریخ کا باب ملامت بن جائیں گے۔

صوبہ پرستی یا فرقہ بندی دونوں کی طرف سے تشویشناک بات یہ ہے کہ ان کا زور وشور کے ساتھ پرچار کیا جا رہا ہے اور اس پرچار سے سادہ لوح ذہن پراگندگی کا شکار ہو رہے ہیں مگر امید افزا بات یہ ہے کہ یہ دونوں قسم کے عناصر دلائل اور معقولیت کے ہتھیاروں سے محروم ہیں لہٰذا محب وطن افراد دلائل کے ذریعے بہ آسانی ان کا زور توڑ سکتے ہیں۔ دلائل کے ذریعے ان کا زور توڑ دیا جائے تو بچے کھچے فسادانگیزوں کی سرکوبی کوئی امر مشکل نہ رہے گی۔

سب سے پہلے مذکورہ بالا دونوں قسم کی عصبیتوں کی تنقیح ضروری ہے۔

Marfat.com

(الف) فرقہ پرستی

جب سے اسلامی قانون کی تدوین اور نفاذ کا کام شروع ہوا ہے ملت اسلامی کے بعض فرقوں کی طرف سے فقہی بنیادوں پر ان کی مخالفت کا آغاز ہو گیا ہے۔ یہ مخالفت دو فرقوں کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ ان میں سے ایک شیعہ حضرات کا ہے اور دوسرا سنیوں کے ایک ذیلی طبقے کا۔ کہنے کو تو یہ مخالفت محض فقہی نوعیت کی ہے مگر اس میں شدت اتنی زیادہ ہے کہ اس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اسلامی قانون کی تدوین اور نفاذ کا جو کام ہو رہا ہے وہ ان فرقوں کی نگاہ میں اسلام کے بجائے کفر اور ضلالت ہے۔ شیعہ حضرات کی طرف سے مخالفت شدید تر ہے۔ ان کی طرف سے شدت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے بعض اکابر علماء اس کام کی مزاحمت کی غرض سے خون کے دریا میں نہانے یا ترک وطن کرنے کے فتوے دے رہے ہیں۔ دوسرے طبقے کی طرف سے مخالفت میں اس نوع کی شدت تو نہیں ہے مگر ان کی طرف سے عدم تعاون کا طرزِ عمل اختیار کیا گیا ہے۔ شیعہ حضرات کا مطالبہ ہے کہ ملک میں فقہ جعفریہ بھی نافذ کی جائے جبکہ سنیوں کے مذکورہ طبقے کا کہنا ہے کہ اسلامی قانون فقہ حنفی کے بموجب ہو۔ گویا اسلام صرف فقہ جعفریہ یا فقہ حنفیہ کے دائرے میں محدود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا کے ان معدودے چند ممالک کو چھوڑ کر جہاں شیعہ یا حنفی مسلک کے پیروکاروں کی اکثریت ہے، دنیا کے کسی اور ملک میں اسلامی قانون کا نفاذ عمل میں نہیں آ سکتا نہ مصر میں، نہ شام میں، نہ لیبیا میں، نہ سوڈان میں اور نہ کہیں اور یا وہ کسی اور فقہ کو نافذ کریں تو وہ اسلام نہیں بلکہ ضلالت ہو گا۔ گویا کسی ملک کو اسلامی قانون نافذ کرنا ہو تو پہلے شیعہ یا حنفی مسلک کو اپنا لئے۔ شافعی یا حنبلی یا مالکی یا کوئی اور فقہ اسلامی قانون نہیں کہلا سکتا۔

اس مخالفت کا یہ پہلو نہایت دلچسپ ہے کہ شیعہ حضرات اس کی مخالفت اس نظریئے پر کر رہے ہیں کہ اسلامی قانون کی تدوین اور نفاذ کا جو کام کیا جا رہا ہے وہ (اسلام کے بجائے ؟) سنیت ہے۔ دوسری طرف سنیوں کے مذکورہ طبقے کی طرف سے اس کی مخالفت اس نظریئے کی بنیاد پر کی جا رہی ہے کہ یہ سنیت کے بجائے کچھ اور ہے۔ گویا صورت حال اس شعر کے بمصداق ہے کہ ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

محاذ آرائی اور مزاحمت کی یہ کیفیت دیکھ کر عام مسلمانوں کا یہ دیرینہ عقیدہ مسمار ہوا جا رہا ہے کہ توحید، ختم نبوت، آخرت اور آسمانی کتب پر ایمان رکھنے والے یا کلمہ طیبہ کا اقرار کرنے والے تمام افراد مسلمان ہیں اور ان کے مابین جتنا کچھ اختلاف ہے وہ محض فروعی نوعیت کا ہے۔

اس مسئلے کا المناک پہلو یہ ہے کہ ان فرقوں میں سے کوئی بھی اس امر کی صراحت نہیں کرتا کہ اسلامی قانون کے معاملے میں شیعیت اور سنیت کا فرق کن کن امور میں باہم متصادم ہوتا ہے۔ اور یہ کہ کیا یہ تصادم اس نوعیت کا ہے کہ مسلمانوں کا ایک فرقہ دوسرے فرقے کے ہاتھوں اپنے مذہبی عقیدے یا تعلیمات کو یا ان تعلیمات کی بجا آوری کو ناممکن العمل سمجھے؟

یہ ایک علمی مسئلہ ہے جس کا اخباری بیان بازی کے بجائے علمی سطح پر دیانتداری کے ساتھ جائزہ لیا جانا چاہیے تھا مگر افسوس کہ اس امر کے باوجود کہ اسلامی قانون کے خلاف محاذ آرائی کرنے والے افراد اپنے اپنے فرقوں کے معروف علماء ہیں سب نے علمی دلائل پیش کرنے سے پہلو تہی اور گریز کا رویہ اختیار کیا ہوا ہے اور ملت اسلامی کو ذہنی طور پر پراگندگی میں مبتلا ہونے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔

کسی قانون کے نفاذ کے لئے عوام کی تائید وحمایت لازمی ہوا کرتی ہے۔ اگر عوام اسلامی قانون کے نفاذ کے معاملے میں ذہنی پراگندگی اور انتشار خیال میں مبتلا ہو گئے تو اسلامی قانون کی تدوین و نفاذ کا کام کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا بلکہ آئندہ ہمارے لئے اسلام و ایمان پر قائم رہنا بھی شاید ممکن نہ رہے گا اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے مابین اختلاف کے دائرے کی حدود کا جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ کیا یہ دائرہ، جیسا کہ بعض کم نظر علماء دعوے کر رہے ہیں اس قدر وسیع ہے کہ بنیادی عقائد اور تعلیمات بھی ایک دوسرے سے متصادم ہیں یا یہ ایک ہی بنیادی عقیدے کے دائرے میں ان کے مابین محض تعبیر و توجیہہ کا اختلاف ہے جو ہر صیغۂ زندگی میں ماہرین کی جدا جدا تعبیرات کی بنا پر لازماً اور قدرتاً رونما ہوا کرتا ہے؟

سب سے پہلے ہمیں دیکھنا ہے کہ ہمارے مختلف فرقوں کے مابین اختلاف اور اتفاق کی مدیں کیا کیا ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام فرقے توحید پر، ختم نبوت پر، رسالت پر، آخرت پر، آسمانی کتابوں پر، اور قرآن وحدیث کے ماخذ ہدایت ہونے پر غیر متزلزل ایمان رکھتے

Marfat.com

ہیں۔ مسلمانوں کے تمام فرقے حج، زکواۃ، جہاد، پانچ وقتوں کی نمازاور ایک ماہ کے روزے کی فرضیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ نکاح کے ذریعے ازدواجی زندگی اختیار کرنے، ختم کرنے کے لئے طلاق یا خلع کا قانونی طریقہ کار استعمال کرنے، میراث کو قرآن وحدیث کے بموجب ورثاء میں تقسیم کرتے پر متفق ہیں۔ جرائم کے معاملے میں اسلامی حدود یعنی قتل کے بدلے قتل یا خون بہا، زنا کے ارتکاب پر سنگساری، چوری کے جرم میں قطع ید یا قطع انگشت، تہمت زنا اور شراب نوشی کے جرم میں درے لگانے کے قائل ہیں۔ سود، جوئے، سٹے، لحم خنزیر، غیر ذبیحہ کے حرمت پر ایمان رکھتے ہیں۔ ذخیرہ اندوزی، ناپ تول میں کمی، رشوت خوری اور ملاوٹ کو گناہ سمجھتے ہیں، خودکشی کو حرام مانتے ہیں۔ یتیم کا مال کھانا اور جھوٹی گواہی دینا گناہ عظیم سمجھتے ہیں۔ طہارت کی فرضیت کے قائل ہیں۔ جنگ میں دشمن کی عورتوں، بچوں، ضعیفوں اور معذوروں کو قتل کرنا یا ان کے کھیتوں کو اجاڑنا ممنوع سمجھتے ہیں۔ ایفائے عہد کی فرضیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ پردے کے وجوب کے قائل ہیں۔ قیام عدل میں دوست و دشمن کے درمیان امتیاز کو ناجائز سمجھتے ہیں۔

ان کے درمیان اختلاف ان احکام کی بجاآوری میں صرف جزئیات اور تفصیلات میں ہے۔ مثلاً یہ کہ نماز کی ادائیگی میں ہاتھ باندھ کر یا کھول کر کھڑے ہونے پر، یا رفع یدین کرنے یا نہ کرنے پر یا آمین بالجہر کہنے یا نہ کہنے پر اختلاف ہے۔ یا روزے میں سحری اور افطار کے اوقات کے تعین پر یا حج کے بعض مناسک کی ادائیگی پر یا وضو کے ضمنی ارکان پر یا پردے کی تعبیر پر کچھ اختلاف ہے۔ یہ اختلاف بنیادی طور پر تین وجوہات کی بنا پر پیدا ہوا ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے بعض احکام کا مختلف فقہا نے جدا جدا مفہوم سمجھا ہے۔ مثال کے طور پر مسح کے بارے میں قرآن کے حکم کا بعض فقہا نے یہ مفہوم متعین کیا ہے کہ پورے سر کا مسح کیا جائے جبکہ بعضوں کا خیال ہے کہ چوتھائی سر کا مسح کافی ہے۔ تعبیرات میں اختلاف کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض احادیث کی روایت اور سند بعض فقہا کے نزدیک معتبر ہے اور بعض کے نزدیک غیر معتبر یا بعض احادیث کا مفہوم مختلف فقہا کے نزدیک کچھ اور ہے اور بعضوں کے نزدیک کچھ اور۔ مثلاً بعضوں کے نزدیک احادیث سے آمین بالجہر ثابت ہے اور بعضوں کے نزدیک نہیں یا کچھ لوگوں کے نزدیک رفع یدین ثابت ہے جبکہ دوسروں کے نزدیک نہیں ہے۔ اختلاف کی تیسری وجہ یہ ہے کہ حضورؐ اور صحابہ کرامؓ کے بعد کے زمانوں میں پیدا

Marfat.com

ہونے والے ایسے مسائل میں جن کا حکم قرآن یا حدیث میں بہ صراحت موجود نہ تھا، قرآن وحدیث کی روشنی میں علمائے کرام یعنی مجتہدین نے اپنی صوابدید سے قوانین بنائے۔ ایک شخص کی صوابدید دوسرے سے اس طرح مختلف ہوسکتی ہے جس طرح سے قانون کی تعبیر میں ایک جج کی رائے دوسرے جج سے مختلف ہوسکتی ہے۔ سو یہ اختلاف تعبیر کا اختلاف ہے۔ ان تینوں قسموں کے اختلاف کو فقہی اختلاف کہا جاتا ہے اور اسے نہ کبھی ماضی میں دور کیا جا سکا نہ آئندہ دور کرا، کسی طرح ممکن العمل ہے۔ مگر یہ اختلاف جزوی نوعیت کا ہے اس لیے اس نوع کے مسائل میں اختلاف کرنے والے مجتہدین اور ان کو ماننے والے پیروکاروں میں سے کوئی بھی دائرۂ اسلام سے خارج نہیں کہلا سکتا۔ سب کے سب ایک اسلام ہی کے دائرے کے اندر رہتے ہیں۔

آج بھی نئے نئے رونما ہونے والے مسائل میں ہمارے علماء کرام اور مجتہدین جب قرآن وسنت کی روشنی میں تعبیر کرنے بیٹھتے ہیں تو ان کی رائیں مختلف اوقات ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتی ہیں۔ مثلاً تصویر کشی کے معاملے کو لیجئے۔ بعض علماء اس کی حلت کے قائل ہیں جبکہ بعض اسے حرام ٹھہراتے ہیں۔ اسی طرح ٹیلیفون پر نکاح کے معاملے میں ان کی آراء مختلف ہیں یا مردے کی چیر پھاڑ کے معاملے میں یا اعضاء کی پیوند کاری کے معاملے میں مجتہدین کے درمیان اختلاف ہے۔ ان مسائل میں اختلاف رائے رکھنے والے تمام کے تمام مجتہدین چونکہ قرآن وسنت کو ہی ماخذِ ہدایت مان کر اجتہاد کرتے ہیں اس لیے ان کے مابین آراء کا خواہ کتنا ہی اختلاف ہو، ان میں سے کسی کو بھی دائرہ اسلام سے خارج نہیں قرار دیا جا سکتا اور سب کے سب یکساں طور پر واجب الاحترام ہیں۔

لہٰذا کسی مخصوص فقہی قانون کو سلطنت اور معاشرت کے امور میں نافذ کرنے پر اصرار کرنا اور اسے اپنا دین وایمان سمجھنا بڑی کم نظری کی بات ہے۔ اور یہ نادانستہ طور پر اسلام کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔ مگر افسوس کہ مسلمانوں کے بعض کم نظر علماء صرف اپنے اعتقاد کے فقہی قوانین کو نافذ کرنے پر مصر ہیں۔ بصورت دیگر پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کی مزاحمت یا عدم تعاون پر تُلے بیٹھے ہیں۔ اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کرنے والے علماء میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خواہ اپنی شہرت وناموری کی بنا پر مرتبۂ اوج پر فائز ہوں مگر ان کی علمی تنگ دامانی کا یہ عالم ہے کہ جب ان سے علمی گفتگو کی جاتی ہے تو ان کے بارے میں یہ راز کھلتا ہے کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ عُشر اور خُمس میں کیا

Marfat.com

فرق ہے یا یہ کہ پاکستان کی قومی آمدنی کتنی ہے اور ممکنہ طور پر حاصل ہونے والی زکوٰۃ کی مالیت کیا ہو گی؟

صرف اپنے مسلک کے قانون کے نفاذ پر اصرار اور بصورت دیگر اسلامی قانون کے نفاذ کی مزاحمت یا اس کے ساتھ عدم تعاون کا رویہ اپنے اندر ایک زبردست اور افسوسناک داخلی تضاد بھی مضمر رکھتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ حضرات برصغیر میں انگریزوں کے کافرانہ نظام کو سینکڑوں سال سے گوارہ کرتے آرہے ہیں۔ بعضوں نے تو کبھی اس کے خلاف لب کشائی کرنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی، آزادی کے بعد سے اب تک کے ۳۲ - ۳۴ سالوں سے اس نظام کو اپنے کندھے پر لئے پھر رہے ہیں۔ سودی کاروبار میں، پرائز بونڈ کی خریداری میں، نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹوں کی خریداری میں سٹہ بازی اور جوئے پر قائم تجارتی کاروباری سرگرمیوں میں بلاواسطہ یا بالواسطہ طور خواہ وہ خود یا اُن کے اہل خانہ یا اہلِ خاندان شریک چلے آرہے ہیں مگر اس کے خلاف انہوں نے اپنی ایک دن کی نیند بھی کبھی حرام نہ کی۔ اب جبکہ خدا خدا کر کے قرآن وسنّت کا قانون نافذ ہونے کا وقت آیا ہے تو محض اس اختلاف کی بنا پر شمشیر بکف ہیں کہ اسلامی قانون کی تدوین ان کی فقہ کے مطابق نہیں کی جارہی ہے۔ ان میں سے بعض علماء خون کے دریا میں نہانے یا ترک وطن کرنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں اور پل بھر کے لئے یہ سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے کہ اگر ان کی مزاحمت یا مخالفت کی وجہ سے اسلامی قانون کے نفاذ کا کام ناکام ہو گیا تو وہ خود تو کیا ان کی آنے والی نسلیں بھی کبھی اسلامی قانون کے نفاذ کا نام زبان پر نہ لاسکیں گی۔ انہیں اس امر کا بھی کچھ خیال نہیں آتا کہ یہ کام تو اسلام دشمنوں کے کرنے کا ہے جو وہ انجام دے رہے ہیں۔

انہیں اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ اس وقت پاکستان میں اسلامی قانون کی تدوین کا جو کام ہو رہا ہے وہ پہلے سے کسی نافذ العمل فقہ کو بے دخل کرنے کی خاطر نہیں کیا جارہا ہے بلکہ پہلے سے نافذ العمل فاسقانہ قانون کو بے دخل کرنے کی خاطر کیا جارہا ہے جس کی بنیاد لادینیت اور کفر ہے۔ زیر تدوین قانون کے ذریعے سودی معیشت کو ختم کرنا مقصود ہے۔ زنا، تہمتِ زنا، شراب نوشی، چوری اور قتل کا انسداد مطلوب ہے۔ ظالمانہ نظام سرمایہ داری کی بیخ کنی مقصود ہے۔ جوئے اور سٹے کا خاتمہ کرنا، رشوت خوری، چور بازاری، ملاوٹ، اسمگلنگ اور ذخیرہ اندوزی کی روک تھام

Marfat.com

مطلوب ہے اور بطور مجموعی معاشرتی ظلم کو مٹا کر معاشرتی عدل کا قیام مقصود ہے ۔ یہ کام تو تمام ہی فرقوں میں یکساں طور پر مطلوب اور محبوب ہے ۔ اس لئے اگر ہمیں نظام فسق کے مقابلے میں اسلام کا قانون حاصل ہو جائے، خواہ وہ بفرضِ محال کسی دوسری فقہ کے بموجب ہو تو کیا یہ گھاٹے کا کام ہے؟ اس نکتے پر ہمارے علماء کرام کو سوچنا چاہیئے اور وسعت نظری کے ساتھ سوچنا چاہیئے ورنہ اسلامی قانون کے نفاذ کا کام اگر ان کی مزاحمتوں اور مخالفتوں کی وجہ سے ناکام ہو گیا تو وہ آنے والی نسلوں کی نگاہ میں بھی خوار ہوں گے اور آخرت میں بھی عذاب الٰہی کے مستوجب ہوں گے ۔

اسلامی قانون کی تدوین و نفاذ کی مخالفت فرقہ پرست علماء کی محض کوتاہ نظری کے سبب سے ہے یا ان کی کوتاہ نظری کو اس کام کی مخالفت میں کسی اسلام دشمن طاقت کی طرف سے استعمال کیا جا رہا ہے؟ یہ بھی ایک قابل تفتیش مسئلہ ہے ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ایران میں بھی جب سے اسلامی قانون کی تدوین اور نفاذ کا کام شروع ہوا ہے، کرد باشندوں کی طرف سے اسی نوع کی مخالفت شروع ہو گئی ہے حالانکہ وہاں بھی اسلامی قانون کے نفاذ کا پس منظر وہی ہے جو پاکستان میں ہے ۔ یعنی یہ کام پہلے سے نافذ العمل کسی فقہی مکتب فکر کو بے دخل کرنے کی خاطر نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ نظام کفر و فسق کو بے دخل کرنے کی خاطر کیا جا رہا ہے ۔ کردوں کے بارے میں یہ بات اب راز نہیں رہی کہ انہیں اسلام دشمن طاقتیں آلۂ کار کے طور پر استعمال کر رہی ہیں ۔

عام مسلمانوں کو بھی اس صورت حال پر کھلے دل کے ساتھ غور کرنا چاہیئے اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ علماء کرام میں سے جو لوگ فقہی تنازعات پیدا کر رہے ہیں وہ اسلام کی کون سی خدمت ہے ۔ ان کی تنازعہ پسندی سے فائدہ ایک بھی نہ ہو گا اس کے برعکس بہت بڑا اور ناقابلِ تلافی نقصان یہ رونما ہو گا کہ مسلمان قوم فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی ۔ اس سرزمین پاکستان کی ملت اسلامی جسے ہم مسلمان قوم کہتے ہیں اور جس نے اپنی متحدہ قوت سے انگریزوں اور ہندوؤں کو سرنگوں کر کے یہ ارضِ وطن حاصل کی ہے، پارہ پارہ ہو جائے گی ۔

یہ حقیقت بھی ہم سب کے علم میں ہونی چاہیئے کہ مسلک کا اختلاف مسلمانوں میں آج رونما نہیں ہوا ۔ یہ صدیوں سے موجود چلا آ رہا ہے ۔ مگر اس اختلاف کی بنا پر مسلمانوں نے پہلے کبھی فرقہ پرستانہ تنظیمیں قائم نہ کیں اور اپنے فرقوں کو کبھی منظم کرنے کی کوشش نہ کی کیونکہ اس سے مختلف فرقوں کے مابین محاذ آرائی

پیدا ہوتی۔ شیعہ حضرات نے اپنا جداگانہ تشخص ضرور قائم رکھا مگر وہ صرف جداگانہ ارکان عبادات کی ادائیگی یا محدود مذہبی مقاصد کی خاطر تھا۔ سنّیوں میں سے تو کبھی کسی کو اس کام کا خیال تک نہ آیا۔ مسلک کے اختلاف کے باوجود سب کے سب برصغیر کے جملہ قومی امور میں ہمیشہ شانہ بہ شانہ رہے۔ پہلی بار انگریزوں کے زمانے میں بعض سنّی علماء نے اپنے فقہی مسلک کے پیروکاروں کا جداگانہ تشخص قائم کرنے کی کوشش کی مگر ان کے اس کام کی ستائش صرف انگریزوں نے کی۔ انہوں نے اس نوع کی "خدمت" سرانجام دینے والے علماء کرام کو انعامات وخطابات سے سرفراز کیا[۱]۔ مگر اس فرقہ وارانہ تنظیم پروری کا دائرہ صرف فقہی اختلافات تک محدود رہا۔ سیاسی اور قومی معاملات میں تمام مسلمان بلاتفریق مسلک ایک مربوط ومتحد قوم بنے رہے اور ان کی یہ ملّی وحدت ہی تخلیق پاکستان کا ذریعہ بنی۔ مگر بدقسمتی سے ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے زمانے میں فرقہ پرست تنظیموں نے جدا جدا سیاسی تنظیموں کی شکل اختیار کرلی۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ان میں سے ہر فرقہ اس ملک میں اسلام کے غلبے کے بجائے اپنے فرقے کے غلبے کے لئے کوشاں ہے۔ ان کی اس نوع کی کوششوں کی وجہ سے اس ملک کی ملت واحدہ پارہ پارہ ہوتی جارہی ہے اور اب خانۂ خدا میں ایک ساتھ نماز پڑھنا بھی مشکل ہوا جا رہا ہے۔

فقہی اختلافات کی حدود

مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کے مابین فقہی اختلافات کی حدود کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو وہ ذہنی فاصلے ختم ہوجائیں گے جو کوتاہ نظر علماء کرام نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے مابین پیدا کر دیئے ہیں اور جنہیں آئے دن وہ بڑھاتے چلے جارہے ہیں۔

اس مسئلے میں سمجھنے کی سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اسلام کے فقہی قوانین میں کون کون سے موضوعات اور امور شامل ہیں۔ فقہ کی مستند کتابوں کے بموجب وہ امور یہ ہیں۔

---

[۱] تفصیلی مطالعے کے لئے ملاحظہ ہو پروفیسر خورشید احمد کی تصنیف "پاکستان میں آئین کی تدوین اور جمہوریت" کا مقدمہ رقم کردہ پروفیسر محمد ایوب قادری

Marfat.com

۱۔ عبادات یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی

۲۔ ذاتی اور عائلی مسائل (PERSONAL LAW)

۳۔ حدود و تعزیرات یعنی ارتکاب جرائم پر سزائیں۔

۴۔ معاملات اور لین دین۔

۵۔ امور معاشرت و سلطنت۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان امور سے مراد کیا ہے اور یہ کہ ان امور کی بجاآوری کے معاملے میں مختلف فقہی گروہوں کی آزادی عمل کا دائرہ کیا ہے؟

۱۔ عبادات کی بجاآوری میں جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا نماز ہاتھ کھول کر یا باندھ کر پڑھنے میں یا رفع یدین کرنے یا نہ کرنے میں یا آمین بالجہر کہنے یا نہ کہنے میں یا انتہائے سحر اور افطار کے اوقات کے تعین میں یا حج کے بعض مناسک میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں چند جزوی اختلافات ہیں مگر بنو امیہ کے دور سے لے کر آج تک مسلمانوں کی کسی حکومت میں کبھی بھی جدا جدا مسلکوں کی پیروی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی گئی۔

۲۔ ذاتی اور عائلی مسائل سے مراد نکاح، طلاق، خلع، نفقہ، ولایت، وصیت، عدت، پرورش، رضاعت اور وراثت وغیرہ کے احکام ہیں۔ اس نوع کے امور میں بھی مختلف فرقوں کے طریقے جدا جدا ہیں۔ مگر ان امور میں بھی کبھی آج تک کسی مسلمان حکومت نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو اپنی اپنی فقہ کے مطابق ان کے ذاتی اور عائلی امور میں تصفیے کرنے سے نہیں روکا یہاں تک کہ انگریزوں نے بھی ان قوانین میں دخل اندازی نہ کی بلکہ عدالتوں کو اس امر کی ہدایت کی کہ وہ ہر مذہب کے افراد کے مقدمات ان کے مذہب کے مطابق فیصلہ کریں۔

۳۔ حدود سے مراد چوری، زنا، تہمت زنا، شراب نوشی اور قتل کے لئے قرآن کریم کی متعین کردہ سزائیں ہیں اور تعزیرات سے مراد وہ سزائیں ہیں جو مذکورہ بالا جرائم کے بجائے دیگر جرائم کے ارتکاب پر دی جاتی ہیں۔ ایسے جرائم کے لئے فقہا نے خود اجتہاد کر کے سزائیں تجویز کی ہیں۔

حدود کے معاملے میں مختلف فرقوں میں اختلاف برائے نام ہے۔ البتہ تعزیرات کے معاملے میں اختلاف ہے اور یہ بات سو فیصد ممکن العمل ہے کہ مختلف فرقوں کے مجرمین کے لئے ان کی فقہ کے

Marfat.com

مطابق جدا جدا سزائیں متعین کی جائیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہم برصغیر کے مسلمان جو سینکڑوں سال سے غیر اسلامی تعزیرات کو قبول کرتے چلے آرہے ہیں انہیں اگر مزید چند سال توقف کرنا پڑ جائے تو ان کے ایمان میں کون سا خلل پڑ جائے گا ؟ یہ توقف محض اس ضرورت کے تحت مطلوب ہے کہ ہم قانون کی اس تدوین کا انتظار کریں جو اس وقت زیر عمل ہے۔

۴۔ معاملات اور لین دین سے مراد دو یا دو سے زیادہ افراد کے مابین خرید و فروخت، تجارتی معاہدات اور کاروباری شراکت وغیرہ ہیں۔ ان معاملات میں بھی بلاشبہ مختلف فرقوں کے احکام میں کچھ اختلاف ہے۔ مگر اسلامی نظام کے تحت اس کا حل بھی ممکن ہے۔ وہ یہ کہ معاملات میں یا لین دین میں اگر ایک ہی فرقے کے افراد کے مابین تنازعہ رونما ہو تو تصفیہ ان کی فقہ کے بموجب ہو اور اگر دو مختلف فرقوں کے افراد کے مابین ہو تو جیسا کہ اس وقت ہوتا ہے تصفیہ ریاستی قانون کے بموجب ہو اور وہ ظاہر ہے کہ سنی فقہ ہوگی کیونکہ ملک میں اکثریت سنیوں کی ہے۔

یہ بات کہ عبادات کی بجا آوری میں یا ذاتی و عائلی مسائل میں یا لین دین کے معاملات میں یا اس نوع کے دیگر مسائل میں کون سا طریقہ اختیار کیا جائے جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے لئے لائق اطمینان ہو، آج پہلی بار منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ مسلمانوں کے مختلف مکاتب کے ۳۱ اکابر علماء ۱۹۵۱ء میں اس مسئلے کو زیر غور لا چکے ہیں۔ انہوں نے کئی دنوں تک ان مسائل پر بڑی ہم آہنگی کے ساتھ غور و فکر کیا اور اسلامی مملکت کے لئے جو ۲۲ نکاتی رہنما اصول مرتب فرمائے اس میں کامل اتفاق رائے اور شرح صدر کے ساتھ فقہی اختلافات کا مندرجہ ذیل حل تجویز کیا۔

" شق نمبر۹۔ مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے۔ اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ ان ہی کے قاضی یہ فیصلے کریں۔" [1]

---

[1] ۲۲ نکات کا مکمل متن زیر نظر کتاب کے باب اوّل میں، صفحہ ۳۸ پر زیریں حاشیے میں نقل کر دیا گیا ہے۔

Marfat.com

اس حل پر شیعہ اور سُنّی دونوں فرقوں کے علماء پوری طرح راضی اور مطمئن تھے۔ اسے مدوّن کرنے والے ۳۱ علماء میں سے متعدد حضرات آج بھی شیعہ اور سنّی دونوں فرقوں میں بقید حیات ہیں۔ پھر اس حل کی موجودگی کے باوجود اس مسئلے پر باہمی تنازعے کی کیا معقول وجہ باقی رہ جاتی ہے؟

۵۔ معاشرت اور سلطنت کے بعض امور میں بھی مختلف فرقوں کے مابین بلاشبہ اختلافات موجود ہیں مگر ان امور کا دائرہ چونکہ پوری مملکت اور پوری قوم تک وسیع ہوتا ہے اس لئے اس معاملے میں صرف ایک ہی قانون نافذ کیا جا سکتا ہے۔ ایک ملک میں ایک سے زیادہ ملکی قانون نافذ کرنا ممکن العمل نہیں۔ یہ بات بالکل ویسی ہی ہے جیسے کسی ملک میں کچھ لوگ پارلیمانی طرزِ حکومت کے طرفدار ہوں اور کچھ لوگ صدارتی طرزِ حکومت کے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ دونوں قسم کے طریقے ایک ملک میں نافذ نہیں کئے جا سکتے اس لئے کسی ایک طرزِ حکومت کے انتخاب میں عوام کی اکثریت کی مرضی کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

قدیم فقہی مجموعوں کی تحدیدات (LIMITATIONS)

اس سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ پاکستان میں چونکہ فقہ حنفی کے ماننے والوں کی اکثریت ہے لہٰذا یہاں فقہ حنفی کو نافذ کیا جائے گا۔ اگر واقعی ایسا ہو جب بھی کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ملکی قوانین کے نفاذ میں اکثریت کو اقلیت پر تفوق پانا اس کا حق ہے مگر حقیقتاً صورت حال یہ ہے کہ جب ہم اسلامی قانون کو نافذ کرنا چاہیں گے تو وہ مجموعی طور پر نہ کسی اقلیتی فرقے کے خلاف جائے گا اور نہ ہی پہلے سے قائم شدہ کسی فرقے کے عین بموجب ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ سلطنت اور معاشرت کے معاملے میں فقہی قوانین زمان اور مکان کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ نے سلطنت اور معاشرت کے لئے جو قوانین وضع کئے تھے وہ عباسی خلفاء کے دور کے لئے تھے۔ بارہ تیرہ سو سال کے گزرانِ وقت اور جگہ کی تبدیلی کی وجہ سے سلطنت اور معاشرت کے بہت سے تقاضے تبدیل ہو چکے ہیں۔ اس لئے تبدیل شدہ امور کے لئے از سرِ نو اسلامی قانون وضع کرنا ہوگا۔ از سرِ نو مدوّن کردہ قانون کو کسی فقہی مکتبِ فکر مثلاً حنفیت یا شافعیت وغیرہ سے منسوب کرنا نہایت بے جا بات ہوگی۔ وہ قانون صرف اور صرف اسلامی قانون ہوگا۔

زمان اور مکان کے ساتھ فقہی قوانین میں تبدیلی اسلام کا ایک بنیادی اقتضا ہے اور اسلام کی

Marfat.com

اسی خصوصیت کی بنا پر اسے ایک لچکدار نظام (FLEXIBLE SYSTEM) کہا جاتا ہے۔ اس کی اسی خوبی کی وجہ سے اسے پارلیمانی نظام حکومت میں بھی چلایا جا سکتا ہے، صدارتی حکومت میں بھی اور شخصی فرمان روائی میں بھی، اور آنے والے برسوں میں حکومت کا کوئی اور قسم کا ڈھانچہ اگر رائج ہوا تو اس میں بھی اسلام کے اصول سیاست کو موزوں کیا جا سکے گا۔ یہ اسلام کی اتنی طے شدہ اور تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اسی کی بنا پر نہایت وثوق کے ساتھ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ اگر آج کے دور میں پیدا ہوتے اور ان کا مسکن پاکستان ہوتا تو وہ اپنی فقہ کے سیاسی قانون کو پارلیمانی نظام حکومت کے ڈھانچے کے بموجب مدوّن کرتے جس میں حکمرانی کے اختیار کو فردِ واحد (خلیفہ) کی ذات میں مرتکز کرنے کے بجائے صدر مملکت، وزیر اعظم اور مقننہ کی تین اتھارٹیز میں تقسیم کرتے اور اپنی وضع کردہ فقہ کو نافذ کرانے کے لئے صدر مملکت سے رجوع کرنے کے بجائے وہ اسے اسمبلی میں پیش فرماتے۔

معاشرت وسلطنت کے امور زمان و مکان کی تبدیلی کے ساتھ کیوں لائق تبدیلی ہو جاتے ہیں؟ یہ بلاشبہ ایک قابلِ تفہیم مسئلہ ہے۔ اسلامی قانون کے نفاذ کا مسئلہ چونکہ حنفی فقہ کے تناظر میں وجہ نزاع بنا ہے لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے حوالے سے اس مسئلہ کو سمجھا جائے۔

زمان و مکان کی تبدیلی کی وجہ سے سلطنت ومعاشرت کے امور میں تبدیلی کا عمل اسلامی تاریخ میں دورِ رسالت کے بعد سے شروع ہوا ہے اور یہ عمل قیامت کے دن تک جاری رہے گا۔ آنحضرتؐ کی وفات کے چند دن بعد ہی چند ایسے مسائل پیدا ہوئے جن کے بارے میں خدا کی کتاب یا رسول کے فرمودات میں کوئی ہدایت موجود نہ تھی۔ مثلاً جمع قرآن کا مسئلہ یا منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کرنے کا مسئلہ۔ حضرت ابوبکرؓ نے قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلے کا حل تلاش کیا۔ یہ گویا ان کا بنایا ہوا فقہی قانون تھا۔ اسی طرح سے حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی کے زمانے میں نئے نئے مسائل نمودار ہوتے چلے گئے اور یہ بزرگانِ اسلام ان کے لئے فقہی قوانین وضع کرتے چلے گئے یہاں تک کہ عباسی خلافت کے دور میں پہنچتے پہنچتے مزید کچھ مسائل نمودار ہوئے اور ان مسائل کے لئے قرآن وحدیث کی روشنی میں حضرت امام ابوحنیفہ نے علماء کی ایک مجلس بنا کر غور وفکر اور استنباط وقیاس کی رو سے فقہی قوانین وضع کئے۔ امام نے ایک کام اور یہ کیا کہ دورِ خلافت راشدہ سے لے کر اس وقت تک جتنے کچھ فقہی قوانین وضع ہو چکے تھے ان سب کو یکجا کر دیا۔ فقہی قوانین وضع کرنے کا کام ان ہی کے زمانے میں امام مالک

Marfat.com

نے بھی کیا۔ ان کے علاوہ یہ کام امام شافعی اور امام احمد بن حنبل نے بھی کیا۔ فقہی قوانین کے ان سب مجموعوں میں زیادہ اہمیت اور شہرت امام ابو حنیفہ کے فقہی قانون کو حاصل ہوئی۔ یہ اہمیت اس بنا پر نہ تھی کہ اسے باقی آئمہ کے فقہی قوانین پر کوئی شرعی افضیلت حاصل ہے۔ شرعی نقطۂ نظر سے تمام آئمہ کرام کے فقہی قوانین یکساں طور پر قابلِ احترام ہیں۔ حنفی قانون کو اہمیت اور شہرت حاصل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ یہ مجموعہ دیگر فقہی قوانین کے مقابلے میں زیادہ جامع اور مبسوط ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسے خلیفہ ہارون الرشید کے ذریعے عباسی دورِ حکومت میں نفاذ میں آنے کا موقع ملا جس کی وجہ سے اس کی شہرت پھیلتی چلی گئی اور اس کے بعد بہت سے دوسرے ملکوں میں حنفی فقہ کو نافذ کیا گیا۔

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت فقہ حنفی کی پیروکار ہے اس لئے قدرتی طور پر یہی فقہ دین سے ہماری وابستگی کا وسیلہ ہے۔ مگر فقہ حنفی سے ہماری وابستگی عبادات، پرسنل لاء اور لین دین کے امور تک محدود ہے اور کوئی غیر معمولی وجہ اگر ممد دار نہ ہو جائے تو یہ وابستگی آئندہ بھی قائم رہے گی۔ وجہ یہ ہے کہ عبادات، پرسنل لا اور لین دین کے مسائل کم و بیش غیر متبدل ہوا کرتے ہیں۔ معاشرتی ماحول کی تبدیلی ان امور پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوا کرتی۔ مثلاً معاشرتی حالات خواہ کتنا ہی تبدیل ہو جائیں، انسان زرعی معاشرے سے صنعتی معاشرے میں داخل ہو جائے، عبادات کے طریقوں یعنی نماز کی ادائیگی یا حج کے مناسک میں یا قربانی کے احکام میں کسی تبدیلی کی حاجت پیش نہیں آئے گی لہٰذا مختلف آئمہ کرام نے ان امور میں جو قوانین وضع کر دیئے ہیں وہ بدستور واجب الاتباع رہیں گے۔ اسی طرح سے نکاح، طلاق، خلع، نفقہ، عدت، رضاعت، وصیت اور میراث وغیرہ کے مسائل معاشرتی تبدیلی سے زیادہ متاثر نہیں ہوا کرتے۔ لہٰذا ان معاملات میں بھی، جو حنفی فقہ کا پیروکار ہے وہ اسی کی پیروی کرتا رہے گا۔ حنفی قوانین اس کے لئے فرسودہ نہیں ہو جائیں گے مگر معاشرتی زندگی کا ڈھانچہ یا نظامِ حکومت آئے دن تبدیل ہوتا رہتا ہے لہٰذا ان امور میں کوئی فقہی قانون ہمیشگی یا دوام کی حیثیت حاصل نہیں کر سکتا۔

جو لوگ صرف حنفی فقہ کو اسلام سمجھتے ہیں ان کے علم میں یہ علمی اور تاریخی حقیقت ہونی چاہیے کہ امام ابو حنیفہ کے وضع کردہ قوانین کوئی فرمانِ الٰہی نہ تھے۔ امام صاحب نے اپنے قوانین میں سے بعضوں پر خود اپنے ہاتھ سے نظرِ ثانی کی مثلاً انفرادی ملکیت کے بارے میں امام صاحب کی رائے تھی کہ انسان جتنی مقدار میں چاہے رکھے، اور جس طرح چاہے اسے تصرف میں لائے۔ مگر بعد میں انہوں نے اپنا یہ

فیصلہ تبدیل کر دیا اور یہ رائے دی کہ اگر کسی شخص کی ذاتی ملکیت سے جماعت اور قوم کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس پر پابندی عاید کی جا سکتی ہے (فقہ الاسلام مصنف حسین احمد الخطیب باب چہارم بعنوان اسلامی شریعت کے قواعد فقہ) ان کے بعض قوانین کو ان کے بعد آنے والے فقہا نے منسوخ کیا۔ مثلاً امام صاحب کے اس قانون کو کہ اگر کسی شخص کو مستحق سمجھ کے زکوٰۃ دی جائے تو بعد میں خواہ یہ انکشاف ہو جائے کہ زکوٰۃ پانے والا مستحق نہ تھا، زکوٰۃ کی فرضیت ادا ہو جائے گی، خود ان کے شاگرد خاص امام ابو یوسف نے منسوخ کر دیا اور انہوں نے فتویٰ دیا کہ زکوٰۃ دینے والے پر چونکہ غیر مستحق کو زکوٰۃ دینے کی غلطی ظاہر ہو چکی ہے اس لئے زکوٰۃ دینے والے کی طرف سے زکوٰۃ کی ادائیگی عمل میں نہیں آئی۔ (کتاب مذکور۔ باب چہارم۔ فقہ کا اٹھائیسواں قاعدہ) اسی طرح سے خروج (فاسق وظالم مسلمان حکمران کے خلاف بغاوت) کے بارے میں امام صاحب کی رائے تھی کہ فاسق اور ظالم مسلمان حکمران کے خلاف خروج نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ امام صاحب نے خود بھی اپنے فتوے پر عمل کیا اور اموی حکمران ہشام بن عبدالملک کے خلاف خروج میں حضرت زید بن علی کا اور عباسی خلیفہ المنصور کے خلاف خروج میں نفس زکیہ کا ساتھ دیا۔ مگر ان کے بعد آنے والے علماء و مجتہدین نے جب خروج کے نقصانات کا جائزہ لیا تو اسے نامناسب فعل قرار دیا۔

مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ سلطنت و معاشرت کے ڈھانچے کی تبدیلی کی وجہ سے آئمہ کے تمام فقہی قوانین اور اصول از کار رفتہ ہو چکے ہیں۔ اس شعبے میں بہت سے ایسے امور ہیں جن کے بارے میں ائمہ کے وضع کردہ قوانین اور متعین کردہ اصول آج بھی بے حد وقیع ہیں اور اسلامی قانون کی تدوین میں آج بھی ہمارے لئے وہ رہبری اور رہنمائی کا کام دیں گے۔ مثلاً ان کی یہ رائے کہ قیام عدل کے لئے عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی ضروری ہے، آج بھی نظریۂ عدل کا بنیادی اصول مانا جاتا ہے۔ اسی طرح سے امام بزور قوت اقتدار کے حصول کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور وہ اقتدار کے حصول کے جواز کو (کم سے کم) اہل الرائے کے اجماع اور مشورے سے مشروط کرتے ہیں۔ فاسق و ظالم خلیفہ کی حکومت کو بالفعل (DE FACTO) حکومت تو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے نافذ کردہ شرعی قوانین کو واجب الاتباع قرار دیتے ہیں مگر ایسی حکومت کو بالحق (DE JURO) حکومت نہیں مانتے اور اسے تبدیل کرانے کی جدوجہد کرنے پر زور دیتے ہیں۔ آزادی اظہار رائے، بشرطیکہ وہ معروف کام کے لئے

Marfat.com

استعمال کی جائے انسان کا بنیادی حق قرار دیتے ہیں [۱]

مذکورہ بالا گزارشات سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ جو چیز ناقابل تغیر اور اٹل ہے وہ قرآن وسنت ہے۔ اس کے برعکس فقہی قوانین زمانے اور مقام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور اسلام اس تبدیلی کے لئے اپنے اندر وسیع گنجائش رکھتا ہے۔ اسلام کی اسی خوبی کی وجہ سے ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ دین ہر زمانے کے لئے بنی نوع انسانی کے لئے ذریعہ نجات ہے۔ اگر اس میں لچکداری کی صفت نہ ہوتی تو وہ کب کی داستانِ پارینہ بن چکا ہوتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر عباسی خلفاء کے بعد کے زمانوں میں جب کبھی کسی حکمرانِ صالح کو اسلامی قانون نافذ کرنے سے دلچسپی ہوئی اس نے از سر نو اسے مدون کرایا۔ سلطنتِ عثمانیہ نے مجلۃ الاحکام کے نام سے قانون اسلامی مدون کرائے اور شہنشاہ اورنگ زیب نے فتاویٰ عالمگیری کے نام سے۔ اس وقت کہنے کو جدید ترین فقہی مجموعے یہی دونوں ہیں مگر ان اسباب کی بنا پر جن کا ابھی تذکرہ کیا گیا ہے یہ دونوں مجموعے بھی آج کی ضرورت کے لئے بیشتر حد تک از کار رفتہ ہو چکے ہیں۔ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کو تقریباً تین صدیاں گزر چکی ہیں۔ سلطنت کا وہ ڈھانچہ یکسر تبدیل ہو چکا ہے جو سلطنت عالمگیری کی بنیاد تھا۔ اس فقہی مجموعے کی یہ "بدقسمتی" اس کے علاوہ ہے کہ مدون ہو جانے کے باوجود اسے نفاذ میں آنے کا موقع نہ مل سکا۔ مجلۃ الاحکام کی خامی یہ ہے کہ یہ جملہ امور کا احاطہ نہیں کرتا۔ ان فقہی مجموعوں کی از کار رفتگی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی تدوین کے بعد کے زمانوں میں بیشمار نئے مسائل پیدا ہوئے مثلاً فلم سازی کی حلت وحرمت کا مسئلہ یا انتقالِ خون کا مسئلہ یا اعضا کی پیوندکاری کا مسئلہ یا مردے کی چیر پھاڑ کا مسئلہ یا لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کا مسئلہ، ظاہر ہے کہ فتاویٰ عالمگیری یا مجلۃ الاحکام میں ان کے لئے کوئی حکم موجود نہیں لہٰذا ان مسائل میں علماء کرام نے مذکورہ فقہی مجموعوں سے رجوع کرنے کے بجائے خود اجتہاد کر کے ان کا حل دیا نت کیا۔ معاشرت وسلطنت میں ان کے علاوہ بھی بے شمار نئے مسائل کا اضافہ ہوا ہے۔ انہیں حل کرنے کے لئے کسی قدیم فقہ کی طرف رجوع کرنے کے بجائے اسی طرح سے خود اجتہاد کرنا ہوگا۔ اور یہ اجتہاد جدید عصری تقاضوں کے بموجب ہوگا۔ ان اجتہادات کو کسی قدیم فقہ سے منسوب کرنا بے معنی بات ہوگی۔ یہی رائے دقیق النظر عالم

---

[۱] ملاحظہ ہو خلافت وملوکیت باب ہشتم مصنفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

اور محقق مولانا امین احسن اصلاحی کی بھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"ایک صحیح اسلامی ریاست کسی متعین امام کی تقلید اور کسی متعین فقہ کی پیروی کے اصول پر قائم نہیں ہو سکتی بلکہ یہ لازم ہے کہ اس کی بنیاد براہ راست کتاب و سنت اور اجتہاد و شوریٰ پر ہو۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ پوری فقہ اسلامی بلا کسی استثناء و امتیاز کے اس کا سرمایہ ہو اور وہ تمام اجتہادی امور بلا کسی تخصیص و ترجیح کے بغیر مختلف آئمہ کے اجتہادات پر نگاہ ڈال کر اپنے قانون کیلئے ان اقوال اور رایوں کا انتخاب کرے جو اس کی نظر میں کتاب و سنت اور روح اسلام سے قریب تر نظر آئیں۔ جن امور سے متعلق اس کو پچھلے آئمہ کے اجتہادات میں کوئی بات نہ ملے، کتاب و سنت کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر وہ خود ان کا حل معلوم کرنے کی کوشش کرے ...... ہمارے مختلف فقہی گروہوں میں سے ہر گروہ کا مسلک و مذہب حکومت کی نگاہوں میں یکساں عزت و احترام کا مستحق ہوگا۔[1]

مولانا کا یہ ارشاد گرامی اس مسئلے میں قاطع برہان کی حیثیت رکھتا ہے جس کے بعد مزید کسی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

---

[1] اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل۔ باب (۸)

Marfat.com

(ب) صوبہ پرستی

صوبہ پرستی پاکستان کے لئے بدقسمتی سے نامانوس لفظ نہیں ہے۔ اس کی ابتدا مشرقی پاکستان میں ہوئی اور جیسا کہ گزشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ بتایا جا چکا ہے، وہاں اسے مغربی پاکستان کے خلاف تنفر کی بنیاد پر استوار کیا گیا اور بنگلہ قومیت کی غذا کھلا کھلا کر اس کی وہاں نشوونما کی گئی۔ اس تحریک کو لے کر کھڑے ہونے والے، وہاں کے ایسے افراد تھے جو قائد اعظم اور قائد ملت کی طرف سے معتوب کئے جا چکے تھے یا ایسے افراد تھے جو اپنی کوتاہیٔ قد کی بنا پر قومی سیاست میں کوئی مقام و مرتبہ حاصل کرنے کے لائق نہ تھے۔ اس نوع کے عناصر اپنے صوبے کے عوام میں محرومی و بے چارگی کا احساس پیدا کر کے ان کی سیاسی طرفداری حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ ہندو بھی اپنے تمام امکانی وسائل کے ساتھ ان کی امداد و اعانت کے لئے ان کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ اس لئے صوبہ پرست عناصر عوام میں احساس محرومی پیدا کر کے اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پاکستان کے خلاف صوبہ پرستی کی اس جنگ میں فتح انہیں ضرور حاصل ہوئی مگر ان کی فتحمندی کے مقابلے میں شکست صرف پاکستان کو نہیں بلکہ خود ان کے صوبے کو بھی نصیب ہوئی کہ وہ آج ایک تاریک مستقبل کے آگے دم بخود ہے۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی ایک المناک واقعہ سہی، مگر اس کی علیحدگی کے بعد اچھائی کا ایک پہلو بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ اب ملک کو صوبہ پرستی کی اس لعنت سے نجات مل جائے گی جو مشرقی پاکستان کے کوتاہ اندیش لیڈروں کی وجہ سے ملک پر مسلط ہو گئی تھی۔ باقیماندہ پاکستان چار ایسے صوبوں پر مشتمل تھا جو باہم دگر جغرافیائی طور پر متصل تھے اور ایک دوسرے سے ازل سے مربوط تھے اس لئے ان کے مابین ایک دوسرے کے خلاف کسی قسم کے تعصب کے ابھرنے کا اندیشہ بعید از قیاس نظر آتا تھا مگر یہ خوش گمانی غلط ثابت ہوئی کیونکہ ملک کے اس خطے میں بھی کوتاہ قد اور اقتدار پرست لیڈروں کی کچھ کمی نہ تھی۔ صوبہ پرستی کی تحریک کو وہ مشرقی پاکستان میں ثمر آور ہوتے دیکھ چکے تھے۔ لہٰذا یہاں کے اس نوع کے عناصر نے چند سال کے اندر اندر یہاں بھی صوبہ پرستی کی تحریک شروع کر دی۔

مشرقی پاکستان میں جس طرح صوبہ پرستی کو بنگلہ قومیت اور مغربی پاکستان کے صوبوں کے خلاف نفرت کے نظریئے پر استوار کیا گیا تھا اسی طرح سے یہاں بھی صوبہ پرستی کو علاقائی قومیت اور دوسرے صوبوں

Marfat.com

کے خلاف نفرت کی بنیاد پر استوار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ نفرت کا یہ ہدف خاص طور پر پنجاب ہے وہ صوبہ جس نے پاکستان کی خاطر اپنے صوبے کو کٹوایا اور مشرقی پنجاب کے لاکھوں تارکین وطن کو اپنے گھر میں جگہ دی۔

جو لوگ صوبہ پرستی کا پرچار کر رہے ہیں ان کا نظریہ یہ ہے کہ پاکستان کے چاروں صوبوں میں چار جدا جدا قومیں (جنہیں یہ از راہ عنایت قومیتیں کہتے ہیں) بستی ہیں۔ ہر قومیت اپنی جداگانہ تہذیب و ثقافت رکھتی ہے۔ پاکستان چار قوموں کا وفاق ہے۔ یہ چاروں صوبے اسی وقت تک وفاق سے وابستہ رہ سکتے ہیں جب تک ان کی خواہش کے مطابق انہیں خودمختاری حاصل رہے لہذا انہیں وفاق کے ساتھ وابستہ رکھنا ہے تو ان کی صوبائی قومیتوں کو تسلیم کیا جائے اور انہیں ان کی طلب کردہ صوبائی خودمختاری فراہم کر دی جائے۔

صوبہ پرستوں کے نظریہ کی جو تلخیص سطور بالا میں پیش کی گئی ہے اسے آپ غور سے پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ تین نکات پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ پاکستان ایک قوم کا وطن نہیں بلکہ چار قوموں کا وطن ہے دوسرا یہ کہ یہ ملک چار صوبوں کا وفاق ہے (معلوم نہیں کیوں یہ آزاد کشمیر کو پاکستان کا جزو نہیں سمجھتے) اور تیسرا یہ کہ اس وفاق کو اگر قائم رکھنا ہے تو دفاع، خارجہ پالیسی اور کرنسی کو چھوڑ کر تمام محکمے صوبوں کے حوالے کر دیئے جائیں۔

اب تینوں نکات کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیجیے۔

قومیت کے مسئلے پر اگر بہ نظر تعمق غور کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ دنیا کا کوئی بھی شخص کسی واحد قومیت کا حامل نہیں ہوتا بلکہ بیک وقت کئی قومیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ مثلاً ہم پاکستانی مسلمان، مذاہب عالم کی برادری میں مسلمان قوم ہیں۔ ممالک کی برادری میں پاکستانی قوم ہیں۔ پاکستان کی حدود کے اندر بلوچی، سندھی، پنجابی، پٹھان اور کشمیری وغیرہ ہیں۔ صوبوں کے اندر، مثال کے طور پر بلوچستان کی حدود میں بلوچی اور پٹھان ہیں۔ بلوچیوں کی برادری میں مینگل، مری، بگتی وغیرہ ہیں۔ ان میں سے ہر قومیت باعث افتخار ہے مگر ہر قومیت کا دائرہ اثر بھی جدا جدا ہے۔ مذاہب عالم کی برادری میں ہم عیسائیوں، یہودیوں اور ہندوؤں کے مقابلے میں اپنی مسلمان قومیت کے تشخص کو نمایاں رکھتے ہیں۔ عقائد، عبادات، معیار خیر و شر، قانون حلت و حرمت، نکاح و طلاق، تجہیز و تکفین، ترکہ وراثت کے معاملے میں ہم خود اپنے وطن کے عیسائیوں، یہودیوں

Marfat.com

اور ہندوؤں وغیرہ کے برعکس اپنے مذہبی طریقے پر عمل کرتے ہیں۔ ممالک کی برادری میں ہم پاکستانی قومیت کو نمایاں رکھتے ہیں۔ بیرونی ممالک میں مقیم پاکستانی بھی حتی المقدور پاکستانی لباس، زبان، طرزِ زندگی اور طور طریقوں کو اپنائے رکھتے ہیں۔ اس معاملے میں ہم عربوں، ترکوں اور ایرانیوں سے بھی جو حالانکہ ہمارے ہم مذہب ہیں، اپنا تشخص علیحدہ کئے رہتے ہیں۔ پاکستان کی حدود کے اندر ہر شخص اپنے صوبے کے طرزِ رہائش کو اپنائے رہتا ہے۔ اپنے صوبے کے اندر ہر شخص اپنی اپنی برادریوں یا قبیلوں کی زبان اور رسم رواج پر عمل پیرا رہتا ہے۔ اپنے قبیلے کے اندر اپنی برادری اور برادری کے اندر خاندان کی روایات اور طور طریقوں کی پابندی کرتا ہے۔ پاکستان کا سیاسی وجود ان میں سے کسی کام میں حارج نہیں ہوتا۔ جب وہ حارج نہیں ہوتا تو پھر پاکستان کی موجودہ سیاسی ہیئت اور اس کے نظام کے ساتھ جنگ کیوں ؟

اس ضمن میں ایک اور نہایت اہم بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ ہمارے ملک میں پاکستانی قومیت کے نیچے جو ذیلی قومیتیں ہیں وہ صوبائی قومیتیں نہیں ہیں کیونکہ صوبے انگریزوں نے قومیتوں کی بنیاد پر نہیں بنائے تھے بلکہ محض انتظامی ضرورتوں کی خاطر بنائے تھے۔ لہٰذا پنجابی، پٹھان، بلوچی اور سندھی ثقافتی یا تہذیبی قومیتیں نہیں ہیں بلکہ محض سیاسی قومیتیں ہیں۔ ان میں سے ہر صوبہ فی الحقیقت ایک سے زائد ثقافتی قومیتوں کا حامل ہے۔ مثلاً بلوچستان میں بلوچی اور پٹھان قومیتیں ہیں۔ سندھ میں میمن، کچھی، کاٹھیاواڑی، مکرانی، لاسی، گجراتی، سومرو، جونیجو، سنجرانی، ابڑو، جتوئی اور اس نوع کی بے شمار قومیتیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستانی قومیت کے نیچے اصل، مضبوط، راسخ اور مستقل بالذات قومیتیں قبیلوں اور لسانی وحدتوں کی ہی ہیں نہ کہ انگریزوں کی بنائی ہوئی صوبائی قومیتیں۔ اس لیے پاکستانی قومیت اگر کمزور ہوئی تو اس سے آخری فائدہ صوبائی قومیت کو نہیں پہنچے گا بلکہ قبائلی اور لسانی قومیتوں کو پہنچے گا اور ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ لہٰذا قومی وحدت کو ختم کر دینے سے قبائلی اور لسانی قومیتیں یکایک ابھر آئیں گی۔ پھر ان کے مابین جب محاذ آرائی شروع ہو گی تو اسے روکنا کسی کے بس میں نہ ہو گا۔

اب دوسرے نکتے کو لیجئے کہ پاکستان چار صوبوں کے وفاق کا نام ہے۔

ابھی اس حقیقت کو وقوع پذیر ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا صرف تین دہائیاں گزری ہیں اور ایسے لوگ کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں جو اس امر کے شاہد ہیں کہ پاکستان چار صوبوں کا وفاق نہیں بلکہ برصغیر ہند کے مسلمان علاقوں کا وفاق ہے۔ مسلمان علاقوں کا وفاق قائم کرنے کی ہی خاطر پنجاب کا صوبہ

مشرقی اور مغربی پنجابوں میں اور بنگال کا صوبہ مشرقی اور مغربی بنگالوں میں تقسیم کیا گیا اور ضلع سلہٹ کو آسام سے کاٹ کر علیحدہ کیا گیا۔ اگر یہ ملک صوبوں کا وفاق ہوتا تو یہ تینوں صوبے کسی قیمت پر تقسیم نہیں کئے جا سکتے تھے۔ پورا کا پورا صوبہ یا تو ہندوستان کے ساتھ ہوتا یا پاکستان کے ساتھ۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ ملک صوبوں کا وفاق ہوتا تو مشرقی پاکستان، اپنے سے ہزار میل دور مغربی پاکستان کے ساتھ کیوں جڑتا؟ اسے تو بھارت کا جزو لاینفک بنے رہنا چاہیئے تھا۔ مغربی پاکستان سے جڑنے کے لئے اس کے بجائے کوئی بات نہ تھی کہ وہ بھی مسلم اکثریتی علاقہ تھا اور یہ بھی۔ اسی قدر مشترک کی بنا پر یہ دونوں مل کر بھارت سے علیحدہ ہوئے۔

تیسری بات یہ ہے کہ کوئی وفاق، جدا جدا ریاستوں کے باہمی رضامندی سے باہم ایک مرکز سے وابستہ ہونے کی بنا پر قائم ہوتا ہے۔ جیسے امریکہ کا وفاق ہے جو (ابتدا میں تیرہ اور) اس وقت ۵۱ ریاستوں کا وفاق ہے۔ اس کے برعکس پاکستان میں ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ سندھ، پنجاب، بلوچستان، سرحد اور مشرقی بنگال علیحدہ علیحدہ ریاستیں رہے ہوں اور انہوں نے اپنی مرضی سے ایک مرکز سے وابستگی قائم کی ہو۔ پاکستان کا قیام ہندوستان کے وفاق کو دو وفاقوں میں تقسیم کر کے عمل میں لایا گیا ہے اور اسے مسلمانوں کی متحدہ قوت کے زور پر تقسیم کرایا گیا ہے ورنہ کس صوبے میں اتنی قوت تھی کہ وہ حکومت ہند کی قوت قاہرہ کو زیر کر کے علیحدہ ہو سکے؟

چوتھی بات یہ ہے کہ یہ ملک محض ایک وفاق نہیں بلکہ برصغیر کے تمام مسلمانوں کا ارض وطن (HOME LAND) ہے کیونکہ اسے بنانے میں کروڑوں ایسے مسلمانوں نے بھی حصہ لیا ہے جنہیں پہلے سے معلوم تھا کہ انہیں اس ملک میں رہنا نصیب نہ ہوگا۔ اسے بنانے میں اس وقت کے بھارت کے کم سے کم چار کروڑ مسلمانوں نے حصہ لیا جن میں سے صرف چند لاکھ پاکستان آ سکے اور باقیماندہ آج تک وہیں ہیں۔ اگر یہ ملک چار یا پانچ صوبوں کا وفاق ہوتا تو بھارت کے باقیماندہ صوبوں، بہار، یوپی، سی پی، حیدرآباد، بمبئی اور مدراس وغیرہ کے مسلمانوں کو کیا پڑی تھی کہ وہ اس کے لئے قربانیاں دیں یا حیدرآباد اور جوناگڑھ کی ریاستوں کو کیا افتاد پڑی تھی کہ وہ پاکستان سے الحاق کر کے اپنی ریاست پر بھارتی فوج کشی کا خطرہ گوارہ کریں؟

اس مسئلے میں سب سے آخری اور فیصلہ کن حقیقت یہ ہے کہ کوئی وفاق قائم خواہ کسی طرح بھی

Marfat.com

ہو، خواہ اس طرح جیسے یہ فی الواقعی قائم ہوا ہے یا اس طرح جیسے بعض حقیقت ناشناس لیڈر آج دعوے کرنے لگے ہیں، ایک بار وفاق میں شامل ہو جانے کے بعد، کسی حصّے کو کبھی بھی اس سے علیحدہ ہونے کی اجازت نہیں ہوتی۔ دنیا کے کسی ملک میں آج تک کسی ملک یا صوبے کو وفاق سے علیحدہ ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ دنیا میں روس واحد ملک تھا جس نے وفاق قائم کرتے وقت ریاستوں کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ اسے حسب منشا وفاق سے علیحدہ ہونے کی اجازت ہوگی مگر قائم ہو جانے کے بعد روس کی حکومت صریح اور غیر مبہم الفاظ میں اس یقین دہانی کو منسوخ کر چکی ہے۔

اس مسئلے میں نامور ماہر قانون جناب اے۔کے بروہی نے بجا طور پر فرمایا ہے (ملاحظہ ہو روزنامہ سن مورخہ ۲۹، اگست ۱۹۷۸ء اور روزنامہ جسارت مورخہ ۹، اکتوبر ۱۹۷۸ء) کہ "کوئی اکائی وفاق الحاق میں شامل ہو سکتی ہے لیکن اسے شرائط میں کسی کمی بیشی کرنے کا یا (وفاق کے لئے) معاہدے کی شرائط بدلنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے جب تک کہ وفاق کی تمام اکائیوں کی منظوری حاصل نہ کر لی جائے۔"

بروہی صاحب کا یہ قول میری دانست میں قاطع برہان اور حجت کی حیثیت رکھتا ہے جس کے بعد اس مسئلے میں مزید کسی استدلال کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

بہرکیف! صوبہ پرستوں کے ان دعووں کے سلسلے میں ایک اہم بات جس کی طرف ابھی تک عام لوگوں کی نظر نہیں گئی ہے یہ ہے کہ صوبہ پرستی کی تحریک اپنے مضمرات اور اپنی روح کے اعتبار سے فی الحقیقت نسل پرستی کی تحریک ہے۔ بلوچستان سے اس تحریک کو آگے لے کر بڑھنے والے جب بلوچ قومیت کی بات کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد صرف بلوچوں کی قومیت تسلیم کرانا ہوتی ہے۔ ان کے صوبے میں بسنے والے غیر بلوچوں کا قومی تشخص تسلیم کرانا ان کا مقصود نہیں ہوتا۔ اسی طرح سے صوبہ سرحد یا سندھ سے اسی نوع کا مطالبہ اٹھتا ہے تو اس کا مقصد پٹھانوں یا قدیم سندھیوں کی قومیت تسلیم کرانا اور ان کے لئے صوبائی خودمختاری کا حصول ہوتا ہے، غیر پٹھان یا نئے سندھی ان کے پیش نظر نہیں ہوتے۔ اس مطالبے کو لے کر آگے بڑھنے والے عناصر غیر شعوری طور پر ہی سہی دراصل نسل پرستی کی تحریک چلا رہے ہیں۔ مگر نسل پرستی کے مضمرات اور عواقب پر انہوں نے کبھی غور کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ان کی یہ تحریک اگر کامیاب ہو گئی تو آگے چل کر اس قدر بھیانک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا کہ اسے دیکھ کر وہ خود لرزہ براندام ہوں گے مگر اپنی لگائی ہوئی آگ پر کوشش بسیار کے باوجود قابو نہ پا سکیں گے۔ ابھی تو وہ صرف یہ کہتے اور شاید سمجھتے

Marfat.com

ہیں کہ یہ ملک چار قوموں کا وطن ہے مگر اسے چار قوموں کا وطن بنا چکنے کے بعد انہیں معلوم ہوگا کہ یہاں چار نہیں بلکہ کم سے کم چار سو قومیں بستی ہیں اور اس بنا پر اسے یکے بعد دیگرے اتنے ہی ٹکڑوں میں تقسیم ہوتے چلے جانا ہے۔ مثال کے طور پر بلوچستان ان کے دعوے کے بموجب صرف ایک قوم کا صوبہ ہے مگر مطلوبہ خود مختاری حاصل ہوتے ہی وہاں کی قومیت بلوچ اور پٹھان قومیتوں میں تقسیم ہو جائے گی اور پٹھانوں کی طرف سے مطالبہ کیا جائے گا کہ کوئٹہ ژوب اور لورالائی کے اضلاع بلوچستان سے کاٹ کر علیحدہ کر دیئے جائیں اور ان اضلاع کو ملا کر ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔ یہ محض خیال آرائی نہیں بلکہ یہ مسئلہ نسل پرستی کے شکم مادر میں موجود ہے۔ بلوچستان کے سب سے مقتدر پٹھان لیڈر عبدالصمد خان اچکزئی مرحوم کی طرف سے اس خواہش کا اظہار بھی کیا جا چکا ہے (ملاحظہ ہو نواب اکبر بگٹی خاں کا خصوصی انٹرویو مطبوعہ لیل و نہار مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۷۲ء) پھر بلوچستان کے بڑے بڑے قبائل مری، بگتی، مینگل، حسنی وغیرہ آپس میں متصادم ہوں گے اور اسے قلات، جھالاوان، مکران اور لسبیلہ نام کے صوبوں میں تقسیم کرانے کے لئے برسر پیکار ہوں گے۔ گویا ترقی تو ایک طرف رہی، ان قبائل کا سکھ چین بھی غارت ہو جائے گا کیونکہ ان کی تلواریں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لئے نیاموں سے باہر ہوں گی۔

اسی طرح سے صوبہ سندھ کو جب مطلوبہ صوبائی خود مختاری حاصل ہو جائے گی تو سب سے پہلے پرانے سندھیوں اور نئے سندھیوں کے مابین کشمکش کا آغاز ہوگا اور اولین اقدام کے طور پر سندھ دو صوبوں میں تقسیم ہو جائے گا کیونکہ سندھ میں سندھو دیش کی تحریک جوں جوں سر اٹھاتی جا رہی ہے کراچی صوبہ کی تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ پھر معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ سندھ میں بسنے والی دوسری قومیں یعنی کچھی، میمن، گجراتی، کاٹھیاواری وغیرہ اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے اور کچھ اور نہیں تو کم سے کم ملازمتوں میں اپنا کوٹہ مقرر کرائیں گے۔ وزارتوں میں حصہ طلب کریں گے۔ فوج میں، پولیس میں، تجارت میں، کاروبار میں غرضیکہ ہر جگہ اپنا جدا جدا حق مانگیں گے۔ ایسی صورت میں سندھ کے قدیم باشندوں کے لئے کیا بچے گا جس کی خاطر وہ سندھو دیش کی تحریک چلا رہے ہیں ہ گویا صوبائی خود مختاری میں اضافے کا مطالبہ اس ملک کو باہر سے ورنہ کم سے اندر سے سینکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم کر دے گا۔

Marfat.com

صوبائی خود مختاری میں اضافے کا مسئلہ

اب آئیے تیسرے مطالبے کو لیں کہ دفاع، خارجہ پالیسی اور کرنسی کو چھوڑ کر باقیماندہ تمام محکموں کو صوبوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس مطالبے کا جائزہ لینے کے لئے صوبائی خود مختاری کا ایک تاریخی تجزیہ ضروری ہے۔

صوبائی خود مختاری کی فہرست میں ۳، ۱۹۱ء کے اپریل تک صرف وہ محکمے تھے جو ۱۹۷۳ء کے آئین میں صوبوں کی فہرست میں شامل کئے گئے تھے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جتنا کچھ انہیں مذکورہ آئین میں دیا گیا وہ ان کے محضر نامے سے خواہ کچھ کم رہا ہو مگر ان کی توقعات سے بہت زیادہ تھا اسی وجہ سے انہوں نے ہنسی خوشی اس آئین پر دستخط کر کے اسے متفقہ آئین کی حیثیت دلوائی۔ جب اپنی طلب کردہ خود مختاری انہیں مل گئی تو آگے بڑھ کر انہوں نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ سارے ہی محکمے صوبوں کی تحویل میں دے دیئے جائیں صرف دفاع، خارجہ پالیسی اور کرنسی کے محکمے مرکز کے ہاتھ میں رہنے دیئے جائیں۔ ہوس طلب ملاحظہ فرمائیے کہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اب یہ مطالبہ کیا جانے لگا ہے کہ مرکز میں چاروں صوبوں کا حصہ برابر ہو۔ یعنی اٹھارہ لاکھ کی آبادی والا صوبہ اتنا حصہ حاصل کرے جتنا ساڑھے چار کروڑ کی آبادی والے پنجاب کو دیا جا رہا ہے۔ یہ بات بالکل ویسی ہی ہے جیسے شراکت کے کاروبار میں دس فیصد کا سرمایہ لگانے والا حصہ دار اتنا ہی منافع طلب کرے جتنا نوے فیصد کا سرمایہ لگانے والا۔ گویا یہ صوبائی خود مختاری کا مطالبہ نہیں بلکہ استسقا کا مرض ہے جو پانی کا ہر پیالہ حلق سے اتارنے کے بعد پیاس کی شدّت کو فزوں تر کر دیتا ہے۔

بہرکیف! ان حضرات کا کم سے کم مطالبہ یہ ہے کہ دفاع، امور خارجہ اور کرنسی کو چھوڑ کر بقیہ تمام محکمے صوبوں کے حوالے کر دیئے جائیں۔

صوبہ پرست لیڈران اس سے یہ فائدہ منسوب کرتے ہیں کہ صوبوں کو انتظامی معاملات میں جتنی زیادہ خود مختاری دی جائے گی ان میں اسی قدر زیادہ ترقی واقع ہوگی اور اس وقت ملک کے بعض صوبوں میں جو پس ماندگی پائی جاتی ہے اس کا سبب ان کی نگاہ میں صوبائی خود مختاری کی مقدار میں کمی ہے۔

صوبائی خود مختاری ایک آئینی اصطلاح ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حکومت چلانے کے اختیارات

Marfat.com

کا ایک حصہ مرکز کے پاس رہے اور دوسرا حصہ صوبائی حکومتوں کے پاس۔ اختیارات کی تقسیم من مانے طریقے پر نہیں کی جاتی بلکہ اس نظریئے کو ملحوظ رکھ کر کی جاتی ہے کہ ایسے امور جو ملک کی سیاسی وحدت کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں یا ایسے امور جو ملک کے ایک سے زیادہ صوبوں کے مابین مشترکہ اہمیت رکھتے ہیں، مرکزی حکومت کے ہاتھ میں رہیں اور ایسے امور جن کی اہمیت صوبائی اور مقامی ہے وہ صوبائی حکومتوں کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔ یہ اصطلاح صرف ایسی مملکتوں میں عملی قدر و قیمت رکھتی ہے جہاں وفاقی طرزِ حکومت ہو۔ جہاں وحدانی طرزِ حکومت ہوتی ہے وہاں اختیارات کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا بلکہ سب کے سب اختیارات مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور وہی ان اختیارات کو ملک کے ہر نوع کے مسائل میں استعمال کرتی ہے۔

جب انگریز ہندوستان کے حکمران بنے تو انہوں نے پہلے تو وحدانی طرزِ حکومت قائم کی مگر بعد میں اختیارات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ مرکزی حکومت کے ہاتھ میں رکھا گیا جسے وائسرائے استعمال کرتے تھے اور دوسرا صوبائی حکومت کی تحویل میں دے دیا گیا جسے صوبائی حکومت اپنی وزارتی کابینہ کے ذریعے استعمال کرتی تھی۔ اختیارات کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک یہ تھی کہ ہندوستان رقبے اور آبادی کے اعتبار سے، بالخصوص انگلستان کے مقابلے میں بہت بڑا ملک تھا۔ اس کے بہت سے صوبے اور علاقے مرکز سے دو ہزار میل کے فاصلے پر واقع تھے۔ ایسی صورت میں مرکزی حکومت کے لئے اتنے دور دراز علاقوں کے مقامی اور علاقائی مسائل پر یکساں طور پر توجہ دینا امرِ دشوار تھا اور آسان تر صورت یہی تھی کہ ایسے مسائل حل کرنے کا دستوری اختیار مقامی انتظامیہ کے سپرد کر دیا جائے۔ اختیارات کو تقسیم کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ برطانوی حکومت اختیارات کا ایک حصہ صوبائی حکومت کو جو مقامی لوگوں پر مشتمل ہوتی تھی تفویض کر کے اہلِ ہند کے احساسِ غلامی میں کمی کرنا چاہتی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں پہلے پہل اختیارات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا مگر صوبائی حکومتوں کو اختیارات کا بہت تھوڑا سا حصہ دیا گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ اختیار مرکزی حکومت نے اپنے ہاتھ میں محفوظ رکھا کہ وہ جب چاہے صوبائی حکومت کا اختیار سلب کر کے دوبارہ اپنے ہاتھ میں واپس لے لے۔ جب اہلِ ہند اتنے تھوڑے سے اختیارات پر راضی نہ ہوتے تو ۱۹۱۹ء میں صوبائی اختیارات میں مزید اضافہ کیا گیا۔ اہلِ ہند کی طرف سے اختیارات کی مقدار میں اضافے کا مطالبہ

اس بنا پر نہ تھا کہ وہ مرکزی حکومت کو کمزور کرنا چاہتے تھے بلکہ اس بنا پر تھا کہ وہ انگریزی راج کو کمزور کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان کی آخری منزل انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنا تھا۔ لہٰذا ۱۹۱۹ء میں اپنے اختیارات میں اضافہ کرانے کے بعد بھی وہ حسب سابق غیر مطمئن رہے چنانچہ ۱۹۳۵ء میں انگریزوں نے تیسری بار صوبائی حکومتوں کے اختیارات میں اضافہ کیا اگر یہ اختیار اپنے ہاتھ میں برقرار رکھا کہ وہ جب کبھی کسی صوبے میں ضروری سمجھیں گے صوبائی حکومت کو برطرف کر کے اختیارات راست طور پر مرکزی حکومت کے ہاتھ میں واپس لے لیں گے۔ صوبائی انتظامیہ پر نظر رکھنے کے لئے برطانوی حکومت نے ہر صوبے میں اپنا ایک گورنر مقرر کیا جو صوبائی حکومت کی کارکردگی سے مرکزی حکومت کو باخبر رکھا کرتا تھا۔

۱۹۴۷ء میں انگریز برصغیر سے رخصت ہو گئے۔ ہندوستان نے ۱۹۴۹ء میں ملک کے انتظامات کو چلانے کے لئے ایک نیا آئین بنایا جس نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی جگہ لی۔ اس آئین میں مرکزی حکومت کے اختیارات جو اب تک وائسرائے کے ہاتھ میں تھے پارلیمنٹ کو منتقل کر دیئے گئے اور انتظامیہ کو چلانے کے لئے ایک کابینہ تجویز کی گئی۔

اختیارات کی تقسیم کے بارے میں نہایت قابل ذکر بات یہ ہے کہ انگریزوں نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مابین، اختیارات کی جو تقسیم کی تھی اسے جوں کا توں برقرار رکھا گیا۔ صوبائی حکومتوں کو جتنے اختیارات دیئے گئے تھے ان کی فہرست میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا اور مرکزی حکومت کے ہاتھ میں جو اختیارات پہلے سے چلے آرہے تھے ان میں کوئی کمی نہیں کی گئی کیونکہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں زیادہ سے زیادہ ممکنہ اختیارات صوبوں کو تفویض کئے جا چکے تھے (ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۱۔ صفحہ نمبر ۲۴۸)

اب اگر ان کے اختیارات میں مزید اضافہ کیا جاتا تو مرکزی حکومت کمزور ہو جاتی اور ملک کی سیاسی وحدت اور بین الصوبائی رابطے کو قائم رکھنے میں دشواری پیش آتی لہٰذا دفاع، امور خارجہ، کرنسی، محصولات، بین الاقوامی تجارت، مردم شماری، پاسپورٹ و ویزا، شہریت، جہاز رانی، تیل و معدنیات، عدالت عالیہ و عظمیٰ، بیمہ و بینکاری، غیر ملکی قرضہ جات، غیر ملکی معاہدات وغیرہ جو ملک کی سیاسی وحدت کے لئے ضروری تھے اور ڈاک، تار، ٹیلی فون، ریلوے، فضائی مواصلات وغیرہ جو بین الصوبائی رابطوں کو قائم رکھنے کے لئے ناگزیر تھے، مرکزی حکومت نے اپنے ہاتھ رکھے۔ اس کے برعکس صحت عامہ، تعلیم، زراعت، ضلعی عدالتیں، پولیس، امن عامہ، روڈ ٹرانسپورٹ، دریائی ماہی گیری، جیل خانہ جات، جنگلات، جنگلاتی حیوانات

بلدیاتی ادارے اور صنعت وغیرہ جو ہر صوبے کے جدا جدا امور تھے اور جن کا ملک کی سیاسی وحدت یا بین الصوبائی رابطے سے کوئی تعلق نہ تھا صوبائی حکومتوں کی تحویل میں رہنے دیئے گئے۔ صوبوں نے بھی اختیارات کی اس تقسیم پر کبھی بے اطمینانی کا اظہار نہ کیا۔

محکموں کی تقسیم کے معاملے میں پاکستان میں صورت حال ذرا مختلف تھی۔ اس کا ایک بڑا صوبہ باقیماندہ صوبوں سے ہزار میل کے فاصلے پر واقع تھا اس جغرافیائی دوری کی بنا پر ضروری تھا کہ ایسے امور جو دونوں بازوؤں کے مابین مشترکہ اہمیت کے حامل نہیں ہیں وہ مرکز کے ہاتھ سے لے کر دونوں بازوؤں کے درمیان تقسیم کر دیئے جائیں۔ اس انتظامی ضرورت کے تحت مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کو ملا کر ون یونٹ بنایا گیا اور اس کے بعد ریلوے، واپڈا، پی آئی ڈی سی اور چند دیگر محکمے مرکز نے ملک کے دونوں بازوؤں کو علیحدہ علیحدہ تفویض کر دیئے۔ اختیارات کی یہ تقسیم دونوں بازوؤں کے لیڈروں کی مکمل رضامندی سے عمل میں آئی۔ یہ کام ۱۹۵۶ء کے آئین میں انجام دیا گیا۔ مگر بد قسمتی سے اس آئین کو کام کرنے کا موقع نہیں دیا گیا اور ۱۹۵۸ء میں ایوب خاں نے اقتدار پر قبضہ کر کے اسے منسوخ کر دیا۔ ان کے برسر اقتدار آنے کے بعد ملک میں مارشل لا کا راج قائم ہو گیا۔ صوبائی حکومتیں ختم کر دی گئیں اور صوبوں پر مارشل لا ایڈمنسٹریٹروں کی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ عملاً اس کا مفہوم یہ تھا کہ صوبائی حکومتوں کے اختیارات مرکزی حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ ایوب خاں کا تعلق چونکہ مغربی پاکستان سے تھا اور دارالسلطنت بھی مغربی پاکستان میں واقع تھا اس لئے مشرقی پاکستان والوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کو غلام بنا دیا ہے۔ وہاں کے بعض لیڈروں کو جو اپنی صلاحیتوں کی کمی کی وجہ سے قومی سطح کے لیڈر نہ بن سکتے تھے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہاتھ آ گیا اور انہوں نے اپنے صوبے کے عوام میں مغربی پاکستان کے خلاف تعصب اور نفرت پھیلانی شروع کر دی۔ مقصد یہ تھا کہ ان کی لیڈری چمکے اور وہ حکومت کے حصہ دار بن جائیں۔ ان لوگوں نے اس سے بھی دریغ نہ کیا کہ مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علیحدہ کرنے کی کوشش کریں۔ بھارت نے بھی ایسے لیڈروں کی بڑی ہمت افزائی کی۔ اگرتلہ سازش کیس اسی صورت حال کی پیداوار تھا۔

مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہو جانے کے بعد ۱۹۷۳ء میں موجودہ پاکستان کا ایک آئین بنا۔ اس کے تمام صوبے جغرافیائی طور پر چونکہ مربوط تھے (اور ہیں) اس لئے ایسے بعض محکمے جو جغرافیائی دوری کی

Marfat.com

بنا پر مشرقی اور مغربی پاکستان میں تقسیم کر دیئے گئے تھے، پھر سے مرکز نے اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ جیسے ریلوے کا محکمہ، بجلی کا محکمہ، صنعتی ترقی کا محکمہ وغیرہ۔ صوبوں کے لیڈر بھی اس صورت حال پر راضی تھے کیونکہ یہ بات معقول تھی۔ علاوہ ازیں اس آئین کے نفاذ کی صورت میں ۱۹۵۸ء کے بعد پہلی بار منتخب صوبائی حکومتوں کا قیام عمل میں آنے والا تھا اور انہیں آئین میں تجویز کردہ اختیارات کو استعمال کرنے کا موقع ملنے والا تھا۔

مگر ۱۹۷۳ء کے آئین کو، بد قسمتی سے نفاذ میں آنے کا دو دن کے لئے بھی موقع نہ ملا۔ ۱۴ر اگست ۱۹۷۳ء کو اسے نافذ کیا گیا اور دوسرے دن ملک میں ہنگامی حالت کا اعلان کر کے دستور کے ایک بڑے حصے کو معطل کر دیا گیا۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ۱۹۷۲ء کے عبوری آئین کے تحت قائم شدہ صوبائی حکومتیں جو حزب اختلاف کی جماعتوں پر مشتمل تھیں پہلے ہی توڑی جا چکی تھیں۔ ان دونوں باتوں کی وجہ سے صوبوں کو ان اختیارات سے بہرہ ور ہونے کا موقع نہیں ملا جو آئین میں ان کے لئے تجویز کئے گئے تھے۔

ان حالات میں ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ مرکزی حکومت سے مطالبہ اس امر کا کیا جاتا کہ صوبائی حکومتوں کو وہ اختیارات استعمال کرنے کا موقع دیا جائے جو ۱۹۷۳ء کے آئین میں تجویز کئے گئے تھے اس کے بجائے مطالبہ یہ کیا جا رہا ہے کہ جملہ اختیارات صوبوں کو منتقل کر دیئے جائیں۔ صرف دفاع، خارجہ پالیسی اور کرنسی کے محکمے صوبوں کے ہاتھ میں رہنے دیئے جائیں۔ گویا مجیب الرحمٰن کے ان چھ نکات کو پھر سے زندہ کیا جا رہا ہے جو ماضی میں ملک کو دولخت کرنے کا ذریعہ بنے تھے۔

بہر کیف! یہ ہے صوبائی خود مختاری کا پس منظر۔ اب آیئے ہم حقائق و واقعات کی روشنی میں اس مطالبے کا جائزہ لیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو ملحوظ رکھنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ دنیا کے بیشتر ملکوں میں وحدانی طرز حکومت قائم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان ملکوں میں تمام کے تمام اختیارات مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہیں۔ اس کے باوجود ان ملکوں کا نظم و نسق نہایت عمدگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صوبائی خود مختاری کسی ملک کی ترقی کے لئے امر لازم نہیں ہے۔

دنیا کے کم تر ملکوں میں وفاقی طرز حکومت قائم ہے۔ وفاقی ملکوں میں بھی اس بات کو ضروری سمجھا

Marfat.com

جاتا ہے کہ صوبوں کے مقابلے میں مرکز کے ہاتھ میں زیادہ اختیارات ہوں کیونکہ مرکز جتنا زیادہ مضبوط ہوتا ہے ملک اسی قدر مضبوط رہتا ہے اور ملک کے مختلف علاقوں میں اسی قدر یکسانیت قائم رہتی ہے مثلاً امریکہ، کناڈا، سوئٹزرلینڈ، جاپان وغیرہ میں۔

اختیارات کی تقسیم کے معاملے میں آسٹریلیا دنیا میں واحد ملک تھا جہاں صوبائی حکومتوں کو مرکز کے مقابلے میں زیادہ اختیارات دیئے گئے تھے مگر انتظامی نقطۂ نظر سے یہ اقدام نقصان دہ ثابت ہوا جس کے بعد صوبائی حکومتوں کے اختیارات میں سپریم کورٹ کی سفارش پر کمی کرنی پڑی۔

دنیا میں روس واحد ملک ہے جس نے اپنے آئین میں صوبوں کے لئے بہت سارے اختیارات تجویز کر رکھے ہیں اور یہ اختیار بھی وثیقہ کر رکھا ہے کہ کوئی صوبہ جب چاہے مرکز سے علیحدہ ہو جائے مگر دنیا جانتی ہے کہ یہ محض نمائشی اختیارات ہیں۔ وہاں صوبوں کو عملاً وہ کم سے کم اختیارات بھی حاصل نہیں ہیں جو کسی وفاقی حکومت میں ضرور ہونے چاہئیں۔ مذکورہ وعدوں اور یقین دہانیوں کے ساتھ وفاق قائم کر چکنے کے بعد روس کی کمیونسٹ پارٹی نے دوٹوک الفاظ میں یہ یقین دہانی منسوخ کر دی ہے۔

دوسری بات یہ ذہن نشین رہنی چاہئے کہ صوبوں کی ترقی کا انحصار حقیقتاً صوبائی خودمختاری پر نہیں ہوتا۔ ایک ہی آئین کے تحت ملک کے بعض صوبوں میں زیادہ ترقی دیکھنے میں آتی ہے اور بعض میں کم۔ مثلاً ہندوستان میں یو۔پی کا صوبہ ۱۹۰۹ء میں بھی ملک کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ صوبہ اور آسام واڑیسہ سب سے پس ماندہ صوبے تھے۔ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے تحت بھی ان صوبوں کے مابین یہ تفاوت برقرار رہا، ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت بھی اور اب ۱۹۴۹ء کے آئین کے تحت بھی برقرار ہے حالانکہ ان دساتیر کے تحت آسام اور اڑیسہ کو بھی اتنی ہی خودمختاری حاصل ہوتی رہی جتنی یو۔پی کو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ترقی میں ان کے مابین تفاوت کی وجوہات دوسری ہیں۔ مثلاً ایک وجہ یہ ہے کہ تمام صوبوں کے قدرتی وسائل ایک سے نہیں ہوتے۔ نفری قوت (MAN POWER) اور تعلیمی ترقی ایک سی نہیں ہوتی۔ ترقی کے لئے امنگ اور لگن ایک درجے کی نہیں ہوتی۔ اس حقیقت کو آپ زیادہ اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہیں تو برصغیر ہندو پاک کے ہر دیسی (COSMOPOLITAN) قسم کے شہروں پر نگاہ ڈالئے جہاں ملک کے ہر صوبے کے باشندے بستے ہیں۔ بعض لوگ ان شہروں میں تہی دست داخل ہوئے مگر اپنی جد وجہد اور صلاحیتوں کے سبب سے کروڑ پتی بن گئے جبکہ بعض لوگ پشت ہا پشت سے گدھا گاڑی

Marfat.com

ہانکتے نظر آتے ہیں حالانکہ یہ دونوں قسم کے لوگ ایک ہی صوبے کے ایک ہی شہر میں رہنے کی وجہ سے یکساں قسم کی خود مختاری کے سائے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ "آئین یا صوبائی خود مختاری" نہ گدھا گاڑی ہانکنے والے کو ترقی کرنے سے روکتی ہے اور نہ کروڑپتی بننے والے کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے۔

ترقی کے لئے انفرادی لگن کی موجودگی کا سب سے بیّن ثبوت ہندوستان میں مارواڑیوں اور خود اپنے ملک میں اسمٰعیلیوں اور بوہریوں کی معاشی ترقی ہے۔ سیاست وحکومت میں ان کا مطلقاً کوئی حصہ نہیں اس کے باوجود وہ معاشی خوشحالی کے مقام رفعت پر فائز ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ صوبائی خودمختاری کو ترقی کے لئے امر لازم سمجھتے ہیں، وہ بطور مجموعی پہلے بھی پس ماندہ و زبوں حال تھے اور آج بھی ہیں۔

یہ سب مثالیں اس امر کا قطعی اور حتمی ثبوت ہیں کہ ترقی کا انحصار آئین یا صوبائی خودمختاری پر نہیں ہوتا ورنہ پس ماندہ ممالک کے لئے یہ نسخہ کافی ہوتا کہ وہ امریکہ، روس، انگلستان یا کسی اور ترقی یافتہ ملک کا دستور اختیار کرلیں اور ترقی یافتہ بن جائیں مگر ایسا کبھی دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا۔

تیسری بات یہ پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ پاکستان کے جن شہروں میں ترقی ہوئی ہے وہ درحقیقت نجی شعبے (PRIVATE SECTOR) کی ترقی ہے، سرکاری شعبے کی ترقی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر صنعتی شعبے میں جو ترقی ہوئی ہے اور جو بلاشبہ نہایت قابلِ فخر ہے۔ وہ تقریباً تمام کے تمام نجی شعبے کی ہے۔ بینکاری کے شعبے میں جو ترقی ہوئی ہے اور جو بلاشبہ دنیا بھر کے لئے بے نظیر ہے، وہ بھی تقریباً تمام کی تمام نجی شعبے کی ترقی ہے۔ اسی طرح سے تعلیم میں، عمارت سازی میں، برآمداتی تجارت میں، صحافت میں، انشا پردازی میں یا ادویہ سازی میں جو ترقی ہوئی ہے تقریباً تمام کی تمام نجی شعبے کی ترقیاں ہیں، سرکاری سرمایہ کاری کی مرہونِ منت نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ کھیلوں میں، مصوری میں یا تصنیف وتالیف میں جو ترقی ہوئی ہے وہ بھی زیادہ تر نجی شعبے کی ترقی ہے۔ آئین نے کسی علاقے کے لوگوں کو اس بات سے نہیں روکا کہ وہ کھیلوں میں بین الاقوامی شہرت حاصل کریں یا علم وفضل کے میدان میں مقام اولیٰ حاصل کریں یا اعلیٰ درجے کی کتابیں تصنیف کریں یا سائنس کے میدان میں صلاحیتوں کے جوہر دکھائیں یا زندگی کی دوڑ میں دوسروں پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔

چوتھی بات یہ ملحوظ خاطر رکھنے کی ہے کہ اب تک جتنے کچھ انتظامی محکمے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ سے

Marfat.com

لے کر آج تک صوبوں کو تفویض کئے جا چکے ہیں ان میں سے کسی ایک محکمے میں بھی پس ماندہ صوبوں نے کسی قسم کی بہتری دکھا کر نہیں دی ہے۔ مثلاً زراعت کا محکمہ صوبوں کے پاس ہے مگر کسی بھی پس ماندہ صوبے نے غذائی پیداوار میں اضافہ کر کے خود کفالت کا درجہ حاصل نہیں کیا۔ وہ آج بھی جسم وجان کا تعلق قائم رکھنے کے لئے مرکزی حکومت سے اناج اور اشیائے خورد نی کی رسد کے محتاج ہیں۔ صحت عامہ کا محکمہ صوبوں کے پاس ہے مگر کسی پس ماندہ صوبے نے اپنے عوام کے علاج معالجے کا مسئلہ حل کر کے نہیں دیا۔ تعلیم کا محکمہ صوبوں کے پاس ہے مگر کوئی پس ماندہ صوبہ ناخواندگی کی ظلمت سے اپنے عوام کو نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ پولیس کا محکمہ صوبوں کے پاس ہے مگر کوئی صوبہ قتل، ڈاکہ، رہزنی، چوری اور اغوا کی وارادت سے محفوظ نہیں۔ روڈ ٹرانسپورٹ کا محکمہ صوبوں کے ہاتھ میں ہے مگر کوئی پس ماندہ صوبہ اپنے عوام کے ٹرانسپورٹ کا مسئلہ آج تک حل کر کے نہ دکھا سکا۔ ضلعی عدالتیں ان کے ہاتھ میں ہیں مگر ان کے عوام کو آج بھی بدستور سابق حصول انصاف کے لئے پوری زندگی بتا دینی پڑتی ہے۔ کن کن شعبوں کی حالت بیان کی جائے۔ کسی شعبے میں بھی کوئی مثبت اور امید افزا صورت حال نظر نہیں آتی۔

ایسی صورت حال میں اگر، صوبہ پرستوں کے مطالبے کی بنا پر، دفاع، خارجہ پالیسی اور کرنسی کو چھوڑ کر باقیماندہ محکمے بھی مرکز کے ہاتھ سے لے کر صوبوں کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں تو ان شعبوں میں کسی ترقی کی کیوں کر امید کی جا سکتی ہے؟

پانچویں بات یہ پیش نظر رکھنے کی ہے کہ نابرابری صرف صوبوں کے مابین ہی نہیں پائی جاتی بلکہ کسی صوبے کے مختلف علاقوں کے درمیان بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً لاہور سے گوجر خان کا کیا مقابلہ ہے یا کوئٹہ سے ضلع چاغی کا کیا مقابلہ ہے یا حیدرآباد سے ضلع بدین کا یا پشاور سے کوہاٹ کا کیا مقابلہ ہے؟ اس تمثیل سے یہ ثابت ہوا کہ ترقی صوبائی خودمختاری پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ مختلف حالتوں میں اس کے جدا جدا اسباب اور عوامل ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے آخری مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ ۱۹۶۹ء سے مرکزی حکومت کی تمام ملازمتوں میں صوبوں کا کوٹہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ گویا مرکزی حکومت کو چلانے میں ہر صوبہ بہ لحاظ آبادی پوری طرح شریک ہے حالانکہ دنیا کے دوسرے ملکوں بالخصوص ترقی یافتہ ممالک میں سرکاری محکموں میں تقرر صوبائی کوٹے پر نہیں ہوتا بلکہ امیدواروں کی لیاقت اور

Marfat.com

قابلیت پر ہوتا ہے۔ کوٹہ سسٹم کے نفاذ کے بعد اب اگر صوبوں کو تفویض کردہ اختیارات بھی مرکز کے سپرد کر دیئے جائیں تو صوبوں کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ ان کا حق بہ لحاظ آبادی محفوظ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوٹہ سسٹم صوبائی خودمختاری کی ہی ایک تبدیل شدہ شکل ہے اور یہ سسٹم صوبائی خودمختاری کی آخری حد ہے۔ اس حد کے اس پار کیا رکھا ہے جسے ہم حاصل کرنے کی کوشش کریں؟ اس حد کے اس پار تو ملک کی سالمیت کا مدفن ہے۔ اگر ہم نے اس حد کو توڑ دیا تو پھر وہ ملک ہی کہاں باقی رہے گا جس سے صوبائی خودمختاری طلب کی جا رہی ہے؟ اگر صوبائی خودمختاری کے بہانے ملک کی سالمیت کو ہی ختم کرنا مقصود ہو تو یہ اور بات ہے مگر کسی ملک کی قیادت وحکومت اپنی سالمیت کو اتنی آسانی سے کس طرح برباد ہوتے دیکھ سکتی ہے؟

صوبائی خودمختاری کے مسئلے پر غور کرتے وقت اس حقیقت کو ذہن میں ضرور رکھنا چاہیئے کہ جو لیڈران اس مطالبے کے سلسلے میں پیش پیش نظر آتے ہیں ان میں سے بیشتر ماضی میں خود صاحب اقتدار رہ چکے ہیں۔ وہ عوام کے لئے کوئی قابلِ قدر کام تو خیر کیا کرتے، انہوں نے اپنے دورِ حکومت کو بہتی گنگا سمجھ کے خوب خوب ہاتھ دھوئے۔ مثلاً بلوچستان کے جو لیڈر آج اس مطالبے میں پیش پیش ہیں وہ نو ماہ تک بلوچستان کے سیاہ وسفید کے مالک رہ چکے ہیں۔ ان کے دورِ حکومت کا سب سے نمایاں کارنامہ سڑکوں کی تعمیر یا اسپتالوں اور اسکولوں کا قیام نہیں بلکہ نواب اکبر بگٹی کے الفاظ میں یہ ہے کہ "وہ لوگ اپنے آٹھویں نویں جماعت پاس آدمیوں کو گریجویٹوں کے اوپر ترجیح دیتے رہے۔" (نواب صاحب کا خصوصی انٹرویو مطبوعہ ہفت روزہ لیل ونہار لاہور مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۷۲ء)

مندرجہ بالا معروضات کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ صوبائی خودمختاری کا مطالبہ ایک کھوکھلا اور سطحی مطالبہ ہے جسے پورا کر دینے سے صوبوں کو سراسر نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اور صوبے ان فوائد سے بھی محروم ہو جائیں گے جو انہیں آج حاصل ہیں۔

Marfat.com

صوبائی خودمختاری کے مضمرات

یہ تو ہے وہ عمومی نقصان جو مطلوبہ صوبائی خودمختاری حاصل ہونے سے تمام صوبوں کو پہنچے گا مگر اتنی زیادہ خودمختاری حاصل ہو گئی تو اس کا سب سے بڑا نقصان بلوچستان کو پہنچے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے جو لیڈر صوبائی خودمختاری میں اضافے کے خواہاں ہیں ان کا مقصد اپنے صوبے کی ترقی کو تیز کرنا نہیں بلکہ اس کو ترقی کے ان امکانات سے بچا کر رکھنا ہے جو مرکزی حکومت اپنے اختیارات کی رو سے اس صوبے میں کرنا چاہتی ہے یا کرنے کی کوشش کر سکتی ہے۔

اگر ہم بلوچستان کی سیاسی ہیئت ترکیبی کو ذرا وضاحت سے سمجھ لیں تو خودمختاری میں اضافے کے مضمرات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔

قیام پاکستان سے قبل ملک کے بعض دوسرے صوبوں کی طرح بلوچستان میں بھی کچھ ریاستیں تھیں۔ یہ قلات، جھالاوان، مکران اور لسبیلہ تھیں۔ باقیماندہ حصہ غیر ریاستی تھا۔ انگریزوں نے اپنی حکومت غیر ریاستی علاقے میں قائم کی جو برٹش بلوچستان کہلایا۔ بلوچستان میں ترقی کا جتنا کچھ کام ہوا وہ برٹش بلوچستان میں ہوا۔ ریاستیں بدستور نہایت پس ماندہ رہیں۔ انگریزوں نے بھی ان کے ترقیاتی امور میں دخل دینے کی حاجت محسوس نہ کی اور انہیں اپنا باجگذار بنانے پر اکتفا کیا کیونکہ اس نے ہندوستان کی باقی ماندہ پانچ سو پینسٹھ ریاستوں کے ساتھ بھی یہی طرز عمل اختیار کیا تھا۔ آزادی کے بعد جس طرح ہندوستان نے اپنے حصے کی تمام ریاستوں کو اپنے سیاسی نظام میں مدغم کر لیا اسی طرح پاکستان نے بھی اپنے علاقے کی ریاستوں کا انضمام کر لیا۔ جس طرح ہندوستان میں ریاستوں کے عوام نے اس انضمام کا خیر مقدم کیا اسی طرح سے پاکستان میں بھی ریاستی عوام نے اس اقدام کی پذیرائی کی کیونکہ انہیں سینکڑوں سالوں کی مطلق العنانی سے نجات حاصل ہو گئی تھی۔ بلوچستان کی ریاستوں کے سربراہوں کو یہ انضمام بہت ناگوار ہوا لہٰذا انہوں نے اس کی مزاحمت کی۔ انہیں ناگواری اس بنا پر ہوئی کہ وہ عرصے سے، لپشت در لپشت، اپنی ریاست کے مطلق العنان فرمانروا بنتے چلے آ رہے تھے اور بغیر کسی محنت کے اپنے عوام کی جیبوں سے حصہ رسدی حاصل کرتے چلے آ رہے تھے۔ اس کے بدلے میں انہیں اپنے عوام کو کچھ دینا بھی نہ پڑتا تھا۔ ان کے عوام پیدائشی طور پر ان کے اطاعت گزار ہوتے تھے۔ کیونکہ انہیں کبھی بھی قبائلی نظام اور قبائلی ماحول کی چہار دیواری سے باہر جھانکنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ وہ

ازل سے اسی طرح چلے آ رہے تھے۔ تعلیم، ترقی اور شہریت سے نا آشنا تھے۔ اپنے قبائلی ماحول کو ہی وہ دنیا کی سب سے متمدن اور ترقی یافتہ سوسائٹی سمجھتے تھے۔ ریاستی سربراہوں یعنی سرداروں اور معتبرین سے بڑھ کر ان کی نگاہ میں کسی کی مقتدر حیثیت نہ تھی۔ اس لئے جب وہ پیدا ہوتے تھے تو سردار کے اطاعت گزار کی حیثیت سے اور مرتے تھے تو سردار کے اطاعت گزار کی حیثیت سے۔ سردار ہی ان کی ابتدا بھی تھے اور سردار ہی انتہا بھی۔ سردار جو حکم دیتے وہ بسر و چشم اس کی اطاعت کیا کرتے تھے۔

ایسی مطلق العنانی اور بالادستی کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی دنیا میں حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ سردار اپنی اس مطلق العنانی کا خاتمہ کسی قیمت پر گوارہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی مزید خوش بختی یہ تھی کہ وہ اپنے عوام کو جنہیں انہوں نے ہمیشہ مسلح کئے رکھا، کسی بھی قوت کے خلاف بلا چوں و چرا صف آرا کر سکتے تھے۔ اور بے چارے عوام چونکہ سرداروں کے مقابلے میں کسی کو اپنا بہی خواہ نہیں جانتے تھے اس لئے وہ بلا چوں وچراں ان کے خلاف سنگین تان کر کھڑے ہو جاتے تھے۔

اس صورت حال کو برقرار رکھنے کے لئے سرداروں نے دو کاموں پر نہایت کڑی نظر رکھی۔ ایک یہ کہ ان کی ریاست میں علم کی روشنی نہ پہنچنے پائے اور دوئم یہ کہ وہاں سڑکیں نہ بننے پائیں کیونکہ ان دونوں چیزوں کی وجہ سے ان میں روشن خیالی اور آزادی پسندی پیدا ہوگی اور وہ سرداری نظام کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکیں گے۔

سرداروں کے اسی طرزِ عمل نے بلوچستان کی ریاستوں اور قبائل کو بے حد پس ماندہ بنائے رکھا۔ وہ ریاستیں آج بھی اسپتالوں، سڑکوں، اسکولوں، کارخانوں اور بلند و بالا عمارتوں سے محروم ہیں حالانکہ گزشتہ سالوں میں پاکستان کے ہر علاقے میں نہایت نمایاں ترقی ہوئی اور یہ ترقی زندگی کے ہر شعبے میں ہوئی۔ مثلاً کراچی جو قیام پاکستان کے وقت ایک چھوٹا سا تجارتی شہر تھا، ہمہ جہت ترقی یافتہ شہر بن گیا۔ یہاں کارخانے نام کو نہ تھے۔ آج یہاں کارخانوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں صرف دو کالج تھے، آج ان کی تعداد پچاس سے متجاوز ہے۔ بمشکل دو سو اسکول تھے آج تین ہزار سے زیادہ ہیں۔ گنتی کے چند بنک تھے۔ آج کل گلی گلی اور محلہ محلہ بنکوں کی شاخیں قائم ہیں اور یہ ساری ترقیاں اسی صوبائی خود مختاری کی حدود کے اندر رہ کر ہوئی ہیں جنہیں بعض لیڈر ترقی کے لئے ناکافی سمجھتے ہیں۔ کراچی کی مثال یہاں پر اس

Marfat.com

وجہ سے دی گئی ہے کہ یہ وہ شہر ہے جہاں پاکستان کے ہر علاقے کے باشندے لاکھوں کی تعداد میں آباد ہیں۔ یہاں پٹھان بھی ہیں، بلوچ بھی ہیں، سندھی بھی ہیں، پنجابی بھی ہیں، کشمیری بھی ہیں اور مہاجر بھی۔ اس شہر کی ترقی میں سب نے بھرپور حصہ لیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پٹھان، بلوچ، سندھی اور پنجابی اگر چاہیں یا ان سے چاہا جائے تو وہ اپنے صوبے کو اتنا ہی ترقی یافتہ بنا سکتے ہیں جتنا انہوں نے کراچی کو بنا دیا ہے۔

مگر بلوچستان بدستور پس ماندہ رہا۔ مرکزی حکومت نے بارہا وہاں کے لئے ترقی کے منصوبے بنانا چاہے مگر سرداروں نے کبھی بھی ان منصوبوں کو روبہ عمل آنے نہ دیا حالانکہ سرداروں نے خود اپنے لئے گزشتہ تیس تبیس سالوں میں بڑی بڑی کوٹھیاں تعمیر کرائیں۔ متعدد سردار اور بلوچ لیڈر کراچی میں لاکھوں روپے کے پرشکوہ بنگلوں کے مالک ہیں جو دنیا بھر کے سامان آرائش سے پُر ہیں۔

قول وعمل کے اس تضاد کے باوجود وہ دنیا کی نگاہ میں جمہوریت اور آزادی کے نقیب کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اسمبلیوں میں بھی یہی لوگ منتخب ہو کر آتے رہے (کیونکہ کوئی انکے مقابلے پر کھڑا نہ ہو سکتا تھا) اور وہاں پہنچ کے انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی سے وابستگی قائم کی۔ یہ جماعت چونکہ بایاں بازو کی جماعت تھی اور اس خصوصیت کی بنا پر عالمی پریس کا بایاں بازو اسے بین الاقوامی پبلسٹی دیتا رہا۔ اور انہیں جمہوریت اور حریت کا چمپین قرار دیتا رہا۔ اس لئے سرداران اپنی تمام تر جمہوریت کشی اور آزادی دشمنی کے باوجود عالمی رائے عامہ کی نگاہ میں جمہوریت اور خودمختاری کے نقیب کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ ان کے بارے میں عالمی پریس کا پروپیگنڈا اس قدر موثر ہے کہ خود پاکستان میں اخبار بین طبقہ انہیں ایسا ہی سمجھتا ہے جیسا عالمی پریس انہیں بنا کر پیش کرتا رہا ہے۔

بلوچستان کے بارے میں سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ راقم الحروف کی نہایت محتاط رائے ہے ورنہ خود بلوچستان کے بعض بے باک لیڈر وہاں کی زبوں حالی میں وہاں کے والیان ریاست اور سرداروں کو اس سے بہت زیادہ قصوروار گردانتے ہیں جتنا سطور بالا میں گردانا گیا ہے۔ مثال کے طور پر میر عبد الباقی بلوچ کے ایک طویل مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"قیام پاکستان تک ان چاروں ریاستوں (قلات، لسبیلہ، جھالاوان اور مکران) میں صرف ایک ہائی اسکول تھا جو خان قلات نے اپنی حکومت چلانے کے لئے منشی وغیرہ پیدا کرنے کی غرض سے کھولا

Marfat.com

رکھا تھا۔ پاکستان کے ساتھ الحاق کے بعد زیادہ سے زیادہ علاقوں میں تعلیمی ادارے کھلنے لگے جس پر سردار لوگ سمجھ گئے کہ آئندہ تیس چالیس سال میں غریب عوام جاگ اٹھیں گے اور ان کی یہ جاگیر بھی ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے نکل جائے گی لیکن جب ون یونٹ بنا اور یہ ریاستیں صوبہ مغربی پاکستان میں ضم کردی گئیں تو ان سرداروں نے اس کی مخالفت میں خون پسینہ ایک کردیا کیونکہ اتنے بڑے علاقے پر مشتمل صوبائی حکومت پر سردار کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے۔ اور مختلف علاقوں سے کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کا تبادلہ ہو کر بلوچستان میں تقرر ہوتا تھا جن کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم بھی نہیں ہوتے تھے۔ اس طرح وہ عوام میں اپنا یہ بھرم قائم نہیں رکھ سکتے تھے کہ حکومت ان کی دوست ہے اور وہ اب بھی جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ اس لئے (ون یونٹ توڑ کر) صوبائی اسمبلی اور حکومت پر ان کے طبقے کے سرداروں کے قبضے کے علاوہ کوئی دوسری بات ان کے مفاد میں ممکن نہ تھی۔ اس لئے تمام سردار باہم مل کر اس امر کی کوشش کرنے لگے کہ بلوچستان صوبے کی حیثیت سے بحال ہو جائے تاکہ وہ اس میں اپنا موروثی سرداری اقتدار بحال کر سکیں۔ نیپ نے سرداروں کی اس جنگ کو پاکستان میں جمہوریت بحال کروانے کے لئے قربانیوں کا نام دے کر پاکستانی عوام سے خوب خوب داد حاصل کی۔"

یحییٰ خان کے دور حکومت میں ون یونٹ توڑا گیا تو بلوچستان بھی ایک مکمل صوبہ بن گیا اور نیپ سے وابستہ ان سرداروں کی دیرینہ مرادیں بر آئیں۔ انہوں نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے اپنی نام نہاد سوشلسٹ جماعت نیپ کے ذریعہ جہاں غریبی ہٹانے کے نعرے پر انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا وہاں مکمل صوبائی خودمختاری کا مطالبہ بھی اس لئے بڑی شد و مد کے ساتھ داغ دیا کہ اقتدار پر اچھی طرح قبضہ کر لینے کے بعد جب وہ بلوچستان پر اپنے دلپسند فرسودہ سرداری نظام کو سوشلزم کا لیبل لگا کر مسلط کرنا چاہیں تو کوئی بھی ان کو روکنے والا نہ ہو۔"

آگے چل کر باقی بلوچ رقم طراز ہیں کہ:

" ادھر مرکز میں (بھٹو کے دور حکومت میں) بین الاقوامی سیاست بھی کارفرما ہے۔ اور ایک بلوچ لیڈر (نام حذف کر دیا گیا ہے۔ مصنف) اپنے صنعت کار خریداروں کے توسط سے ایک طرف تو برطانیہ کی آنکھ کے تارے ہیں دوسری طرف سوشلسٹ چولے کے ذریعے روس کے راج دلارے اور تیسری طرف مہاتما گاندھی کے بھگت ہونے کے وسیلے سے اندرا گاندھی کے بھی من موہنے ہیں۔ ایسی تثلیث میں قلعہ بند ہو جانے کے بعد پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہو ہی جایا کرتا ہے۔ ساحل مکران سے متعلق روس کی سامراجی ضرورت کے پیش نظر مذکورہ بلوچ لیڈر کو روس سے منسلک رہ کر اپنے ہم قماش سرداروں کے اصل عزائم کی تکمیل زیادہ آسان

Marfat.com

دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ بلوچستان پاکستان کا ناقابل تقسیم حصہ بنے رہنے کی صورت میں مذکورہ بالا بلوچ لیڈروں کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کسی بھی وقت مرکز میں کوئی معقول حکومت برسر اقتدار آسکتی ہے جو پھر بلوچستان کے غریب عوام کی بھلائی میں ایسے حالات پیدا کر سکتی ہے جس سے نیپ کے سرداروں کے اس سارے پروگرام پر پانی پھر جائے جس کے لئے انہوں نے سالہا سال تک صعوبتیں جھیلی ہیں۔ اس کے برعکس یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر بلوچستان خدانخواستہ روس کی کالونی بن جائے تو اندرونی حکومت نیپ کے سرداروں کے ہاتھ میں ہی ہوگی۔ اور جہاں تک سوشلزم کا تعلق ہے سو وہ بلوچستان میں اس لئے ناممکن ہے کہ عوام تک تعلیم کی روشنی اور نئی دنیا کی ہوا تک نہیں پہنچنے دی گئی۔ اس لئے روسی کسی طرح بھی یہ کام نہیں کر دا سکیں گے"۔

(ہفت روزہ لیل ونہار لاہور مورخہ ۲۸ جنوری ۱۹۷۳ء)

یہ تو تھا بلوچی سرداروں پر فاضل مصنف کا عائد کردہ فرد جرم۔ اب ذرا ان سرداروں کا "اقبال جرم" ملاحظہ فرمائیے۔

سردار خیر بخش مری جو بلوچستان کے چار سب سے بڑے سرداروں میں شمار ہوتے ہیں ایک انٹرویو میں جس کے ملاقات نگار جناب مختار حسن ہیں فرماتے ہیں:

"...... ہمارے قبائل کے لوگوں نے آج تک یہی دیکھا کہ سڑک ان کے لئے ملیشیا پولیس اور تھانہ لاتی ہے۔ ان کے رسم و رواج کا خاتمہ ہو جاتا ہے جسے وہ اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اگر ان کے سامنے سڑک کے فوائد والے پہلو نمایاں ہوتے تو وہ اس کے اس قدر خلاف نہ ہوتے"۔

"...... نیپ کی حکومت کے دوران مری علاقے میں سڑک کا مسئلہ مری قبیلے میں زیر بحث آتا رہا۔ وہ (قبیلے کے لوگ) سڑک کے فوائد کے تو قائل ہو جاتے ہیں لیکن سڑکوں سے آنے والے نقصانات کا راستہ روکنے کا کوئی طریقہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا"۔

آگے چل کر وہ فرماتے ہیں کہ "...... ممکن ہے کہ کئی برسوں کے آہستہ آہستہ عمل کے بعد وہ سڑکوں اور دیگر ذرائع مواصلات کے قائل ہو جائیں لیکن یہ تب ہی ہوگا جب انہیں یقین ہوگا کہ سڑک، اسکول، اسپتال اور عام فائدے کے دوسرے ادارے تو لائے گی لیکن تھانہ پولیس نہیں لائے گی۔ بلوچ قبائل کے لئے سب سے زیادہ برانگیختہ کرنے والی بات یہ ہے کہ تھانہ پولیس آنے کے بعد سیاہ کاری اور بلوچی غیرت

Marfat.com

دخمیت سے متعلق حالات اور گھریلو تنازعات میں بھی اوروں کو عمل دخل ہو جائے گا —
پولیس کو ایسے معاملات میں قبائل پر اختیار حاصل ہو گا۔ یہ تمام صورت حال ایک بلوچ کے لئے قبائلی بلوچی رسم ورواج اور روایات کی رو سے اتنی اہانت آمیز ہے کہ وہ اسے کسی قیمت پر قبول نہیں کر سکتا۔"

(ہفت روزہ لیل ونہار مورخہ ۳ جون ۱۹۷۳ء)

نواب خیر بخش مری کے اس انٹرویو سے کم سے کم اتنا تو ضرور ثابت ہوا کہ بلوچستان کی پس ماندگی کا سبب صوبائی خود مختاری کی کمی نہیں ہے۔ حکومت وہاں ترقیاتی کام کرنا چاہتی ہے مگر خود بلوچستان، خواہ وہ وہاں کے سردار رہوں یا نواب صاحب کے دعوے کے بموجب وہاں کے عوام، مزاحمت کرتا آ رہا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ خود نیپ اپنے پونے سالہ دورِ حکومت میں جس کے گورنر صوبائی خود مختاری کے سب سے بڑے نقیب جناب غوث بخش بزنجو اور وزیر اعلیٰ سردار عطا اللہ مینگل تھے، کوئی ترقیاتی کام نہ کر سکی۔

میر عبدالباقی بلوچ سے بھی زیادہ مقتدر اور ممتاز ایک اور بلوچ لیڈر اس صورت حال کی ذمہ داری بلوچ عوام کے بجائے نواب خیر بخش مری پر عائد کرتے ہیں اور وہ بلوچ لیڈر نواب اکبر بگٹی ہیں۔ نواب صاحب جناب مختار حسن سے ایک خصوصی انٹرویو میں فرماتے ہیں کہ:

"...... ہمارے نواب، مری صاحب اپنے علاقے میں اسکول، اسپتال نہیں بنانے دیتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے قبیلے کے لڑکے سخت جان رہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسکولوں میں پڑھنے سے مری سخت جان نہیں رہیں گے۔ ان میں بلوچیت باقی نہیں رہے گی۔ ان چیزوں پر وہ اس لئے یقین کرتے ہیں کہ وہ اپنے قبیلے کے لئے سربند معاشرہ (CLOSED SOCIETY) برقرار رکھ سکیں گے۔"

(لیل ونہار ۱۷ جون ۱۹۷۳ء)

ترقیاتی کاموں کے سلسلے میں مزاحمت فی الحقیقت بلوچ عوام کی طرف سے ہے، یا سرداروں کی طرف سے، اس کا اندازہ کرنے میں یہ امر واقعہ ہماری مدد کر سکتا ہے کہ اسمبلیوں کے انتخابات میں بلوچی سرداروں کے بجائے بمشکل کبھی کوئی عام آدمی منتخب ہو سکا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرداران اپنے قبائل میں اس قدر مقتدر اور زور آور ہیں کہ ان کے کسی حریف کو ووٹ دینے کی جرأت بھی ان کے عوام میں موجود

Marfat.com

نہیں ہے۔ اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بلوچی عوام کو خفیہ رائے دہی میں بھی اتنی جرأت اور اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ سرداروں کی مرضی کے خلاف کسی کو منتخب کر سکیں۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے علاقے کے دیگر معاملات میں مثلاً ترقیاتی کاموں میں اپنے سرداروں کی مرضی کے خلاف جا سکیں۔

بہر کیف! پس ماندگی کے ذمہ دار سردار ہوں یا بلوچی عوام دریں حالات اگر صوبائی خود مختاری میں اضافہ کیا گیا تو اس سے بلوچستان کو کیا فائدہ حاصل ہو سکے گا؟

Marfat.com

ضمیمہ

۱۹۳۵ء کے ایکٹ اور موجودہ بھارتی آئین میں مرکز اور صوبوں کے مابین محکموں کی تقسیم کا تقابلی گوشوارہ

محکمے	۱۹۳۵ء کا ایکٹ	موجودہ بھارتی آئین
۱۔ دفاع	مرکز	مرکز
۲۔ امور خارجہ	"	"
۳۔ غیر ملکی تجارت	"	"
۴۔ شہریت	"	"
۵۔ ملک میں داخلہ اور ہجرت	"	"
۶۔ ریلوے	"	"
۷۔ سمندری جہاز رانی	"	"
۸۔ لائٹ ہاؤس	"	"
۹۔ سمندری قرنطینہ	"	"
۱۰۔ فضائی مواصلات	"	"
۱۱۔ ڈاک و تار، ٹیلی فون و نشریات	"	"
۱۲۔ عوامی قرضہ جات	"	"
۱۳۔ کرنسی	"	"
۱۴۔ آثار قدیمہ	"	"
۱۵۔ مساحت ارضی	"	"
۱۶۔ مردم شماری	"	"
۱۷۔ ٹریڈ مارک، کاپی رائٹ اور ایجادات وغیرہ	"	"

Marfat.com

محکمے	۱۹۳۵ء کا ایکٹ	موجودہ بھارتی آئین
۱۸۔ اسلحے اور آتش گیر مادے	مرکز	مرکز
۱۹۔ کتب خانے اور عجائب گھر	"	"
۲۰۔ سمندری ماہی گیری	"	"
۲۱۔ ریسرچ وغیرہ اور تبادلہ محنت کاران	"	"
۲۲۔ پٹرول وغیرہ	"	"
۲۳۔ نقل وحرکت پر کنٹرول کا اختیار	"	"
۲۴۔ صنعتی ترقی کی پالیسی سازی	"	"
۲۵۔ کانوں کے مزدوروں کا تحفظ	"	"
۲۶۔ بیمہ کی ضابطہ بندی	"	"
۲۷۔ بینکاری کی ضابطہ بندی	"	"
۲۸۔ وفاقی مقننہ کے انتخابات	"	"
۲۹۔ کسٹم ڈیوٹی	"	"
۳۰۔ اکسائز ڈیوٹی	"	"
۳۱۔ انکم ٹیکس و سیلز ٹیکس	"	"
۳۲۔ اوزان و پیمانے	"	"
۳۳۔ وراثت ٹیکس	"	"
۳۴۔ وفاقی تعمیرات	"	"

ان کے علاوہ ۲۴ مزید محکمے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں مرکزی حکومت نے اپنی تحویل میں رکھے۔ یہ محکمے چونکہ کم اہمیت کے حامل تھے اس لئے گوشوارے میں انہیں درج نہیں کیا گیا ہے۔ مگر یہ سب کے سب محکمے بھی موجودہ بھارتی آئین میں ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی طرح مرکزی حکومت کی تحویل میں رکھے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ نئی روز افزوں ضروریات کی بنا پر تقریباً ۳۰ مزید محکمے قائم کیے گئے۔ مثلاً ایٹمی توانائی کا

Marfat.com

محکمہ، سراغرسانی کا، مجلس اقوام متحدہ کا، بین الاقوامی کانفرنسوں کا، غیر ملکی قرضہ جات کا، سابق والیان ریاست کا، بین الصوبائی تجارت کا، اسٹاک ایکسچینج کا، فلم سازی و فلم بینی کا، عدالتوں کے حدود اختیارات کے تعین کا، مگر یہ سب کے سب محکمے مرکزی حکومت نے اپنی تحویل میں رکھے۔

اس وقت بھارت کے آئین کے ۱۶۳ محکموں میں سے ۹۷ مرکزی حکومت کی تحویل میں ہیں۔ گویا ساٹھ فیصد، جبکہ صوبائی حکومت کی تحویل میں صرف ۶۶ محکمے ہیں۔ یعنی ۴۰ فیصد۔ دریں حالات اگر پاکستان کے آئین میں بھی ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تجویز کردہ محکمے مرکزی کی تحویل میں ہوں تو اعتراض کی کیا گنجائش ہے؟ پاکستان کے آئین نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں صوبوں کے لئے تجویز کردہ تمام کے تمام محکمے بھارتی آئین کی طرح جوں کے توں صوبوں کی تحویل میں رہنے دیئے ہیں علاوہ ازیں بعض ایسے محکمے جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ اور بھارتی آئین میں مرکزی حکومت کی تحویل میں رکھے گئے ہیں مثلاً اسلحہ سازی، آتش گیر مادے، آثار قدیمہ، فلم سنسرشپ وغیرہ کے محکمے، پاکستان کے آئین میں صوبوں کی تحویل میں دے دیئے گئے ہیں۔

ہمارے آئین میں اس وقت صوبوں کی تحویل میں کل ۱۱۳ محکموں میں سے ۵۴ محکمے ہیں۔ یعنی کل محکموں کا ۴۷ فیصد۔ ان میں قابلِ ذکر طور پر امن عامہ، پولیس، مقامی عدالتیں، جیل خانہ جات، لوکل گورنمنٹ، صحت عامہ، تعلیم، زراعت، صنعت، سڑکیں، مواصلات، آب رسانی، ملکیت اراضی، جنگلات، جنگلاتی حیوانات، ماہی گیری، مارکیٹنگ، تعمیرات، لگان اراضی اور متعدد قسم کے محصولات کے محکمے شامل ہیں۔

Marfat.com

کراچی صوبہ کا مطالبہ

پچھلے چند برسوں سے کراچی کے بعض حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جانے لگا ہے کہ کراچی کو ایک جداگانہ صوبے کی حیثیت دی جائے۔ یہ مطالبہ اس نظریئے پر مبنی ہے کہ ایسا ہونے سے اس شہر کے ایسے مسائل جو مالی وسائل کی قلت کی وجہ سے حل طلب ہیں، حل ہو جائیں گے کیونکہ اس شہر سے حاصل ہونے والی محصولات کا یہ شہر بلا شرکت غیرے حقدار ہو جائے گا علاوہ ازیں شہر کے بے روزگار نوجوانوں کی بے روزگاری کا مسئلہ حل ہو جائے گا کیونکہ مطلوبہ صوبائی انتظامیہ کے مختلف شعبوں میں پیدا ہونے والی اسامیوں کے لئے اس شہر کے نوجوانوں کو ترجیح حاصل ہو گی۔

گذشتہ چند برسوں میں اس شہر میں فی الواقعی بے روزگاری میں اضافہ ہوا ہے۔ بالخصوص تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد برسوں سے روزگار سے محروم ہے۔ جن والدین نے اپنے بچوں کو روز پیدائش سے ۲۰-۲۵ سال تک پالا، انہیں تعلیم دلائی اور ان کے مستقبل سے اچھی امیدیں وابستہ کیں وہ جب اختتام تعلیم کے بعد انہیں حصول روزگار کی خاطر دفتروں کے دروازوں سے مایوس و نامراد واپس لوٹتے دیکھتے ہیں تو ان کی حرماں نصیبی بے اندازہ بڑھ جاتی ہے اور ان کے دلوں میں کراچی کو صوبہ بنانے کے مطالبے کے لئے زبردست جذبہ ہمدردی پیدا ہو جاتا ہے اور بلاشبہ یہ ایک فطری امر ہے۔

کراچی کو جداگانہ صوبہ بنانے سے اگر مذکورہ مسئلے حل ہو جائیں اور کوئی جوابی مسئلہ رونما نہ ہو تو اسے روبہ عمل لانا بلاشبہ معقول بات ہو گی جسے ہر انصاف پسند انسان کی حمایت حاصل ہو گی۔ مگر پہلے حقیقت پسندی کے ساتھ اس امر کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے کہ مطلوبہ صوبے سے جو توقعات وابستہ کی جا رہی ہیں وہ فی الحقیقت پوری ہوں گی یا محض ایک خیال خام ہیں۔ یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ ایسا کرنے سے کوئی جوابی مسئلہ تو رونما نہیں ہو جائے گا۔

کراچی کو صوبہ بنا دینے سے بے روزگاری میں کمی ضرور واقع ہو گی کیونکہ اس وقت صوبہ سندھ کی جملہ اسامیوں میں شہری علاقے کا کوٹہ صرف چالیس فیصد ہے۔ اس چالیس فیصد کے حصہ دار کراچی کے علاوہ حیدرآباد اور سکھر بھی ہیں جبکہ کراچی سے فارغ التحصیل ہونے والے گریجویٹوں کی تعداد صوبے

کے باقیماندہ اضلاع کے مقابلے میں کم سے کم پانچ گنا زیادہ ہے۔ یہی وہ صورت حال ہے جس کی وجہ سے اس شہر کے بے روزگار نوجوانوں اور ان کے والدین کے دلوں میں اسے صوبہ بنانے کے مطالبے کے لئے جذبہ ہمدردی پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ مطالبہ پورا ہوگیا تو یہاں کی جملہ اسامیوں کے مستحق صرف اس شہر کے نوجوان ہوں گے۔ مگر کراچی صوبہ کے حامیوں نے اس امر کو کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ اس شہر کو علیحدہ صوبہ بنانے کے بعد بھی اسامیوں کی تعداد اتنی زیادہ نہ بنے گی جتنی یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے نوجوانوں کی ہے۔ اگر پورے صوبہ سندھ کی تمام کی تمام اسامیاں بھی کراچی کے گریجویٹوں کے لئے مختص کر دی جائیں جب بھی اس شہر کے گریجویٹوں کی بے روزگاری کا مسئلہ حل نہ ہوگا کیونکہ یہاں سے ہر سال جملہ علوم میں کم و بیش پندرہ ہزار طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں جبکہ سرکاری دفاتر میں جو نئی آسامیاں بنائی جاتی ہیں ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسئلے کا حل کراچی کو علیحدہ صوبہ بنانے میں نہیں بلکہ کہیں اور پوشیدہ ہے جسے ہمیں تلاش کرنا چاہیئے۔ دوسری طرف، اس صوبے کی تشکیل اس قدر بے شمار مسائل پیدا کر دے گی جسے حل کرنا کسی کے بس میں نہ ہوگا۔ مندرجہ ذیل نکات کی مدد سے مطلوبہ صوبے کی مضرت رسانیوں کو سمجھا سکتا ہے۔

۱۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ کراچی صوبہ سندھ کا ایک شہر ہے۔ مہاجرین کی آمد سے پہلے بھی یہ صوبے کا سب سے اہم اور سب سے بڑا شہر تھا۔ دار السلطنت بنانے کے لئے اسے سندھ سے علیحدہ کرنا اور بات تھی مگر اسے سندھ سے کاٹ کر علیحدہ صوبہ بنا دینا اپنی نوعیت اور عملی قدر و قیمت کے اعتبار سے بالکل جداگانہ بات ہے۔ اول الذکر اقدام اہل سندھ میں احساس محرومی پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بنا۔ اس سے انہیں کوئی خاص نقصان پہنچا بلکہ یہ بات ان کے لئے وجہ افتخار تھی کہ ان کے صوبے کے ایک شہر کو ملک کا دار السلطنت بنانے کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ مگر موخر الذکر اقدام کا مطلب یہ ہوگا کہ سندھ کو اپنے سب سے اہم اور سب سے بڑے شہر سے محروم کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اہل سندھ اس کے لئے کبھی آمادہ نہ ہوں گے۔ اور اپنے شہر کو بچانے کے لئے ہر ممکن طریقہ مزاحمت اختیار کریں گے۔

۲۔ کراچی کے شہریوں کے ان افراد کے لئے جو دوسرے اضلاع میں سکونت پذیر ہیں امن و سکون کی زندگی گزارنا مشکل ہو جائے گا کیونکہ کراچی کے سندھ سے علیحدہ کر دیئے جانے پر اہل سندھ

میں جو غم و غصہ پیدا ہوگا وہ اندرون سندھ بسنے والے مہاجرین کو مشق ستم اور نشانۂ انتقام بنائے گا۔

۳۔ مطلوبہ صوبے کا قیام عمل میں آتے ہی اس ہر دیسی (COSMOPOLITAN) شہر میں بسنے والے مختلف علاقوں کے باشندے اپنے اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے باہم دگر دست بگریبان ہو جائیں گے۔ یہ کشمکش مہاجروں اور غیر مہاجروں کے درمیان ہوگی۔ غیر مہاجروں میں پٹھان، پنجابیوں، بلوچیوں، اور سندھیوں کے مابین اور مہاجروں میں اردو بولنے والوں اور گجراتی بولنے والوں کے مابین۔ اردو بولنے والوں میں یو۔پی۔ بہار، حیدرآباد دکن اور سی۔ پی والوں کے درمیان برپا ہوگی۔ یہ کشمکش ملازمتوں میں، کاروبار میں، درسگاہوں میں، بلدیاتی اداروں کی نمائندگی میں، صوبائی سکریٹریٹ کی ملازمتوں میں غرضیکہ ہر جگہ نمودار ہوگی۔ مستقبل میں رونما ہونے والی اس کشمکش کا سب سے منہ بولتا ثبوت یہ ہے کہ کراچی صوبے کا مطالبہ لے کر کھڑے ہونے والے عناصر ابھی سے گروہوں میں منقسم ہیں۔ مطالبہ ایک ہے مگر وہ ایک نہیں ہیں۔ وہ کم سے کم پانچ جداگانہ ناموں سے سرگرم عمل ہیں۔ یہ جدا جدا گروہ (۱) کراچی صوبہ پارٹی (۲) کراچی صوبہ تنظیم (۳) کراچی شہری محاذ (۴) کراچی صوبہ اتحاد اور (۵) کراچی صوبہ تحریک ہیں۔ ابھی کراچی صوبہ بنا نہیں ہے اور ابھی وہ مسئلے اور تنازعات نمودار نہیں ہوئے جو صوبہ بننے کے بعد نمودار ہوتے ہیں مگر ابھی سے مطلوبہ صوبے کے حامیان پانچ جدا جدا گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر مستقبل میں رونما ہونے والی باہمی کشمکش کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

۴۔ یہ شہر اپنی بنیادی ضروریات زندگی یعنی آب رسانی اور اجناس خورد کی بہم رسانی وغیرہ کے لئے صوبہ سندھ کے ساتھ ناگزیر طور پر مربوط ہے۔ اسے اگر سندھ سے محاذ آرائی کر کے علیحدہ کر لیا گیا تو اس شہر میں بسنے والے لاکھوں انسانوں کی ضروریات زندگی کس طرح پوری ہوا کریں گی؟ پانی، دودھ، پھل، ترکاریاں اور غلہ کہاں سے آیا کرے گا؟ کیا سندھ سے کاٹ دینے کے بعد بھی یہ سب چیزیں سندھ سے بدستور موصول ہوتی رہیں گی؟ کوئی شاخ کاٹ دیئے جانے کے بعد بھی اپنے درخت سے غذا حاصل کرتی رہتی ہے؟

۵۔ بدعنوانیاں (کرپشن) جو اس شہر کا اصل مسئلہ ہیں کراچی صوبہ بنانے سے ختم ہو جائیں گی؟ مثلاً رشوت ستانی جو سب سے بڑی سماجی لعنت ہے، اس شہر کو صوبہ بنانے سے ختم ہو جائے گی؟ اشیاء

Marfat.com

خوردنی میں ملاوٹ جو اسی شہر کے دوکاندار کرتے ہیں، نابود ہو جائے گی؟ چوربازاری جس کا ارتکاب کرنے والے اپنے ہی شہر کے باشندے ہیں، مٹ جائے گی؟ یا کیا اسمگلنگ ختم ہو جائے گی؟ یا اوورلوڈنگ کا خاتمہ ہو جائے گا؟ یا ٹرانسپورٹ کا مسئلہ حل ہو جائے گا؟ یا آب رسانی کی بہتات ہو جائے گی؟

یہ سب مسئلے جنہوں نے اس شہر کو مسائلستان بنا دیا ہے سندھ کے باشندوں نے آکر پیدا نہیں کر دیئے ہیں بلکہ کراچی میں بسنے والے افراد نے ہی پیدا کئے ہیں۔ رشوت لینے والے یا ملاوٹ کرنے والے یا چوربازاری اور ذخیرہ اندوزی کرنے والے یا کم تولنے والے یا اوورلوڈنگ کرنے والے اسی شہر کے باشندے ہیں۔ اگر کراچی کو صوبہ بنا دیا گیا تو اس اقدام سے یہ سب مسئلے کس طرح ختم ہو جائیں گے۔ کیا محض شہر کو صوبہ بنا دینے سے سماجی برائیاں دور ہو جایا کرتی ہیں؟

اس شہر میں بسنے والے ہر شہری کو جو کراچی صوبہ کے مطالبے کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہے ان نکات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہئے۔ سنجیدگی سے غور کرنا اس وجہ سے ضروری ہے کہ جذبات کی آڑ میں اور نعرہ بازی سے مسحور ہو کر اگر ہم نے کسی طرح کراچی کو صوبہ بنوا لیا تو ہم ایک ایسی بند گلی میں پہنچ جائیں گے جس سے باہر نکلنا کسی کے لئے ممکن نہ رہے گا۔ پھر تباہی و بربادی اس شہر میں بسنے والوں کا مقدر بن جائے گی اور سابقہ دور ہمارے لئے ایک سنہرا خواب بن کے رہ جائے گا جس کی تعبیر ہم کبھی دیکھ نہ سکیں گے۔

یہ ہیں وہ بڑے بڑے نقصانات جو کراچی کو صوبے کا درجہ دلانے سے جوابی طور پر رونما ہوں گے مگر مسئلے کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس مطالبے کے محرکین نے نہ صرف یہ کہ اس مطالبے کی تکمیل کی صورت میں رونما ہونے والے نقصانات کی پیش بینی کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے بلکہ انہوں نے اس مطالبے کو ایک نظریاتی بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ مہاجر بھی ایک جداگانہ قوم ہیں لہٰذا ان کا بھی ایک جداگانہ صوبہ ہونا چاہئے۔

چند سال قبل بالخصوص ۱۹۷۲ء کے لسانی فسادات کے بعد، جب مہاجروں کی جداگانہ قومیت کا نظریہ اوّل اوّل پیش کیا گیا تو بڑی معصومیت کے ساتھ کہا گیا کہ اگر سندھی، پنجابی، پٹھان اور بلوچی علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں تو مہاجر بھی ایک علیحدہ قوم ہیں۔ گویا مہاجروں کی جداگانہ قومیت کو ملک کے دیگر صوبوں

Marfat.com

کے باشندوں کی قومیتوں کے تکمیلِ ثبوت کے ساتھ مشروط رکھا گیا مگر اب صرف سات آٹھ سال کی مختصر سی مدت کے بعد انہوں نے سندھ، بلوچستان، پنجاب اور سرحد کے باشندوں کو خود اپنی طرف سے جدا جدا قومیتوں کی سندیں عطا کر دی ہیں۔ اس طرح لفظ "اگر" کی شرط انہوں نے خود اپنی طرف سے منسوخ کر دی ہے اور اب دعویٰ یہ ہے کہ جس طرح سندھی، بلوچی، پنجابی اور پٹھان علیٰحدہ علیٰحدہ قومیں ہیں اسی طرح سے مہاجر بھی ایک علیٰحدہ قوم ہیں اور چونکہ ان میں سے ہر قوم کا اپنا اپنا صوبہ ہے لہٰذا مہاجروں کا بھی ایک اپنا صوبہ ہونا چاہیئے۔ اسے کہتے ہیں دعوائے باطل علی الباطل۔ گویا اہلِ پنجاب وسندھ وغیرہ کا جدا جدا قومیں ہونا ثابت شدہ حقیقت ہے لہٰذا اس کی بنیاد پر مہاجروں کی قومیت بھی تسلیم کی جانی چاہیئے۔ دنیا مہاجرین کے ترکِ وطن کو برصغیر کی ملتِ واحدہ کے نظریئے کی حقانیت کا سب سے بڑا عملی ثبوت سمجھتی ہے کیونکہ اس ترکِ وطن نے ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کی نگاہ میں مسلم قومیت کا نظریہ، قومیت کے دیگر تمام نظریات پر تفوق اور برتری رکھتا ہے۔ اتنی زیادہ کہ مسلمان اس کے لئے اپنے مولد ومسکن کو بھی خیرباد کہہ دیتا ہے۔ اتنی بڑی ٹھوس اور ثابت شدہ حقیقت کے علی الرغم بعض افراد بزعمِ خود یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ اسے دوسروں سے بھی منوالیں گے۔ انہوں نے کبھی اس نکتے پر غور کرنے کی کوشش نہیں کی کہ قومیت کے کسی بھی نظریئے کی رو سے مہاجر ایک قوم نہیں ہیں کیونکہ ان کے مابین ان میں سے ایک قدر بھی مشترک نہیں ہے جو قومیت کی بنیاد ہوتی ہے۔ نہ اشتراکِ نسل، نہ اشتراکِ زبان، نہ اشتراکِ تہذیب اور نہ اشتراکِ وطن۔ قومیت کی اس تعریف کے بموجب، جس کے مطابق اہلِ پنجاب وسندھ وسرحد وبلوچستان کو علیٰحدہ علیٰحدہ قومیں مانا جا رہا ہے، مہاجر بھی درجنوں اقوام میں منقسم ہیں کیونکہ وہ ہندوستان کے درجنوں صوبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے مابین نہ نسل مشترک ہے، نہ زبان، نہ تہذیب اور نہ مولد ومسکن۔ صرف ترکِ وطن کا عمل یا مہاجر کا لفظ مشترک ہے۔ مگر قومیت کے کسی بھی نظریئے کی رو سے ترکِ وطن قومیت کی بنیاد نہیں ہے۔ خود مہاجروں نے اپنے آپ کو کبھی ایک نہیں سمجھا۔ مہاجر قومیت کا نام ونشان ان کے فکر وعمل میں کہیں دکھائی نہیں دیتا بلکہ جن لوگوں کے ذہنوں پر آج بھی سابقہ وطنی قومیت کا تصور حاوی ہے۔ وہ دفتروں میں، کاروبار میں، محلّوں میں اور بستیوں میں، دوسرے صوبوں کے مہاجروں کے ساتھ سرد جنگ میں مصروفِ عمل رہتے ہیں اور ایک علاقے کے مہاجر دوسرے علاقے کے مہاجروں کو تحقیر واستہزا کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ شہر کے کلیدی عہدوں پر کسی ایک صوبے کے مہاجر کا فائز ہونا دوسرے علاقے کے مہاجروں کو

Marfat.com

زہر آلود نظر آتا ہے۔ دریں حالات اس شہر کے باشندوں کے سیاسی اختیارات میں اضافہ اس سرد جنگ کو بڑھا دے گا یا کم کرے گا؟ وزیر اعلیٰ کے تقرریں، وزارتوں کی تقسیم میں، ڈپٹی کمشنروں کے تقرریں، ہائی کورٹ کی تشکیل میں ہر جگہ مہاجر آپس میں برسر پیکار رہوں گے۔ پھر انہیں کون روکے گا اور کس طرح؟

بہر کیف! اگر تھوڑی دیر کے لئے اس دعوے کو مان لیا جائے کہ مہاجر ایک علیحدہ قوم ہیں لہٰذا کراچی کو ایک علیحدہ صوبہ ہونا چاہیئے تو کیا محض ایک آئینی حکم کے ذریعے اس شہر کو صوبے کا درجہ دے دینے سے اس شہر کے مسائل حل ہو جائیں گے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ کیا محض آئینی اقدامات سے ہر قسم کے مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے؟

کراچی کے مسائل کا اگر گہرا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ اس شہر کے مسائل ملک کے باقیماندہ علاقوں کے مقابلے میں کچھ انوکھے قسم کے نہیں ہیں۔ اس شہر کے مسئلے وہی ہیں جو پاکستان کے دوسرے شہروں کے ہیں۔ رشوت ستانی، چور بازاری، ملاوٹ، اسمگلنگ، مہنگائی: ناپ تول میں کمی، رہائش کی دشواریاں، مکانوں کے کرایہ میں روز افزوں اضافہ، تعمیراتی سامانوں کی کمیابی، سڑکوں یا گلیوں کی خستہ حالی، سرکاری اسپتالوں کی کمی، ارتکاب جرائم کے رجحان میں اضافہ اس شہر کے بڑے بڑے مسائل سمجھے جاتے ہیں۔ ملک کے دوسرے شہروں کے مسائل کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب مسئلے وہاں بھی یکساں طور پر حل طلب حالت میں موجود ہیں۔ اگر اہل کراچی کے لئے ان مسائل کا حل اسے علیحدہ صوبہ بنا دینے پر منحصر ہے تو حیدرآباد، سکھر، ملتان، لاہور، پنڈی، پشاور اور دوسرے شہروں میں ان مسائل کا حل کیا ہے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ محولہ بالا مسائل کا حل کسی شہر کو صوبے کا درجہ دینے میں مضمر نہیں ہے۔ پھر کون سے اور مسائل ہیں جنہیں حل کرنے کے لئے اسے صوبہ بنانے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے؟ محولہ بالا مسائل کے بعد ٹرانسپورٹ، آب رسانی اور بے روزگاری کے مسئلے رہ جاتے ہیں۔ یہ مسئلے بھی دوسرے شہروں میں موجود ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ یہ مسئلے جتنی سنگینی کے ساتھ کراچی میں موجود ہیں اتنی سنگینی کے ساتھ کہیں اور نہیں ہیں اس لئے ان مسئلوں کو صرف کراچی کے مسئلے کہا جا سکتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ اگر اس شہر کو صوبے کا درجہ دیا گیا تو صوبائی انتظامیہ کے پاس کون سا جادو کا ڈنڈا ہاتھ آ جائے گا جو اس شہر کے تمام مسئلوں کو یکلخت حل کر دے

Marfat.com

گا۔ مثلاً بے روزگاروں کو روزگار فراہم کردے گا؟ سرکاری دفاتر میں تو افرادکار کی بہت معمولی سی تعداد کی کھپت کی گنجائش نکلتی ہے۔ افرادکار کی زیادہ تر کھپت نجی اداروں میں ہوتی ہے۔ بینکوں میں، کارخانوں میں، تجارتی اداروں میں، درسگاہوں میں، ان اداروں میں گزشتہ چند برسوں سے جو ٹھہراؤ اور جمود ہے کیا وہ ٹوٹنے اور تحلیل ہونے کے لئے کراچی صوبہ کی تشکیل کا منتظر ہے؟

یا کراچی صوبہ آب رسانی کے لئے کوئی نہر نکال لائے گا؟ یا بسوں اور گاڑیوں کی ریل پیل پیدا کردے گا؟ جس شہر میں ہر سال کم سے کم لاکھ ڈیڑھ لاکھ افراد دیہاتوں سے آکر آباد ہوجاتے ہوں وہاں ٹرانسپورٹ کا مسئلہ کون سی انتظامیہ حل کرسکتی ہے؟ یا جو شہر ریگستان پر واقع ہو وہاں آب رسانی کی کبھی بہتات ہوسکتی ہے؟ یہ مسئلہ تو عرب ممالک اپنے روپے کی بہتات کے باوجود حل نہ کرسکے۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ اندازہ کرنا مشکل امر نہیں کہ کراچی کے مسائل کا حل اسے علیحدہ صوبہ بنادینے میں مضمر نہیں ہے۔ بالفرض ایسا ہو بھی، تو اسے علیحدہ صوبہ بنا دینے سے بے شمار جوابی مسئلے پیدا ہوجائیں گے جنہیں حل کرنا کسی کے بس میں نہ ہوگا۔ لہٰذا وہ لوگ جو اسے صوبہ بنانے کے لئے سرگرم کار ہیں وہ اگر باشندگان کراچی کے واقعتاً بہی خواہ ہیں اور اس شہر کے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے وسائل ایک ایسے مطالبے کے پیچھے جس کی تکمیل یقینی نہیں، صرف کرنے کے بجائے، شہری مسائل حل کرنے پر صرف کریں۔ مثلاً رشوت ستانی کے خلاف ایک موثر عوامی مہم چلائی جائے۔ رشوت لینے والے اور دینے والے دونوں اسی شہر کے باشندے ہیں۔ ان کے خلاف عوامی مہم چلا کر اس شہر کو اس مصیبت سے نجات دلائی جائے۔ اسی طرح قیمتوں میں استحکام پیدا کرنے کے لئے، ذخیرہ اندوزی کا خاتمہ کرنے کے لئے، انسداد اسمگلنگ اور دیگر سماجی برائیوں کے لئے تحریکیں چلائی جائیں۔ مخیر حضرات کی مدد سے رفاہی اسپتال قائم کئے جائیں، عوامی عطیات سے نجی درسگاہیں قائم کی جائیں، بے روزگاروں کو اندرون ملک یا بیرون ملک روزگار دلانے کے لئے ادارے قائم کئے جائیں۔ ان سب کاموں کے لئے اگر مخلصانہ کوشش کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ مسائل معقول حد تک حل نہ ہوجائیں۔ اب رہا روزگار کا مسئلہ تو وہ خاطر خواہ حد تک اس وقت تک حل نہ ہوسکے گا جب تک ملک کا معاشی جمود نہ ٹوٹے جس نے ملک کے پیداواری ذرائع یعنی کارخانوں، تجارتی اداروں اور ترقیاتی کاموں کا پہیہ جام کر رکھا ہے اور اس جمود کی وجہ کراچی کی سندھ کے ساتھ وابستگی نہیں بلکہ مجموعی سیاسی عوامل ہیں۔

بڑی طاقتیں

بڑی طاقتیں اب باقیماندہ پاکستان کے وجود کے بھی درپے ہیں اور ان کی کوشش ہے کہ یہ خطہ کسی نہ کسی طرح مکمل طور پر ان کے کنٹرول میں آجائے۔ اس مقصد کے لئے یہ طاقتیں اپنی اپنی حکمت عملیوں کے بموجب سرگرم عمل ہیں۔ اسلحہ کی اسمگلنگ یا یہاں کے سیاسی لیڈروں سے بڑی طاقتوں کے سفارت کاروں کی خفیہ ملاقاتوں یا صوبہ پرستی کی حوصلہ افزائی یا پاکستان کی حکومت کے خلاف بین الاقوامی پروپیگنڈا کی جو خبریں آپ سنتے رہتے ہیں وہ اتفاقی حوادث نہیں بلکہ ان ہی کی ریشہ دوانیوں کی کڑیاں ہیں جو گاہے گاہے منظر عام پر نمودار ہوجاتی ہیں۔

پاکستان کے خطوں کو اپنے کنٹرول میں لینے کے لئے بڑی طاقتوں کی سرگرمیاں بحیرہ ہند میں اپنا فوجی غلبہ حاصل کرنے کے لئے ان کی مذموم کوششوں کا شاخسانہ ہیں گویا اسلامی نظام کے قیام کے مشن کو بڑی طاقتوں کی ان گھناؤنی کوششوں کی طرف سے بھی سخت خطرہ لاحق ہے کیونکہ اگر یہ ملک ختم ہوگیا تو ہم اسلامی نظام کہاں جاکر قائم کریں گے؟ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت حال کو بھی مختصراً بیان کر دیا جائے۔

پاکستان کا سینکڑوں میل طویل ساحل جس پر کراچی، گوادر، پسنی اور سونمیانی کی بندرگاہیں بھی ہیں، بحیرۂ ہند کے کنارے واقع ہے۔ اس بنا پر روس کی گزشتہ چالیس پنیتالیس سال سے کوشش ہے کہ یہ علاقہ اس کے زیر اثر آجائے تاکہ وہ اس کے ذریعے بحیرہ ہند تک رسائی حاصل کرسکے۔ اس سمندر میں رسائی حاصل کرنا کسی تجارتی مقصد کی خاطر نہیں بلکہ جنگی مقصد کے تحت ہے۔ تیل کے ذخائر سے لبریز ہونے کی وجہ سے پورا مشرق وسطیٰ بڑی طاقتوں کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ ہر بڑی طاقت بالخصوص روس اور امریکہ کی کوشش ہے کہ مشرق وسطیٰ اس کے جنگی محاصرے میں گھرا رہے تاکہ وہ اگر تیل کے ذخائر پر قبضہ نہ کرسکیں تو کم سے کم اسے تیل ہر صورت میں حاصل ہوتا رہے۔ جنگی حصار قائم کرنے کیلئے یہ دونوں ممالک مشرق وسطیٰ کے اطراف کے ممالک میں اپنے فوجی اڈے قائم کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ امریکہ نے ڈیگو گارشیا میں بحری اڈہ قائم کرلیا ہے۔ اور حال تک ایران کی سرزمین بھی اس کے کنٹرول میں رہی ہے۔ روس نے بھی گزشتہ برسوں میں مختلف طریقوں سے عراق کی بندرگاہ بصرہ، جنوبی یمن کی بندرگاہ عدن اور

Marfat.com

ساحلِ حبشہ کو اپنے فوجی مقاصد کی خاطر استعمال کرنے کی سہولت حاصل کر لی ہے۔ مگر وہ اتنے پر بھی قانع نہیں ہے۔ بلکہ چاہتا ہے کہ تیل پیدا کرنے والے ممالک پر اتنا زبردست فوجی غلبہ حاصل کرلے کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف تیل کی ایک بوند بھی کسی کو نہ دے سکیں اور دیگر معاملات میں بھی اس کی مرضی کے تابع مہمل بن جائیں۔ اسی مقصد کے تحت اس نے جنوبی یمن اور حبشہ پر اپنا اثر و اقتدار قائم کیا ہے اور اسی مقصد کے تحت وہ اریٹریا کے مسلمان مجاہدین آزادی کو کچلنے کے لئے حبشہ کی بھرپور مدد کر رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ عدن کی بندرگاہ اور ساحلِ حبشہ پر اس کا اس قدر موثر کنٹرول ہو جائے کہ وہ جب چاہے باب المندب (BAB-EL-MANDEB) یعنی اس آبی گزرگاہ کو جو ان دونوں ساحلوں کے درمیان سے گزرتی ہے جہازوں کی آمد و رفت کے لئے بند کر دیا جائے۔ (منسلکہ نقشہ ملاحظہ فرمایئے) باب المندب واحد آبی گزرگاہ ہے جس کے ذریعے ایشیاء کا مغربی ممالک سے بحری تجارتی رابطہ قائم ہے۔ یہ رابطہ اگر مسدود کر دیا جائے تو ایشیا اور مغربی ممالک کے مابین، افریقہ کے جنوب سے گزرنے والی آبی گزرگاہ اتنی مہنگی ثابت ہو گی کہ ان دونوں جغرافیائی خطوں کے مابین تجارتی رابطہ قائم نہ رہ سکے گا۔ یہ گزرگاہ عام ایشیائی ممالک کے مقابلے میں عرب ممالک بالخصوص سعودی عرب کی تجارت کے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے جو اگر منقطع کر دی جائے تو عرب ممالک اور سعودی عرب مرغ لبسمل بن جائیں گے۔ اس گزرگاہ کو کنٹرول میں لینے کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ پورا ایشیا تجارتی تعلقات کے لئے کلیتہً روس کا دست نگر رہے۔ بدقسمتی سے روس نے عدن اور ساحل حبشہ پر قابلِ لحاظ حد تک کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔

بحیرۂ ہند میں پائی جانے والی دوسری آبی گزرگاہ جو ان دونوں بڑی طاقتوں کا ہدف بنی ہوئی ہے وہ آبنائے ہرمز ہے۔ یہ صرف اٹھارہ میل چوڑی آبنائے ہے جو عراق کی بندرگاہ بصرہ سے شروع ہوتی ہے اور بحیرۂ ہند تک پہنچتی ہے اور واحد گزرگاہ ہے جو (عراق کے علاوہ) ایران کو دنیا کے دوسرے ملکوں سے بحری راستے سے منسلک کرتی ہے۔ ایران کا تمام تر تیل اسی راستے سے باہر جاتا اور تمام تر درآمدی سامان اسی راستے سے درآمد ہوتا ہے۔ لہٰذا جب سے ایران کی امریکہ سے مخاصمت پیدا ہوئی ہے اس کی کوشش ہے کہ یہ آبنائے اس کے کنٹرول میں آجائے یا کم سے کم اس کے راکٹوں کی زد میں رہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے اس کے ساحل پر واقع ملک اومان سے فوجی رعائتیں حاصل

Marfat.com

کی ہیں۔ اومان نے روس کے خلاف تحفظ حاصل کرنے کی غرض سے امریکہ کے دامن عافیت میں پناہ لینے کی خاطر مجبوراً اسے یہ مراعات دے دی ہیں۔

دوسری طرف روس کی بھی کوشش ہے کہ اس آبنائے پر اس کا کنٹرول رہے۔ افغانستان پر تسلط حاصل کرنے کے لئے اس کی شب و روز کی جدوجہد کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس کی سرحدیں افغانستان کی آخری جنوبی حدود تک وسیع ہو جائیں جہاں سے آبنائے ہرمز اس قدر قریب ہے کہ روس اسے اپنے راکٹوں کی زد پر رکھ سکتا ہے۔

روس کی مزید کوشش یہ ہے کہ بلوچستان کا ساحل بھی اس کے تصرف میں آجائے۔ اس سلسلے میں اس کی کوششیں عرصے سے جاری ہیں۔ نیشنل عوامی پارٹی سے اس کا ربط وضبط اسی مقصد کے تحت رہا ہے اور جیسا کہ خود بلوچستان کے متعدد لیڈر جن میں نواب اکبر بگٹی، جناب نبی بخش زہری، سردار دودا خان اور میر عبدالباقی بلوچ بھی شامل ہیں،

(ملاحظہ ہو لیل و نہار۔ ۳۱ جنوری ۱۹۷۳ء)

اس خبر کا انکشاف کرتے آرہے ہیں کہ روس عرصے سے وہاں اسلحہ اسمگل کرا رہا ہے۔ بلوچستان کے بارے میں یہ صورت حال ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جسے پاکستان کے بالخصوص بلوچ لیڈر خوب اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں اور اس اندیشے پر وقتاً فوقتاً سخت سراسیمگی اور وحشت کا اظہار کرتے چلے آرہے ہیں۔ خاص طور پر بلوچستان کے دلوں میں مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد سے بجا طور پر یہ خوف پیدا ہوا ہے کہ اگر باقیماندہ پاکستان بھی ٹوٹ گیا تو بلوچستان روس کے تسلط میں جانے سے نہ بچ سکے گا۔ لہٰذا ان کے صوبے کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ پاکستان کو باقی رکھیں۔ نواب اکبر بگٹی، سردار عطاء اللہ مینگل، نواب خیر بخش مری، جناب نبی بخش زہری، میر عبدالباقی بلوچ اور دیگر اکابرین مختلف وقتوں میں اس اندیشے پر اپنی وحشت کا اظہار کر چکے ہیں۔

سردار عطاء اللہ مینگل ہفت روزہ لیل و نہار کے نمائندہ خصوصی جناب مختار حسن سے ایک انٹرویو میں (ملاحظہ ہو لیل و نہار ۱۱ فروری ۱۹۷۳ء) اس صورت حال پر اظہار کرتے ہوئے بڑی دردمندی سے فرماتے ہیں کہ:

"...... پاکستان کے اندرونی حالات نے ایک عالمی طاقت (روس) کا صدیوں پرانا خواب"

Marfat.com

گرم سمندروں (بحیرہ عرب) تک پہنچنے کا خواب ـ پورا ہونے کا امکان پیدا کر دیا ہے۔ دوسری عالمی طاقت (امریکہ) یہ خواب آسانی سے پورا ہونے نہ دے گی۔ گرم سمندروں تک پہنچنے کی آرزومند یہ عالمی طاقت (روس) پاکستان کے اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے براہ راست اپنی فوجیں بھی اتار سکتی ہے جس کا جواب دوسری عالمی طاقت اسی نوعیت کے اقدام سے دے گی تو ہمارا صوبہ میدان کارزار بن جائے گا۔ یہ ساری لڑائی جو گرم سمندروں کی خاطر لڑی جائے گی، بلوچستان کو بالکل تباہ کر ڈالے گی.....؟

بلوچستان کے دوسرے بڑے لیڈر نواب خیر بخش مری، جناب مختار حسن سے لیل ونہار (۳، جون ۱۹۷۳ء) میں فرماتے ہیں۔

"آج بلوچوں کو اچھی شرائط پیش کی جا رہی ہیں جن میں عظیم تر بلوچستان قائم کرانے کا وعدہ بھی ہے لیکن پاکستان کا ٹوٹنا جتنا پاکستان کے لئے نقصان دہ ہوگا اتنا ہی نقصان دہ بلوچوں کے لئے ہوگا۔ پاکستان بلوچوں کا نیوکلس NUCLEUS ہے۔ یہاں حقوق کے لئے لڑمرنا بہتر ہے۔ لیکن اسے توڑ دینا بلوچوں کے مفاد میں نہیں..... اب دیکھنا یہ ہے کہ بلوچوں کو سب سے اچھی شرائط کہاں سے مل رہی ہیں۔ وہ افغانستان یا ایران نہیں بلکہ پاکستان ہی ہے جہاں بلوچوں کو اچھی شرائط حاصل ہیں جہاں ہمارا اپنا صوبہ اور صوبائی حکومت ہے...... ہم اپنے پاکستانی بھائیوں سے صاف صاف کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم اسی پاکستان میں رہیں گے۔ ہرگز ہرگز نہیں علیحدہ ہوں گے نہ باہر سے کسی کی مدد مانگیں گے........"

اسی قسم کا اظہار بلوچستان کے دوسرے متعدد لیڈروں نے بھی کیا ہے۔ نواب اکبر بگتی نے لیل ونہار ۱۱، فروری ۱۹۷۳ء میں، جناب مختار حسن سے ایک خصوصی انٹرویو میں اس مسئلے کے ہمہ جہت پہلوؤں پر اس قدر کھل کر اظہار خیال کیا کہ بعض سربستہ اور مخفی باتیں بھی منظر عام پر آگئیں۔ انہوں نے اس انٹرویو میں فرمایا کہ بلوچستان کے مستقبل کے بارے میں بلوچ لیڈروں کے سامنے دو متبادل راستے تھے۔ ایک یہ کہ بلوچ عراق اور ایران کے بلوچوں کے ساتھ مل کر عظیم تر بلوچستان قائم کریں مگر مشکل یہ تھی کہ اس کام کے لئے یعنی عراق کے بلوچوں کے خطے کو عراق سے، ایران کے بلوچ خطے کو ایران سے اور بلوچستان کو پاکستان سے کاٹنے کے لئے بلوچوں کو ان تین ممالک سے مسلح جنگ لڑنی پڑتی جس میں

Marfat.com

کامیابی کسی بڑی طاقت کی امداد کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کام کے سلسلے میں یہ اندیشہ سامنے آیا کہ اگر کوئی بڑی طاقت اتنا حوصلہ دکھانے پر آمادہ ہو جائے کہ وہ بیک وقت ان تینوں ممالک کے خلاف جارحانہ اقدام کر کے ان کی مملکتوں سے بلوچ خطوں کو علیحدہ کر دے تو پھر اس آزاد کردہ خطے پر خود قابض کیوں نہ ہو جائے گی، بلوچوں کے حوالے کیوں کر دے گی؟ اس اندیشے کی بنا پر عظیم تر بلوچستان کا منصوبہ ترک کر دیا گیا۔ اس کے بعد پٹھان لیڈروں کے ساتھ مل کر افغانستان، صوبہ سرحد اور بلوچستان کا ایک نیم وفاق (کنفیڈریشن) قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ مگر آگے چل کر اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر اس منصوبے میں کامیابی حاصل کر لی گئی تو اس نیم وفاق میں پٹھانوں کو بلوچوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا کیونکہ افغانستان میں بھی پٹھانوں کی اکثریت ہے اور صوبہ سرحد میں بھی۔ بلوچستان میں بھی تقریباً ایک تہائی پٹھان آباد ہیں۔ اس لئے یہ منصوبہ بھی ترک کر دیا گیا۔ اس لئے اب ہم بلوچستان کی بھلائی پاکستان کے ساتھ وابستہ رہنے میں ہی مضمر سمجھتے ہیں کیونکہ پاکستان دنیا میں واحد ملک ہے جہاں بلوچوں کا خود اپنا ایک صوبہ ہے۔

بلوچستان کے یہ اکابر بلوچستان کے بارے میں جو کچھ فرما رہے ہیں ایک غیر جانبدار مبصر کی نگاہ میں لفظ بہ لفظ صحیح ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بلوچوں کی بھلائی کسی اور امکانی صورت کے بجائے صرف پاکستان سے وابستہ رہنے کی صورت میں ہے۔ مگر سال ۸۰-۱۹۷۹ء نے بلوچستان کے لئے ایک نئی مصیبت کا اضافہ کر دیا ہے۔ اب امریکہ نے بھی اسے اتنی ہی بڑی فوجی اور سیاسی ضرورت سمجھ لیا ہے جتنی روس نے۔ ایران کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد سے اب امریکہ کو اس کے قرب و جوار میں ایک ایسے ملک کی حاجت محسوس ہو رہی ہے جو ایران کا متبادل ثابت ہو سکے۔ جس کی بندرگاہوں کو وہ بحیرۂ عرب کی پہرے داری کے لئے استعمال کر سکے اور جسے وہ اپنا اسلحہ خانہ بنا سکے۔ اس مقصد کے لئے اس نے بلوچستان (اور سندھ) کا انتخاب کیا ہے۔ اس امر کے شواہد برابر ملتے جا رہے ہیں کہ وہ بلوچستان کے مقامی لیڈروں سے اپنا ارتباط بڑھا رہا ہے۔ انہیں اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ پاکستان سے علیحدہ ہو جائیں۔ پچھلے دنوں نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی میں جو شگاف پیدا ہوا اور جس کے نتیجے میں اس جماعت کے بہت سے لیڈروں نے اس سے علیحدہ ہو کر ایک نئی جماعت بنا لی اس واقعے کے بارے میں باخبر سیاسی حلقوں نے اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ علیحدہ ہونے والے بیشتر لیڈر بلوچ ہیں۔ ان کی علیحدگی کی یہ توجیہہ کی جا رہی ہے کہ یہ علیحدگی

امریکی لابی کی شہ پر عمل میں آئی ہے۔ کیونکہ بلوچ لیڈروں کو امریکہ کی جانب سے کچھ پرکشش شرائط پیش کی جارہی ہیں اور یہ سارا کام امریکہ میں مقیم ایک مالدار مسلمان تاجر کے توسط سے روبہ عمل آرہا ہے۔ اگر گزشتہ چند مہینوں سے پاکستان کے ساتھ امریکہ کی سرد مہری اور بے توجہی کے پس منظر میں جو سنٹو CENTO سے پاکستان کی علیحدگی کے بعد بھی برقرار ہے، آپ مذکورہ توجیہہ پر غور کریں تو یہ خبر عین تو ین صحت نظر آئے گی اور قرائن سے صاف نظر آتا ہے کہ امریکہ کی حکمت عملی اب یہ ہے کہ باقیماندہ پاکستان کو توڑ دیا جائے تاکہ وہ بلوچستان اور سندھ کو اپنے زیر اثر لاسکے۔

گزشتہ صفحات میں اس اندیشے کا تذکرہ کیا جاچکا ہے کہ یہ ملک اگر ٹوٹا تو ہندوستان بھی اس کا دعویدار بن کے کھڑا ہو جائے گا۔ یعنی بلوچستان کا صوبہ بیک وقت تین بڑی طاقتوں روس، امریکہ اور ہندوستان کا ہدف بنے گا۔ جسے حاصل کرنے کے لئے تینوں قوتیں ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہوں گی۔ گویا دنیا کے واحد بلوچ صوبے کو آج اس کے تاریک ترین مستقبل کے آگے لاکھڑا کیا گیا ہے۔ صوبہ پرستی کی تحریک جیوں جیوں اس صوبے کو پاکستان کی وحدت کے تصور سے دور لے جارہی ہے یہ صوبہ اپنے تاریک مستقبل سے اسی قدر نزدیک پہنچتا جارہا ہے۔

حالات کے اس پس منظر میں آپ غور فرمائیں کہ بلوچستان کے صوبہ پرست عناصر اسے اسکی سلامتی کے راستے پر لے جارہے ہیں یا تباہی کے راستے پر؟ اور یہ کہ بلوچستان کی سلامتی پاکستان سے وابستہ رہنے میں ہے یا اس ملک سے علیحدہ ہو جانے میں؟ اگر وابستہ رہنے میں ہے تو اس مقصد کے لئے اسے پاکستان کی نظریاتی وحدت سے منسلک رہنا چاہیے یا صوبہ پرستی اور علاقائی قومیت کا حامل بن جانا چاہیئے؟

Marfat.com

باب سوم

مذہبی رہنماؤں کا کردار

اسلامی نظام کے قیام کے تناظر میں جب ہم اپنے مذہبی رہنماؤں اور علماء کرام کے کردار کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ بات بڑی قابل قدر نظر آتی ہے کہ حالات کی ہر قسم کی دشوار گزاریوں میں ہمارے مذہبی رہنماؤں نے دین کو زندہ رکھا۔ برصغیر میں مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں کے مقابلے میں بڑی فرومایہ تھی۔ یہ خطہ نظام خلافت کی برکات سے بھی ہمیشہ محروم رہا۔ مسلمان فرمانرواؤں نے بھی اسلام کے فروغ اور استحکام کے لئے کوئی قابلِ ذکر جدوجہد نہ کی۔ ان سب نامساعدات کے باوجود یہاں کے علماء کرام نے دین کو زندہ و تابندہ رکھا۔ شدھی کی تحریک اور عیسائیت کی تبلیغ کا مقابلہ کیا، مغربی تہذیب کی مزاحمت کی، تجدد کے فتنے کی سرکوبی کی، انکار حدیث کی رد کی، تہذیب و تمدن کے راستے سے مسلمانوں میں ہندویت کے نفوذ کی مزاحمت کی اور اپنے خطبوں، وعظوں، تقریروں اور تحریروں کو دینی تعلیمات کے لئے وقف کیا۔ اس مقصد کی خاطر مذہبی مدرسے قائم کئے، مذہبی انجمنیں تشکیل دیں، مسجدیں قائم کیں، خانقاہیں بنائیں اور مسلمانوں کو اپنے حلقۂ ارادت میں باندھا۔ انہوں نے اس نوع کی کوششیں نہ کی ہوتیں تو مسلمانوں کے دورِ حکومت میں دین اسلام برصغیر میں اجنبی شے بن چکا ہوتا یا کم سے کم اتنا مسخ ہو چکا ہوتا کہ حق کو ناحق سے جدا کرنا مشکل ہو جاتا۔ انگریزوں کا دور حکومت آنے تک مسلمان برصغیر کا قصۂ ماضی بن چکے ہوتے۔

آج بھی دین کی تعلیم حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہمارے مذہبی رہنما ہیں۔ اور اسلام انہی کے دم سے زندہ ہے مگر کفر اور ضلالت کے مقابلے میں اسلام کے قیام و ثبات کے لئے ان کی کوششیں جہاں ایک ٹھوس اور ناقابل انکار حقیقت ہیں وہاں دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے "اندرونی معاملات" میں ان کا رویہ بڑی غیر اعتدال پسندی اور کم نگاہی پر مبنی ہے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام اور مذہبی رہنما جزو کو کل پر اور فروعات کو اساسیات پر فوقیت دیتے ہیں۔ فروعات سے مراد وہ فقہی اختلافات ہیں جو دینی فرائض اور واجبات کی ادائیگی کے معاملے میں مسلمانوں کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ مثلاً نماز کی ادائیگی میں، روزے میں، مناسک حج میں،

مصارف زکوٰۃ میں، طہارت وغسل کے مسائل میں، نکاح وطلاق میں، وصیت، عدت اور رضاعت کے امور میں، تقسیم وراثت میں، عائلی امور میں

مذہبی امور میں خواہ وہ کسی بھی مذہب سے متعلق ہوں، جزوی اختلافات کا رونما ہونا ایک قدرتی اور ناگزیر امر ہے جس سے کوئی مذہب خالی نہیں۔ (اس موضوع پر تفصیلی بحث گزشتہ صفحات میں بعنوان "فقہی اختلافات کی حدود" کی جا چکی ہے) یہ اختلافات مسلمانوں میں ازل سے موجود چلے آرہے ہیں اور آئندہ بھی کوئی انہیں ختم نہ کرسکے گا۔ مگر یہ جزوی اختلافات فرائض وواجبات کی ادائیگی میں حارج نہیں ہوتے۔ مثلاً نماز کے بارے میں تمام مکاتب فکر کے علماء کرام کے مابین اس امر پر اتفاق رائے ہے کہ اس کے فرض ارکان کیا کیا ہیں۔ فرض ارکان کو خواہ کسی بھی فقہی طریقے پر ادا کیا جائے، نماز کی فرضیت ادا ہو جاتی ہے مگر اس حقیقت کو جاننے اور ماننے کے باوجود یہ حضرات نماز کے جزوی احکام یعنی رفع یدین اور آمین بالجہر وغیرہ جیسے امور میں اپنے مسلک کی حقانیت ثابت کرنے پر اس قدر قوت بیان صرف کرتے ہیں اور مخالف مسلک کے حامل علماء اور عوام کی اس قدر تحقیر وتذلیل کرتے ہیں کہ جیسے کسی اور مسلک کے بموجب نماز ادا ہی نہیں کی جاسکتی۔ اس فروع پروری کا سادہ لوح مسلمانوں پر یہ اثر مرتب ہوا ہے کہ ایک مسلک کے مسلمان دوسرے مسلک کے امام کے پیچھے نماز پڑھنے سے گریز کرتے اور علیحدہ جماعت بناتے ہیں۔ برصغیر میں یہ اختلافات گزشتہ صدیوں میں بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ چکے ہیں کہ محض مسلک کے اختلاف کی بنا پر مسلمانوں نے جدا جدا مسجدیں بنانی شروع کر دی ہیں[1] ان کی نگاہ کبھی اس حقیقت کی طرف نہیں جاتی کہ مسلمانوں کا، بلا تفریق مسلک، ایک مسجد میں یا ایک امام کے پیچھے نماز ادا کرنا ملی وحدت اور یگانگت کے نقطۂ نظر سے، اس سے زیادہ ضروری اور فائدہ مند ہے جتنا اپنے فقہی مسلک کی پیروی کی خاطر اپنے مسلک کی مسجد یا اپنے مسلک کے امام کی طرف جانا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بلاتفریق مسلک ایک مسجد میں، یا ایک امام کی اقتدا میں نماز پڑھنے سے ملی وحدت اور یگانگت قائم رہتی ہے اور نماز کی ادائیگی میں

---

[1] اس نوع کی کم نگاہی اور کوتاہ نظری کا بدترین مظاہرہ ستمبر ۱۹۷۹ء میں کراچی میں اس وقت دیکھنے میں آیا جب امام حرم جناب شیخ عبداللہ ابن سبیل کو جو ایک مدرسے کی زیر تعمیر عمارت کا معائنہ کرنے کے لئے گلشن اقبال تشریف لے گئے تھے، مدرسہ سے ملحق مسجد میں نماز مغرب کی امامت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی کیونکہ امام حرم کا فقہی مسلک مسجد مذکور کے منتظمین کے فقہی مسلک سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ ناچار امام موصوف کو مدرسے کی ناہموار زمین پر امامت فرمانی پڑی۔

Marfat.com

کوئی نقص واقع نہیں ہوتا جبکہ دوسری صورت میں اپنے مسلک کی پیروی تو ہو جاتی ہے مگر وحدتِ ملی تقسیم ہو جاتی ہے اور خود مسلمانوں کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف تنفر پیدا ہوتا ہے۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کو گمراہ سمجھتا ہے مگر اتنی کھلی ہوئی اور بین حقیقت ہمارے مذہبی رہنماؤں کی سمجھ میں نہیں آتی اور وہ محض اپنے فقہی مسلک کے تحفظ کی خاطر اپنی نمازوں اور اپنی مساجد کو دوسرے مسلمانوں سے علیحدہ کئے رکھنے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ کم نگاہی کا یہی حال دیگر ارکان دین کی ادائیگی میں بھی جاری و ساری نظر آتا ہے حالانکہ دنیا کا ہر مسلمان روزے، حج اور زکوٰۃ کی فرضیت پر ایمان رکھتا ہے، غسل و طہارت کے وجوب کا قائل ہے۔ ازدواجی زندگی اختیار کرنے کے لئے نکاح کرنے اور اسے ختم کرنے کے لئے طلاق یا خلع کا طریقہ اختیار کرنے کا قائل ہے۔ تقسیم وراثت، عدت، رضاعت اور وصیت کی فرضیت یا وجوب پر ایمان رکھتا ہے۔ یہی سب طریقے غیر مسلم اقوام کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کو ممیز کرنے والے ہیں۔ مسلمان ان ارکان کی ادائیگی میں قرآن مجید کے بیان کردہ طریقۂ کار کی پیروی کرتا ہے۔ اور تفصیلات کے لئے رسول کریم کی تعلیمات کو ہی حجت تسلیم کرتا ہے۔ آپس میں اختلاف جتنا کچھ بھی ہے وہ محض جزئیات اور فروعات میں ہے۔ یہ سب اختلافات بھی اسلام کے دائرے کے اندر ہیں۔ ان میں سے کسی بھی طریقے پر مذکورہ بالا ارکان کی بجا آوری کی جا سکتی ہے۔ ان میں سے کوئی طریقہ یا مسلک ایسا نہیں ہے جسے اختیار کرنے سے انسان دائرہ اسلام سے خارج تصور کیا جائے۔ مگر ہمارے مذہبی رہنما ان فروعات اور جزئیات کو اتنی اہمیت دینے لگے ہیں کہ اسے باقی رکھنے کے لئے وہ اس سے زیادہ محنت اور توجہ صرف کرتے ہیں جتنی دین کی تبلیغ اور کفر و ضلالت کا مقابلہ کرنے کے لئے بلکہ ان کاموں میں وہ اس قدر جان اور محنت کھپا رہے ہیں کہ دین کی تبلیغ اور کفر و ضلالت کا مقابلہ کرنے کے لئے انہیں وقت نہیں ملتا۔ گزشتہ کم سے کم ایک صدی سے برصغیر میں اہل کفر کو حلقۂ اسلام میں لانے کا کام معطل ہے۔ سارا زور فروعات کے تحفظ پر صرف ہو رہا ہے۔ اس مقصد کے لئے بڑی بڑی رفیع الشان مسجدیں قائم کی جا رہی ہیں، رشد و ہدایت کے منبروں اور مسندوں کو استعمال کیا جا رہا ہے اور وہ تمام طریقے بروئے کار لائے جا رہے ہیں جو حیطۂ اختیار میں ہیں۔ دیگر مسلکوں کے مسلمانوں کے ساتھ ایسا تحقیر آمیز طرز عمل اختیار کیا گیا ہے جیسا کبھی کافروں کے ساتھ بھی اختیار نہیں کیا گیا کہ محض مسلک کے اختلاف کی بنا پر ان کی تکفیر کی جا رہی ہے، بدعتی قرار دیا جا رہا ہے، ارتکاب شرک کا الزام عائد کیا جا رہا

ہے اور ان پر دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے فتوے جاری کئے جا رہے ہیں۔

فروعات وجزئیات میں اختلافات کو گزشتہ ایک صدی میں اس قدر مستحکم کیا گیا ہے کہ اب میدان سیاست میں بھی اس کی بنیاد پر جدا جدا دھڑے بنائے جا رہے ہیں۔ محض فقہی مسلک کی بنیاد پر جدا جدا سیاسی جماعتیں بنائی جا رہی ہیں اور سیاست کے میدان میں لادینوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے اہل دین آپس میں ایک دوسرے کا زور توڑنے میں سرگرم عمل ہیں اور اس طرح سیاست کا میدان ملحدوں، کمیونسٹوں اور علاقہ پرستوں کے لئے کشادہ کیا جا رہا ہے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مسلمان جو اسلام دشمنوں کی نگاہ میں تو ایک ملت ہیں، ہمارے مذہبی رہنماؤں کی نگاہ میں بے شمار دھڑوں میں منقسم ہیں جن میں سے ہر دھڑا ایک دوسرے کا اس سے بھی زیادہ معاند ہے جتنا اہل کفر اور اسلام دشمنوں کا۔ اس طرز عمل نے ایک ملت اور ایک دینی قیادت کا خواب پریشان کر دیا ہے۔ اگر کوئی ملت کو باہم مجتمع اور متحد کرنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اس پر فقہی اختلافات کے ترکش سے تیر اندازی شروع کر دی جاتی ہے۔ مجدد ہونے کا الزام دھرا جاتا ہے اور مدعی مہدویت ہونے کی پیشین گوئی کی جانے لگتی ہے یہاں تک کہ اس کی تکفیر بازی سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ آج برصغیر اور پاکستان کی ملت اسلامی اسی عظیم المیے سے دوچار ہے اور مذہبی رہنماؤں کا یہی کوتاہ نظرانہ طرز عمل ایک دینی قیادت کھڑی کرنے میں حائل ہے۔

اگر یہ طرز عمل برقرار رہا تو ہم وطن عزیز میں اسلامی نظام نافذ کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اس صورت حال کی موجودگی میں اس ملک میں صرف لادینیت استحکام کرے گی۔

اگر فقہی اختلافات کی اس کیفیت کا آپ تجزیہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ اختلاف پروری دین کی خاطر نہیں بلکہ اپنے نفس کی خاطر ہے۔ ہمارے مذہبی رہنما دین کے علمبردار ضرور ہیں مگر وہ اپنے نفس کی خواہش سے بھی مغلوب ہیں۔ وہ یہ تو ضرور چاہتے ہیں کہ دین مستحکم ہو مگر وہ دین کا استحکام اپنی ذات کے توسط سے کرنے کے خواہاں رہتے ہیں۔

بہرکیف! وطن عزیز میں اسلامی نظام کی کوششوں کی کامیابی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمارے مذہبی رہنما اپنے رویے پر نظر ثانی کریں اور اس میں اتنی درستگی لائیں کہ دین کے لئے ان کی خدمات ومساعی ملت اسلامی کے اتحاد و یکجہتی کا ذریعہ بنیں۔ رویے کی نظر ثانی کرنے کے لئے مندرجہ ذیل امور کو ملحوظ

Marfat.com

رکھنا ہوگا۔

۱۔ اساسیاتِ دین اور فروعاتِ دین کے مابین واضح طور پر حدِ فاصل قائم کی جائے اساسیاتِ دین کو فروعات دین پر ترجیح دی جائے۔ اس کی عملی شکل یہ ہو کہ یہ حضرات اپنا زورِ قلم اور زورِ بیان مسلمانوں کو اساسیات دین سے روشناس کرانے پر صرف کریں۔ فروعاتِ دین کی اہمیت صرف اس قدر ہو کہ کوئی عالم، دین کی تعلیم اپنے فقہی عقیدے کے بموجب تو دے مگر دوسرے فقہی مسلکوں کی تنقیص و تحقیر نہ کرے یا اس پر اتنا زیادہ زور نہ دے کہ مسلمان اس بنا پر دوسرے مسلک کے مسلمانوں کو علیحدہ ملت سمجھنے لگیں۔

۲۔ نئی مسجدیں ضرور بنائی جائیں۔ ان کی کثرتِ تعداد میں کوئی مضائقہ نہیں مگر ان کی تعمیر مسلک کے تحفظ کی خاطر عمل میں نہ آئے۔ ایسی مساجد کے قیام کو مسلمانوں میں تفریق کی علامت سمجھا جائے۔

۳۔ اماموں کے تقرر میں کبھی اس کے مسلک کو نہ دیکھا جائے بلکہ امام کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل کو اہمیت دی جائے۔ اقتدا کرنے والے بھی امام کے مسلک کو ٹٹولنے کی کوشش نہ کریں۔ مختلف مسلکوں کے مسلمانوں کا ایک امام کے پیچھے نماز کی ادائیگی کو اپنے مسلکوں کی خاطر علیحدہ علیحدہ جماعتیں کھڑی کرنے کے مقابلے میں زیادہ باعث خیر سمجھا جائے۔

۴۔ محض مسلک کے تحفظ کی خاطر جدا جدا دینی مدرسے قائم نہ کئے جائیں بلکہ ہر معلم کو اس امر کی آزادی ہو کہ وہ اپنے طلبا کو اپنے اپنے مسلک کے مطابق دین کی تعلیم دے۔

۵۔ مسلک کے اختلاف کو ملت کی معاشرتی زندگی میں وجہ اختلاف و تفریق نہ بننے دیا جائے۔

۶۔ اسی طرح سے محض مسلک کے اختلاف کی بنیاد پر سیاسی جماعتیں قائم نہ کی جائیں۔ ہر سیاسی جماعت کا دروازہ ہر مسلک کے مسلمان کے لئے یکساں طور پر کشادہ ہو۔

طرزِ عمل کی اس تبدیلی سے ملت اسلامی میں اتحاد و یگانگت بڑھے گی، اختلاف و منافرت مٹے گی اور اسلامی نظام کی کوششوں کو ثمر آور ہونے کا موقع ملے گا بصورت دیگر مسلمانوں میں تفریق و انتشار پیدا ہوگا۔ اور اس کا آخری فائدہ لادین عناصر کو پہنچے گا۔ اس لئے ابھی وقت باقی ہے کہ ایسے مذہبی رہنما جو فقہی گروہ بندیاں قائم کرنے میں کوشاں رہتے ہیں، صورت حال کو سمجھ کے اپنا موقف درست کریں۔

Marfat.com

سیاسی جماعتوں کا کردار[1]

گزشتہ تین دہائیوں میں ملک میں رونما ہونے والے آئینی اور سیاسی مسائل اور تنازعات کے اسباب کو اگر ہم بے خوفی اور دیانت داری کے ساتھ مشخص کریں تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ یہ تمام صورت حال اصلاً ملک کی سیاسی جماعتوں کی پیدا کردہ ہے، عوام کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ سیاسی جماعتوں کی نا اہلیت، ملک کے مفاد سے عدم التفات اور اقتدار کے لئے ان کی بے قید ہوا و ہوس نے وطن عزیز کی چولیں ہلا ڈالیں یہاں تک کہ اپنے ظہور کے صرف ۲۴ سال بعد یہ دولخت ہو گیا۔ یہاں جتنے بھی سیاسی حوادث و سانحات رونما ہوئے وہ تقریباً تمام کے تمام ان کی اسی نوع کے خواص کا شاخسانہ ہیں۔ مثلاً (مشرقی پاکستان) میں سیاسی جماعتیں تنگ نظری اختیار نہ کرتیں تو ایک ملک میں دو سرکاری زبانیں نہ بنائی جاتیں، وہ اگر صوبہ پرستی کو ہوا نہ دیتیں تو چھ نکاتی فارمولا وجود میں نہ آتا، اقتدار کے حصول کی خاطر ہندوؤں سے سودا بازی نہ کرتیں تو ۱۹۵۶ء میں مخلوط انتخاب کا ہلاکت خیز بل اسمبلی میں منظور نہ ہوتا، ۱۹۶۹ء کی گول میز کانفرنس میں خود غرضی کا مظاہرہ نہ کرتیں تو جمہوریت کی بحالی کی تحریک ناکامی سے دوچار نہ ہوتی، ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں سیکولر جماعتیں علاقہ پرستی کا علم بلند نہ کرتیں اور دینی جماعتیں دھڑے بندی نہ کرتیں تو قومی سیاست پر علاقہ پرستی کو سیاسی غلبہ حاصل نہ ہوتا، برسر اقتدار سیاسی جماعت ۱۹۷۳ء کے آئین کو نافذ کرنے میں پہلو تہی نہ کرتی تو تنگ نظر سیاسی جماعتوں کو صوبائی خود مختاری میں اضافے کے لئے غوغہ آرائی کرنے کا حیلہ نہ ملتا۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں برسر اقتدار سیاسی جماعت دھاندلی نہ کرتی تو ملک کو چھٹے مارشل لا کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اسی طرح سے دیگر امور میں بھی یہ اقتدار پرستی کا رویہ اختیار نہ کرتیں تو صوبہ پرستی فروغ نہ پاتی، نسلی قومیت کی تحریکیں وجود میں نہ آتیں، زبان کے تضیئے رونما نہ ہوتے۔ یہ مسئلے سیاسی جماعتوں نے اقتدار کی خاطر پیدا کئے۔ عوام نے ان میں سے کوئی مسئلہ نہیں اٹھایا۔ وہ بے چارے اس بات سے کیا واقف کہ مرکز اور صوبوں کے مابین تقسیم

---

[1] یہ باب ان ایام میں رقم کیا گیا تھا جب سیاسی جماعتیں بحال تھیں اور سابقہ پروگرام کے مطابق گنتی کے چند دنوں بعد اقتدار کی مالک بننے والی تھیں لہٰذا اس باب کی ترقیم کا مقصد سیاسی جماعتوں کو خود احتسابی کی طرف متوجہ کرنا تھا۔

اختیارات کا مسئلہ کیا ہے؟ یا کسی ایک ملک میں ایک سے زیادہ زبانوں کو قومی زبانیں بنانے کے مضمرات کیا ہیں؟ یا چھ نکات میں کیا لکھا ہے؟ نہ ہی انہیں یہ معلوم کہ صوبہ پرستی یا نسل پرستی کے نقصانات کیا ہیں؟ یا مرکزی حکومت کو کمزور کرنے سے ملکی استحکام کو کیا نقصان پہنچتا ہے یا مخلوط طریقہ انتخاب کو اختیار کرنے کے نقصانات کیا ہیں؟ وہ بیچارے تو صرف اپنے لیڈروں کی سحر بیانی اور نعرہ بازی کا شکار ہوتے چلے آئے ورنہ ان کی دلی خواہش پہلے بھی یہی تھی اور آج بھی صرف یہ ہے کہ جس ملک میں وہ رہ بس رہے ہیں اور جسے انہوں نے بڑی آرزوؤں سے بنایا ہے وہ مضبوط و متحد ہے اور ملک کے تمام علاقوں کے باشندے امن و عافیت اور شادمانی کے ساتھ زندگی گزاریں۔

مختصر یہ کہ اس نوع کے تمام المناک حادثے جن کا سطور بالا میں تذکرہ کیا گیا، رونما نہ ہوتے اگر سیاسی جماعتیں بے قید حرص اقتدار میں مبتلا نہ ہوتیں۔ ان مسائل نے ملک میں یکے بعد دیگرے سنگین قسم کے آئینی اور سیاسی مسائل پیدا کئے اور قومی وحدت کو کمزور کیا۔ ان میں سے صرف چند واقعات کو نوکر شاہی سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ نوکر شاہی کو کامیابی بھی تمام تر سیاسی جماعتوں یا سیاستدانوں کی خود غرضانہ تائید و حمایت کی مدد سے ہی حاصل ہوتی رہی۔ وہ اگر غلام محمد کے ساتھ تعاون نہ کرتیں تو انہیں خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو برطرف کرنے یا دستور ساز اسمبلی کو توڑنے میں کامیابی نہیں ہو سکتی تھی یا ایوب خان کو ایک خود ساختہ جمہوریت چلانے کا حوصلہ نہیں ہو سکتا تھا یا یحییٰ خان کو اقتدار پر قبضہ کرنے کا موقع نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔

سیاسی جماعتوں نے، بہ استثناء چند، ملک میں یہ سب مسائل کیوں پیدا کیے؟ اس کی بڑی بڑی وجوہات یہ ہیں:

۱۔ یہ اس نظریئے پر کام کرتی ہیں کہ انہیں لازماً برسر اقتدار آنا ہے۔ یہ نہایت گمراہ کن نظریہ ہے۔ سیاست اور ملک کی خدمت کرنے کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ کوئی سیاسی جماعت لازماً برسر اقتدار آئے۔ جمہوری طرز حکومت میں ملک کی خدمت کرنے کے لئے حزب اختلاف کا بھی ایک متعین اور ابدی کردار ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ حزب اقتدار کا احتساب کرتی رہے اور اسے سیدھے راستے پر چلاتی رہے۔ جمہوری طرز حکومت میں حزب اختلاف کا وجود ناگزیر ہوتا ہے کیونکہ اس کے بغیر حزب اقتدار شتر بے مہار اور مطلق العنان بن جاتی ہے۔ اگر کسی سیاسی جماعت کو تمام عمر جمہوری طرز حکومت کا تفویض

Marfat.com

کردہ یہ فرض انجام دیتے رہنا پڑے تو یہ بھی اس کی خوش بختی ہے۔ مگر بدقسمتی سے سیاسی جماعتیں اس حقیقت کو ماننے پر راضی نہیں ہوتیں اور وہ لازماً برسر اقتدار آنا چاہتی ہیں۔ اپنی اس ناروا خواہش کی تکمیل کے لئے ایک تو وہ ہر کام میں خواہ برا ہو یا اچھا، حکومت پر نکتہ چینی کو اپنا مستقل شعار بنا لیتی ہیں اور عوام الناس کو جلسوں، جلوسوں، ہڑتالوں اور مظاہروں پر آمادہ کئے رہتی ہیں جس کی وجہ سے حکومت اور عوام کے درمیان مستقلاً محاذ آرائی کی کیفیت قائم رہتی ہے اور حکومت کو اپنے انتظامی کاموں کی انجام دہی اور منصوبوں کے نفاذ میں عوام کا خوش دلانہ تعاون حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ وہ عوام سے نہایت خوش کن وعدے کرتی رہتی ہیں اور انہیں باور کراتی رہتی ہیں کہ اگر انہیں عوام برسراقتدار لے آئے تو وہ مسائل کا جیسے چشم زدن میں خاتمہ کر دیں گی۔ حصول اقتدار کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو بھی آسان تر صورت انہیں نظر آتی ہے، خواہ وہ ناقابل عمل ہو یا مضرت رساں، وہ اسے اختیار کرنے میں تامل نہیں کرتیں۔

۲۔ کوئی سیاسی جماعت ایک بار برسر اقتدار آ جانے کے بعد ہمیشہ اقتدار پر مسلط رہنا چاہتی ہے، کسی دوسری جماعت کو حکومت کرنے کا موقع دینا نہیں چاہتی۔ اس لئے برسر اقتدار آنے کے بعد اپنی پوری قوت حزب اختلاف کو دبانے اور کچلنے پر صرف کرنے لگتی ہے۔ اپنے منشور میں کئے گئے خوشنما وعدوں اور یقین دہانیوں کے برعکس اب وہ شہری آزادیوں کو کچلنے کے لئے احتیاطی نظر بندی کے قوانین وضع کرتی ہے۔ دفعہ ۱۴۴ نافذ کرتی ہے، اخبارات کی اشاعت پر پابندی عائد کرتی ہے، جلسوں، جلوسوں اور ہڑتالوں کے امتناع کے قوانین بناتی ہے اور انتخابات میں سرکاری مشینری کو حزب اختلاف کو دبانے اور اپنی جماعت کو ہر قیمت پر کامیاب کرانے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ پنجاب، سرحد اور سندھ کے صوبائی انتخابات اور ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات، جو سول حکومتوں کے زیر اہتمام منعقد ہوئے، اقتدار کی اس نوع کی مذموم کوششوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

۳۔ سیاست میں حصہ لینے کے لئے اہلیت کا کوئی معیار نہیں ہے حالانکہ اس ملک میں اس کی ترقی پذیری کے باوجود، ہر پیشہ اختیار کرنے کے لئے اہلیت کا معیار مقرر ہے جس کی تکمیل کئے بغیر کوئی شخص کسی پیشے کو اختیار نہیں کر سکتا مثلاً کسی مستند طبی درسگاہ سے طبابت کی سند حاصل کئے بغیر کوئی شخص طبابت کا پیشہ اختیار کرنے کا مجاز نہیں، قانون کی سند حاصل کئے بغیر وکالت کرنے کا حقدار

Marfat.com

نہیں، اسی طرح سے معلمی، سرکاری دفاتر کی عہدہ داری، فوج و پولیس کی ملازمت، صنعت کاری، بینکاری غرضیکہ ہر شعبے میں داخل ہونے کے لئے اس پیشے کے مقرر کردہ معیار اہلیت کی تکمیل ضروری ہوتی ہے، مگر عجیب بات یہ ہے کہ سیاسی جماعتیں اس امر کی چھان بین کرنے کی قائل نہیں کہ ان کی پارٹی میں جو شخص داخل ہو رہا ہے وہ سیاست کاری کی اہلیت۔ رکھتا ہے یا نہیں؟ سیاسی فہم و بصیرت کا حامل ہے یا نہیں؟ متین و سنجیدہ ہے یا نہیں؟ یا کیا وہ حقیقتاً ملک کا بہی خواہ ہے؟ یا قومی نقطۂ نظر کا حامل ہے یا وسیع النظر ہے؟ کوئی شخص ان میں سے خواہ ایک بھی وصف کا حامل نہ ہو، صرف شعلہ بیان مقرر ہو یا ایجی ٹیشن کرانے کی یا ہنگامہ پروری کی صلاحیت رکھتا ہو، یا انتخابات جیتنے کے گُر جانتا ہو، اس کے لئے سیاسی جماعتیں اپنے دروازے وا کر دیتی ہیں، یہاں تک کہ ایسے لوگ بھی جو کبھی برسراقتدار رہ چکے ہوتے ہیں اور جن کی سیاسی شہرت تار تار ہو چکی ہوتی ہے، سیاسی جماعتوں میں نہایت شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ داخل ہو جاتے ہیں اور وہاں بسا اوقات انہیں اعلیٰ عہدے پیش کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ صورت حال صرف ہمارے ملک کی سیاسی جماعتوں تک مخصوص نہیں بلکہ براعظم ایشیا کے تقریباً تمام ممالک میں سیاسی جماعتوں کی کم و بیش یہی کیفیت ہے۔ وہ حصول اقتدار کو اپنے لئے ضروری سمجھتی ہیں۔ ایک بار برسراقتدار آنے کے بعد پھر اس سے کسی قیمت پر دست کش ہونا نہیں چاہتیں اور سیاست کاری کے لئے کسی معیار اہلیت کی قائل نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس براعظم میں سیاسی جماعتیں اصلاً حکومت چلانے کی غرض سے قائم نہیں کی جاتی رہیں بلکہ بیرونی حکمرانوں کی غلامی سے اپنے اپنے ملکوں کو آزاد کرانے کی غرض سے قائم کی جاتی رہیں۔ ایشیا کے بیشتر ملک یورپ کے ملوکیت پسند ملکوں کی غلامی میں جکڑے ہوئے تھے اس لئے ان سے نجات پانے کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ ایسی جماعتیں قائم ہوں جو ایجی ٹیشن کے ممکنہ ذرائع جلسے، جلوس، ہڑتال، مظاہرے وغیرہ استعمال کر کے بیرونی حکمرانوں کو بھاگ جانے پر مجبور کر دیں۔ اس ضرورت کی بنا پر سیاسی جماعتوں نے سیاست کاری کے معیار اہلیت کا لحاظ کئے بغیر ہر قسم کے آدمیوں کے لئے اپنی جماعت کے دروازے کھول دیئے اور ایسے افراد کی بڑی پذیرائی کی جو خواہ اور کچھ نہ جانتے ہوں مگر شعلہ بیانی کی صلاحیت رکھتے ہوں اور ایک پرتشدد تحریک چلانے میں کام آ سکتے ہوں۔ یہ ضرورتاً کوئی نامناسب بات نہ

تھی مگر ان کی نگاہ اس حد سے آگے پہنچنے سے قاصر رہی کہ غیر ملکی حکمرانوں کو نکال باہر کرنے میں جب کامیابی حاصل ہو جائے گی اس کے بعد ان کی جگہ پر ملک کا نظام کون چلائے گا اور کس طرح چلائے گا؟ اس کام کے لئے سیاسی جماعتوں کے پاس باصلاحیت اور باکردار افراد کی ٹیم ہونی چاہئے تھی یا تیار کی جانی چاہئے تھے مگر انہوں نے اس کام کی طرف سے غفلت برتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب انہوں نے بیرونی حکمرانوں کو نکال باہر کیا تو حکومت چلانے کے لئے ان کے پاس باصلاحیت اور صاحب کردار افراد کی ٹیم نہ تھی۔ ناچار انہیں حکومت ایسے افراد کو تفویض کرنی پڑی جو صرف شعلہ بیانی اور ایجی ٹیشن کے ماہر تھے۔ سیاست و حکومت کا کام مطلقاً نہ جانتے تھے۔ اس کام کا نتیجہ یہ نکلا کہ آزادی کے بعد قوم کو اس کے فوائد تو کیا حاصل ہوتے، نظم و نسق کا وہ معیار بھی قائم نہ رہ سکا جو بدیسی حکمران قائم کر گئے تھے۔ ایک کے بعد دوسری، مگر تواتر کے ساتھ نااہل حکومت ہی برسراقتدار آتی رہی۔ اسی وجہ سے آج ایشیا کا ہر نو آزاد ملک تقریباً یکساں طور پر افلاس، بیروزگاری اور بدامنی کی لپیٹ میں ہے۔ انڈونیشیا سے لے کر ہندو پاکستان تک کسی بھی ملک کو آزادی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہونا نصیب نہیں ہو سکا ہے۔

بہرکیف! یہ تو تھے وہ اسباب و عوامل جن کی بنا پر سیاسی جماعتیں اقتدار کی بے قید ہوا و ہوس رکھنے والے عناصر کا طبقہ بن گئیں۔ اقتدار کی الفت نے مسائل کے حل کے بارے میں ان میں ایک نہج فکری بھی پیدا کی۔ وہ یہ ہے کہ مسند اقتدار پر متمکن ہوئے بغیر ملک کا کوئی مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی تھوڑا سا غور و فکر کرے تو اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ بہت سے مسئلے غیر حکومتی سطح پر بھی حل کئے جا سکتے ہیں یا ان میں کمی کی جا سکتی ہے مثلاً رشوت خوری کے مسئلے کو لیجئے۔ اس کا انسداد صرف تعزیر کے ذریعے نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کے انسداد کے لئے تنبیہ و تلقین بھی ضروری ہوا کرتی ہے۔ سیاسی جماعتیں تنبیہ و تلقین کا کام تو کر ہی سکتی تھیں۔ وہ اگر اس کے خلاف ایک ہمہ گیر تحریک چلاتیں اور رشوت خوروں کو اس برائی سے اجتناب کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتیں تو اس میں قابل لحاظ کمی واقع ہو سکتی تھی۔ اسی طرح سے چور بازاری، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، اسمگلنگ وغیرہ کا جو ملک کے بہت سنگین معاشرتی مسائل ہیں، اور ہماری معیشت کو برباد کئے دے رہے ہیں، سیاسی جماعتوں کی کوششوں سے انسداد کیا جا سکتا تھا۔ مگر انہوں نے

Marfat.com

ان مسائل کی طرف کبھی توجہ نہ دی ، کبھی ان کے خلاف کوئی جلسہ نہیں کیا گیا، کبھی جلوس نہیں نکالا گیا ، کبھی ہڑتال نہیں کی گئی حالانکہ یہ برائیاں روز بروز فروغ پاتی چلی جا رہی ہیں۔

اسی طرح سے اخلاقی برائیوں کو لیجئے۔ فحش لٹریچر کی روزافزوں اشاعت، سینما گھروں میں عریاں فلموں کی نمائش، ٹیلیویژن کے اخلاق باختہ ڈرامے اخلاق کو برباد کئے دے رہے ہیں مگر یہ ان کی طرف سے آنکھیں بند کئے بیٹھی رہتی ہیں۔ انہیں کبھی اس کا خیال نہیں آتا کہ وہ اس کے خلاف کوئی تحریک چلائیں یا مظاہرے منظم کریں۔

سماجی بہبود کے بے شمار کام سرکاری وسائل کی قلت کی وجہ سے ابتری کا شکار ہیں جو ان کے تعاون سے انجام دیئے جا سکتے تھے مگر ان کو اس ضمن میں اپنے فرائض کا بھولے سے بھی خیال نہیں آتا کہ وہ امدادی شفاخانے قائم کریں، نادار طلبا کے لئے وظائف کا، یتیموں اور بیواؤں کے لئے مالی امداد کا اور اپاہجوں کے لئے کفالت کا انتظام کریں۔ وہ زبان قال سے اگر نہیں تو زبان حال سے ان سب مسائل کی کنجی حکومت کے ایوان خانے میں مقفل سمجھتی ہیں حالانکہ یہ سب مسائل قوم کے اہل ثروت کا مالی اور رضاکاروں کا جسمانی تعاون حاصل کر کے قابل لحاظ حد تک حل کئے جا سکتے تھے کیونکہ یہی سب تو وہ کام ہیں جو سیاست اور عوام کی خدمت کے دائرے میں آتے ہیں۔ اقتدار جب تک حاصل نہ ہو ان کاموں کی انجام دہی میں کیا برائی ہے؟

مگر ہماری سیاسی جماعتیں ان تمام کاموں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے ہمہ وقت صرف حکومت پر تنقید کے پتھر برسانے میں لگی رہتی ہیں۔

تیسری بڑی خرابی ان کی یہ ہے کہ عوام الناس کو کبھی یہ سمجھانے کی کوشش نہیں کرتیں کہ حکومت صرف حقوق ادا کرنے والے ادارے کا اور جمہور صرف حقوق وصول کرنے والے طبقے کا نام نہیں ہے بلکہ حقوق کا حاصل کرنا فرائض کی ادائیگی کے ساتھ مشروط ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح جیسے درخت سے پھل حاصل کرنا درخت لگانے اور اس کی دیکھ بھال کرنے کیساتھ مشروط ہوتا ہے۔ درخت کی دیکھ بھال اور سیرابی سے اگر غفلت برتی جائے تو زیادہ دنوں تک اس سے پھل حاصل نہیں کیا جا سکتا اسی طرح کارخانے کے کارکنوں کے لئے مالی مراعات میں اضافہ کرانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ پیداوار میں اضافہ کریں، تجارتی اداروں کے کارکنوں کے لئے تنخواہوں میں اضافہ طلب کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ وہ کاروبار

Marfat.com

اور منافع میں اضافہ کرائیں۔ دفتری کارکنوں کی طرف سے سہولتوں میں اضافے کا مطالبہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ وہ کارکردگی کا معیار بہتر بنائیں مگر ہماری سیاسی جماعتیں حقوق کا مطالبہ کرنے والوں کو فرائض کی ادائیگی سے بری الذمہ کر دیتی ہیں اور ان کے مطالبات کی غیر مشروط طور پر حمایت کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ اگر کسی کارخانے کے کارکنوں کی طرف سے مالی مراعات میں اضافے کا مطالبہ اٹھے تو یہ بلا توقف ان کی حمایت میں زوردار بیانات داغنا شروع کر دیتی ہیں۔ مطالبہ کرنے والوں سے کبھی پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں کہ انہوں نے کارخانے کی پیداوار میں کتنا اضافہ کیا ہے اور کارخانے کے منافع کی رقم کتنی بڑھ جاتی ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ اگر پیداوار میں اضافہ نہ ہوا ہو یا منافع کی رقم نہ بڑھی ہو تو مالی مراعات میں اضافہ کارخانے کو ایسے خسارے میں مبتلا کر دے گا جو بتدریج اس کے وجود کو ہی ختم کر دے گا۔ اسی طرح سے دفاتر کے ملازمین کی طرف سے، مدارس کے اساتذہ کی طرف سے، ٹرانسپورٹ کے کارکنوں کی طرف سے یا کسی اور طبقے کی طرف سے مراعات میں اضافے کا مطالبہ ہو تو سیاسی جماعتیں اس کا لحاظ کئے بغیر کہ ان کی طرف سے کارکردگی کا معیار روز بروز گرتا جا رہا ہے، غیر مشروط طور پر ان کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ طرز عمل ایک زمانے سے جاری ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عوام الناس اور حکومت غیر محسوس طریقے پر دو متحارب گروہ بن گئے ہیں۔ عوام حکومت کو ہمیشہ نکتہ چین نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ پھر کسی دن حزب اختلاف کی کسی جماعت کو مسندِ اقتدار پر متمکن ہونے کا موقع ملے تو عوام اسے بھی اسی نکتہ چین نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں جن نکتہ چین نگاہوں سے حکومت کو دیکھنے کا انہوں نے انہیں سبق پڑھایا تھا اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انہیں ایک دن کے لئے بھی چین سے حکومت چلانا نصیب نہیں ہوتا۔ اس طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب کوئی حکمران جماعت مسند اقتدار سے اتار دی جاتی ہے یا اترتی ہے تو وہ عوام میں پہنچ کر نئی حکومت کو اسی طرح سے جا و بے جا ہدف ملامت بنانے میں مشغول ہو جاتی ہے جس طرح ملامت کا وہ خود ہدف بنتی رہی تھی۔ یہ سب باتیں نہایت غیر صحت مندانہ ہیں جن کی موجودگی میں کوئی حکومت کبھی بھی کامیابی کے ساتھ کام نہیں کر سکتی اور کوئی ملک کبھی بھی سکون اور آسودگی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔

حقوق کے حصول سے پہلے فرائض کی ادائیگی کے مسئلے میں عوام کو باشعور بنانے کا کام سب سے بہتر طور پر سیاسی جماعتیں ہی کر سکتی ہیں۔ یہ کام کسی طور پر بھی حکومت نہیں کر سکتی کیونکہ وہ تو اس

معاملے میں ایک فریق کی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر انہوں نے اس معاملے پر کبھی اپنے فرض کو نہیں پہچانا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ماضی کی حکومتوں کو تن تنہا عوام کے ہر طبقے کی طرف سے حقوق اور مطالبات کے دباؤ کا سامنا کرتے رہنا پڑا۔ ان کے لئے جب کبھی یہ دباؤ ناقابل برداشت ہوگیا تو انہوں نے مطالبات کے آگے ہتھیار ڈال دیئے، تنخواہوں میں اضافے کر دیئے یا دیگر مطلوبہ مراعات مہیا کر دیں۔ قومی خزانے پر فالتو مصارف کا جو بار پڑا اُسے پورا کرنے کے لئے فالتو نوٹ چھاپ دیئے یا خزانے پر غیر ملکی قرضوں کا بوجھ لاد دیا۔ یہ صورت حال تسلسل کے ساتھ جاری رہنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ یہ ملک اس وقت ساٹھ ستر ارب روپے کے قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا کراہ رہا ہے اور اس میں اتنی مالی سکت بھی نہیں رہی ہے کہ وہ ان قرضوں کا کم سے کم سود ہی ادا کر سکے۔ سود ادا کرنے کے لئے بھی کہیں سے سودی قرض حاصل کرنا پڑ رہا ہے۔ قرض اور سود کا نہ ختم ہونے والا یہ شیطانی چکر سیاسی جماعتوں کا ہی چلایا ہوا ہے جسے اپنے اپنے وقت میں ہر حکومت چلاتے رہنے پر مجبور رہی ہے خواہ وہ سیاسی جماعتوں کی رہی ہو یا فوجی طبقے کی۔

یہ تو رہی عوام کے معاملے میں سیاسی جماعتوں کی فرض ناشناسی۔ اب دوسرے مسئلے کو لیجئے جس پر ان کے وجود کا انحصار ہے۔ وہ مسئلہ جمہوری طرز حکومت کا ہے۔

سیاسی جماعتوں کا وجود اس امر کا مرہون منت ہوا کرتا ہے کہ ملک میں جمہوری طرز حکومت ہے اور جمہوریت میں ہی قوم کی فلاح مضمر ہے۔ مگر انہوں نے کبھی اس مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ جمہوری نظام حکومت کوئی امرت دھارا نہیں جسے ملک اور قوم کو پلا دیا جائے تو وہ ترقی اور خوشحالی سے ہمکنار ہو جائے۔ یہ خود ایک اصلاح طلب نظام ہے اور ابھی تک یہ تجرباتی مراحل میں ہے۔ ایسے ملکوں میں بھی جہاں یہ نظام دو سو سالوں سے قائم ہے، یہ تجربے اور آزمائش کی کسوٹی پر کھرا ثابت نہیں ہوا ہے۔ اس کی بعض اندرونی خرابیاں اسے ایک کامیاب نظام سیاست ثابت کرنے میں مانع ہو رہی ہیں۔ ان میں اس کی چار پانچ بڑی خامیاں سب سے نمایاں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ یہ اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGNTY) کا مسئلہ طے کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ اس نے ملوکیت (IMPERIALISM) یا مطلق العنانی (TOTALITARIANISM) کی جگہ اس دعوے کی بنیاد پر لی تھی کہ یہ جمہور عوام کو مقتدر اعلیٰ مانتی ہے۔ مگر جب ملوکیت یا مطلق العنانی کی جگہ پر جمہوری حکومت کا نیا ڈھانچہ کھڑا کرنے کا مسئلہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ جمہور کا مقتدر اعلیٰ (SOVEREIGN) ہونا

Marfat.com

کاغذ کی زینت کا یا نعرہ بازی کا کام تو دے سکتی ہے، حکومت کا کوئی ڈھانچہ بنا کے نہیں دے سکتی۔
جمہوریت سازوں نے اقتدار اعلیٰ کو منتخب نمائندگان کو تفویض کر کے نمائندہ حکومت (REPRE-SENTATIVES' GOVERNMENT) کا تجربہ کیا۔ وہ بھی ناکام ثابت ہوا کیونکہ روبہ عمل آنے کے بعد تجربہ ہوا کہ منتخب نمائندگان بھی اسی طرح مطلق العنان بن جاتے ہیں جس طرح شخصی حکومت میں ملک کا فرماں روا ہوا کرتا ہے۔ اس خامی کا سدباب کرنے کے لئے اقتدار اعلیٰ کو آخرکار چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک حصہ انتظامیہ کو تفویض کیا گیا، دوسرا مقننہ کو، تیسرا عدلیہ کو اور چوتھا حزب اختلاف کو دیا گیا اور ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کا محتسب بنایا گیا۔ ایک کی گردن دوسرے کے ہاتھ میں دے دی گئی کہ شاید احتساب کا یہ چہار طرفہ عمل ان میں سے کسی ایک مقتدر ادارے کو مطلق العنان نہ بننے دے۔
اس وقت جمہوریت کا ڈھانچہ اسی اصول پر قائم ہے مگر دیکھنے میں یہ آتا رہتا ہے کہ ان میں سے جو ادارہ بھی زیادہ مقتدر ہو جاتا ہے وہ کم تر قوت والے ادارے کا گلا دبوچ لیتا ہے۔ اگر انتظامیہ طاقتور ہو جائے تو وہ مقننہ کو قابو میں کر لیتی ہے۔ مقننہ اگر طاقتور ہو جاتی ہے تو وہ کوئی وجہ بتائے بغیر انتظامیہ کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتی ہے۔ حزب اختلاف کو اگر کبھی عوام الناس کا اثر استعمال کرنے میں کامیابی حاصل ہو جائے تو وہ انتظامیہ کا اقتدار مٹا ڈالتی ہے اور اس طرح دنیا میں ہر جگہ جہاں جہاں جمہوری حکومتیں قائم ہیں، یہ چاروں ادارے باہم متصادم ہوتے رہتے ہیں۔

دوسری بڑی خرابی اس کی یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی ماخذِ ہدایت نہیں ہے۔ ایسا ماخذ جو معاشرے کی تعمیرِ نو کے لئے رہنما اصول دے، صحیح و غلط کا معیار قائم کرے اور اختلاف رائے کی صورت میں دلیل اور حجت کا کام دے یا جس کی روشنی میں اختلافات کا تصفیہ کیا جا سکے۔ ماخذ ہدایت کی عدم موجودگی میں سارے فیصلے کلیتاً صوابدید کی بنیاد پر کئے جاتے ہیں۔ صوابدید چونکہ معیار مطلق نہیں ہوا کرتی اس لئے اس کا فیصلہ کبھی بھی متفقہ نہیں ہوتا اور اسی وجہ سے حکومت میں ہر وقت کم سے کم اندرونی طور پر محاذ آرائی قائم رہتی ہے۔

ماخذ ہدایت سے مراد مثال کے طور پر یہ ہے کہ جرائم کے ارتکاب پر مجرمین کو کیا سزا دی جائے؟ اس معاملے میں مجرّد نظام جمہوریت کے پاس کوئی طے شدہ اصول نہیں ہوتا کہ اس سے رجوع کریں اور اس کی ہدایت کے بموجب سزا اس کا نفاذ عمل میں آئے۔ اس کا فیصلہ خالصتاً عقلی بنیادوں پر کیا جاتا ہے

Marfat.com

اور عقل کسی جرم کے لئے کبھی ایک سزا پر متفق نہیں ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے ملکوں میں سنگین جرائم پر معمولی درجے کی اور بعض ملکوں میں معمولی جرائم پر سنگین سزاؤں کا نفاذ عمل میں آتا ہے۔ اسی طرح سے تقسیم دولت کے بارے میں جمہوریت کے پاس کوئی ہدایت نہیں ہے۔ ہدایت سے محرومی نے معیشت کے میدان میں آزادانہ اور بے لگام مسابقت کی تحریک پیدا کی جو ایک طرف بتدریج چند ہاتھوں میں سرمائے کے ارتکاز یعنی سرمایہ داری اور دوسری طرف عامۃ الناس کی ہلاکت کا سبب بنی۔ اسی طرح سے سود، قماربازی اور سٹہ کے بارے میں جمہوریت کے پاس کوئی ابدی قدر نہیں ہے جو اسے ممنوع قرار دے۔ لہٰذا جمہوری نظاموں میں یہ مذموم کام کھلے عام جاری ہیں اور قومی معیشت کو تہہ و بالا کئے دے رہے ہیں۔

فرد کے بنیادی حقوق یعنی جان کے تحفظ، مال کے تحفظ، عزت و آبرو کے تحفظ، اور بے لاگ انصاف کے حصول کے لئے کوئی متعین قدر نہیں ہے۔ اس کا تعین جمہوری نظام اپنی خود رایانہ مرضی سے کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اسے تبدیل کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے فرد اپنی ذات اور اپنے مستقبل کی طرف سے خود کو ہمیشہ غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ شراب نوشی، زنا اور ہم جنس پرستی کے لئے بھی کوئی متعین قدر نہیں ہے۔ جمہوریت جب چاہتی ہے ان جرائم کو قابل تعزیر قرار دیتی ہے اور جب چاہتی ہے قانون تعزیرات کو منسوخ کر دیتی ہے۔ ایسا نظام معاشرے کو ہر وقت متلاطم رکھتا ہے اور اسے سکون و عافیت نصیب نہیں ہوتی۔

جمہوریت کی تیسری بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں تصفیہ طلب امور کا فیصلہ ماہرین کی صوابدید پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ مجرد کثرت رائے یا دست شماری پر منحصر ہوتا ہے حالانکہ زندگی کے ہر تصفیہ طلب معاملے میں انسان فیصلے ماہرین سے کرواتا ہے۔ کثرت رائے سے فیصلہ کرانا جہالت اور مضرت رساں سمجھتا ہے۔ مثلاً مریض کی بیماری کی تشخیص مریض کو پنچایت میں بٹھا کر پنچایت کی کثرت رائے سے نہیں کرائی جاتی بلکہ کسی ماہر معالج سے کرائی جاتی ہے اور اس معاملے میں اسی کی رائے کو حتمی سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح سے قانون کے معاملے میں وکیل یا جج کی رائے کو، تعمیرات کے معاملے میں انجینئر کی رائے کو، علم کے معاملے میں عالم کی رائے کو فیصلہ کن مانا جاتا ہے مگر امور سلطنت جو سب سے اہم اور نازک ہوتے ہیں اور جن کا اثر پوری قوم پر پڑتا ہے، ان میں فیصلے ماہرین سے کروانے کے بجائے نمائندگان جمہور

سے ، ان کی ماہرانہ رائے پر نہیں ، بلکہ ہاتھ اٹھوا کر کرائے جاتے ہیں۔

خود نمائندگان جمہور کے انتخاب کے لئے بالعموم کوئی معیار اہلیت نہیں ہوتا اس لئے ایوان جمہور میں پہنچنے کے لئے امیدواروں کی قابلیت وصلاحیت سے زیادہ ان کی شعلہ بیانی اور انتخاب جیتنے کے لئے ان کی مطلوبہ تکنیکی مہارت رائے دہندگان کے ووٹ کی پرچیوں کی حقدار بن جاتی ہے اور ایسے امیدوار، ایسے امیدواروں پر جو خواہ کتنے ہی قابل اور اہل ہوں، مگر مذکورہ صفات سے محروم ہوں، سبقت لے جاتے ہیں۔ ایسی مثالیں بے شمار ہیں کہ انتخابات میں کسی بلند مایہ ماہر قانون یا سیاست دان کے مقابلے میں کوئی معمولی درجے کا امیدوار انتخاب جیت جاتا ہے۔ ہماری اسمبلیوں میں بدقسمتی سے ایسے افراد کو غالب اکثریت حاصل ہوتی ہے ان کے برعکس قوم کا بہترین دماغ، ماہرین قانون، جج، وکلاء ماہرین سیاست، ماہرین معیشت، ماہرین تعلیم اور اپنے اپنے شعبے کے ماہرین انتخابی دست رسا سے محرومی کے باعث قوم کی رہنمائی کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور قومی معاملات فرو تر درجے کے لوگوں کے ہاتھوں میں چلے جاتے ہیں۔

پھر اہل حکومت یعنی وزرا کا انتخاب بھی ان ہی میں سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے حکومت کا کلیدی منصب کم تر اہلیت بلکہ بسا اوقات نا اہل لوگوں کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔ ایسی مثالیں کچھ کم نہیں ہیں کہ تعلیم کی وزارت کسی انڈر گریجویٹ کو تفویض کی گئی ہو، صحت کی کسی وکیل کو، مالیات کی کسی انجینئر کو، تجارت کی کسی ناول نگار کو، دفاع کی کسی جاگیردار کو علیٰ ہٰذا القیاس۔

پاکستان میں ہر الیکشن کے بعد حقیقتاً ایسا ہی ہوتا رہا۔ معاشرے کے کم تر درجے کے افراد حکومت کے زمام کار بن گئے۔ حکومت چلانے کی صلاحیت چونکہ ان میں مطلقاً نہ تھی لہٰذا انہوں نے امور حکومت اپنے سکرٹریوں اور افسران اعلیٰ پر چھوڑ دیئے اور خود شاہانِ عیش پرست کی طرح عیش کوشی میں مستغرق ہو گئے یا اپنا مالی مستقبل سنوارنے میں لگ گئے۔ عوام نے ان سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں تو انہوں نے اپنے آپ کو ان کے غیظ وغضب سے بچانے کے لئے ناکارکردگی کا الزام سکرٹریوں اور افسران اعلیٰ کے سر تھوپ دیا۔ گزشتہ ۳۲ برسوں سے ہر حکومت کے وزراء تواتر کے ساتھ یہی عمل دہراتے چلے آرہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بیوروکریسی کا لفظ ایک گالی بن گیا ہے اور پاکستان کے عوام کی نگاہ میں ان سے برا اور مذموم کوئی نہیں۔

مگر امورِ سلطنت میں بیوروکریسی کو غیر معمولی عمل دخل صرف پاکستان میں حاصل نہیں بلکہ دنیا کے ہر اس ملک میں حاصل ہے جہاں جمہوری طرزِ حکومت قائم ہے، یہاں تک کہ انگلستان میں بھی اور امریکہ میں بھی۔ اشتراکی ممالک میں تو حکومت نام ہی بیوروکریسی کا ہے۔ ان ممالک میں بھی بیوروکریسی کے خلاف عوام میں اسی قسم کا غیض و غضب یا تنفّر پایا جاتا ہے جیسا پاکستان میں۔ پاکستان کے نامور ماہرِ قانون جناب خالد اسحٰق نے بھی ایک انٹرویو میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے[۱]۔ ان کا کہنا ہے کہ آج دنیا میں بیسیوں کتابیں اس مسئلے پر لکھی جا رہی ہیں کہ بیوروکریسی کو کس طرح کنٹرول کیا جائے۔

دنیا بھر میں ہر جگہ بیوروکریسی حکومت میں فیصلہ کن حد تک دخیل کیوں ہو گئی ہے؟ اگر آپ غور کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس کی وجہ وہی ہے جو پاکستان میں اس کے دخیل بن جانے کی ہے یعنی ووٹ کی پرچیاں معاشرے کے بہترین افراد کے بجائے ادنیٰ درجے کے افراد کو منتخب کر کے اوپر لاتی ہیں۔ ایسے افراد جو امورِ سلطنت — مالی معاملات، امورِ صحت، تعلیم، صنعت، تجارت، درآمدات و برآمدات، نشریات و اطلاعات، تعمیرات، قانون سازی اور دیگر امور کو چلانے، ان کے معاملات کو سمجھنے اور ان میں قانون سازی کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنے معاملات میں بیوروکریسی پر جو اپنے اپنے شعبوں کے منجھے ہوئے ماہرین پر مشتمل ہوتی ہے، تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ جناب خالد اسحٰق کا بھی ایسا ہی خیال ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "نئی قانون سازی اتنی پیچیدہ اور ٹکنیکل ہو گئی ہے کہ پارلیمنٹ کا ایک عام نمائندہ جو عام شرائطِ رکنیت کے تحت منتخب ہو کے آتا ہے اس پر کنٹرول نہیں کر پاتا....

چونکہ عام سیاسی لیڈر کے پاس وہ سیاسی اور عقلی استعداد نہیں ہوتی جو اس کو کنٹرول کر سکے یا اس کا محاسبہ کر سکے اس لئے خاص طور پر تیسری دنیا میں جہاں جہاں بھی پارلیمنٹ قائم ہوتی ہے وہ بے اثر رہی ہے۔ پھر یہ کہ قانون سازی کے میدان میں کوئی پیش دستی بھی یہ لوگ نہ کر سکے۔ یورپ میں بھی آج کل جتنی قانون سازی ہے اس کی تحریک تمام تر بیوروکریسی کی طرف سے ہوتی ہے۔ دوسری طرف سوشلسٹ ممالک میں اقتدار حقیقتاً سارا کا سارا بیوروکریسی کے ہاتھ میں ہے ...."

پاکستان میں اس صورتِ حال کی اصلاح کے لئے یہ تدبیر بھی کر کے دیکھ لی گئی کہ سکریٹروں اور افسرانِ اعلیٰ کا تقرر سی۔ ایس۔ پی افسروں کے بجائے اپنے اپنے پیشوں کے ماہرین میں سے کیا گیا مثلاً

---

[۱] روزنامہ جسارت۔ ۱۱ جولائی ۱۹۸۰ء

تعلیم کی وزارت کے سکریٹریوں اور افسروں کا تقرر اساتذہ میں سے کیا گیا۔ صحت کا ڈاکٹروں میں سے، زراعت کا ماہرین زراعت میں سے، سائنس کا سائنس والوں میں سے علی ہذالقیاس۔ مگر اس اصلاحی اقدام کے بعد بھی ان شعبوں میں وزراء اور عوامی نمائندوں سے زیادہ غالب و دخیل بیوروکریسی نظر آئی۔ اس سے آپ اس کے علاوہ کیا نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ نظام جمہوریت کی کوئی چول کہیں نہ کہیں سے ضرور ڈھیلی ہے جو اس کے ڈھانچے کو مستحکم طریقے پر کھڑا ہونے نہیں دیتی۔

نظام جمہوریت کی چوتھی بڑی خامی یہ ہے کہ اس کے ذریعے منتخب ہو کر ایوانِ حکومت میں پہنچنے والے نمائندوں کی وفاداریاں اصولوں یا وسیع تر مفادات کے مقابلے پر ووٹ کی ان پرچیوں سے وابستہ ہو جاتی ہیں جو انہیں وہاں تک پہنچانے کا ذریعہ رہی ہوتی ہیں۔ لہٰذا ایوان میں خواہ وہ بلدیہ کی میونسپل کمیٹی رہی ہو یا صوبے یا وفاق کی اسمبلی، کوئی منتخب نمائندہ ایسے مسائل و معاملات میں جہاں کسی اصول یا اجتماعی مفاد کا اس کے انتخابی حلقے کے ووٹروں کے مفاد سے تصادم ہو، اپنے ووٹروں کی خوشنودی کو مقدم رکھتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر کسی گنجان اور مصروف سڑک کو کشادہ کرنا ناگزیر ضرورت بن جائے اور اس کام کے لئے اطراف کی تعمیرات کو منہدم کرنے کی کوئی تحریک ایوان میں پیش کی جائے تو متعلقہ علاقے کا نمائندہ وسیع تر اجتماعی مفاد کے تقاضے کے علی الرغم اس تحریک کو ناکام بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ گویا ووٹ کی پرچیوں کے ذریعے چلائی جانے والی جمہوریت گروہی مفاد پرستی کو جنم دیتی ہے۔

ووٹ کی پرچیوں کی یہ خرابی دنیا بھر میں ایک عالمگیر برائی کی حیثیت سے موجود ہے۔ امریکہ کے انتخابات میں جب کوئی صدارتی امیدوار مظلوم عربوں کے مقابلے پر غاصب اسرائیل کی طرفداری کا وعدہ کرتا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ووٹ کی پرچیوں کی بڑی تعداد یہودی سرمائے کے قبضۂ اختیار میں ہوتی ہے یا انگلستان کے عام انتخابات میں جب کوئی امیدوار برسہا برس سے وہاں بسے بسائے ایشیائیوں کو اکھاڑنے کا وعدہ کرتا ہے تو اس کا محرک بھی ووٹ کی پرچیاں ہی ہوا کرتی ہیں۔

مگر یہ سب کچھ دیکھتے رہنے کے باوجود پرستارانِ جمہوریت کو اصرار ہے کہ ملک کا ڈھانچہ

Marfat.com

لازماً جمہوری ہی رہنا چاہئے۔ اس نظریئے کے حق میں ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انتخابات کے ذریعے جو لوگ منتخب ہو کے ایوانِ حکومت میں پہنچتے ہیں انہیں عوام کا اعتماد حاصل رہتا ہے۔

اگر آپ ان کے اس نظریئے کی حقائق کی روشنی میں تنقیح کریں تو یہ نہایت بے حقیقت نظر آئے گا کیونکہ ملک کے ۹۹ فیصد امور افراد کار کو انتخابات کے بجائے نام زدگی یا تقرر کے ذریعے تفویض کئے جاتے ہیں مگر کبھی اس کے خلاف اس بنیاد پر کسی بے اطمینانی کا ظہور نہیں ہوتا کہ افراد کار کو انتخابات کے بجائے نام زدگی کے ذریعے کیوں مقرر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ہماری عدالتوں کے جج ووٹ کی پرچیوں کے بجائے نام زدگی کے ذریعے مقرر کئے جاتے ہیں مگر کبھی کسی جج کے خلاف مدعی یا مدعا علیہ کے دل میں اس بنا پر بے اطمینانی پیدا نہیں ہوتی کہ اسے انتخاب کے بجائے نام زدگی کے ذریعے مقرر کیا گیا ہے۔ اسی طرح سے کسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر یا کالج کے پرنسپل کے خلاف طلبا میں اس بنا پر بے اطمینانی دیکھنے میں نہیں آتی کہ اسے انتخابات کے بجائے تقرر کے ذریعے اپنے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ اسی طرح سے فوج کے سپہ سالار کے بارے میں یا وزارتوں کے سکریٹریوں کے بارے میں یا اخبارات کے ایڈیٹروں کے بارے میں یا اسپتال کے ڈاکٹروں کے بارے میں ...... اس بنیاد پر کوئی بے اطمینانی پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اگر یہ عہدے بھی نمائندگان جمہور کی طرح ووٹ کی پرچیوں کے ذریعے پُر کئے جاتے تو آپ کو ان شعبوں میں اس پائے کے ماہرین ہرگز میسر نہ آسکتے تھے جس پائے کے ماہرین کے ہاتھوں کئے جانے والے تقرر کے ذریعے آپ کو میسر آتے ہیں۔

بہرکیف! یہ ہیں وہ بڑی بڑی خامیاں جو ہماری سیاسی جماعتوں اور نظام جمہوریت میں پائی جاتی ہیں۔ ان خرابیوں کی وجہ سے عامۃ الناس کو سیاسی جماعتوں اور نظام جمہوریت سے وہ فوائد حاصل نہیں ہو رہے ہیں جن کی ان سے امید باندھی گئی تھی۔ اگر حکمرانی کے جمہوری ڈھانچے کو باقی رکھنا ہے تو سیاسی جماعتوں اور جمہوریت کو ان کی ان خامیوں سے پاک کرنا پڑے گا اور یہ مسئلہ آج کے سیاستدانوں کے لئے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ ان خامیوں کو دور کئے بغیر پاکستان سمیت کسی بھی ملک میں سیاسی جماعتوں اور نظام جمہوریت کا کوئی مستقبل نہیں ہے اور ان کی یہی

Marfat.com

وہ کمزوریاں اور خرابیاں ہیں جن کی وجہ سے اپنی تمام تر خوش نمائیوں کے باوجود سیاسی جماعتیں اور نظام جمہوریت ایشیا میں کہیں بھی عوام کی فلاح و سلامتی کا ضامن نہیں بن سکا۔

اگر ہم حکمرانی کے جمہوری ڈھانچے (DEMOCRATIC PATTERN) کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ:

۱۔ سیاسی جماعتیں اپنی ممبری کے لئے کم سے کم MINIMUM معیار مقرر کریں۔

۲۔ قوم کی خدمت گزاری کی ایسی اسکیم تیار کریں جو اپنا یہ متبادل بھی رکھتی ہو کہ اقتدار حاصل نہ کر سکنے کی صورت میں عوام کی خدمت کس طرح کی جائے۔

۳۔ حکومت پر تنقید حکومت کو بدنام کرنے کی خاطر نہ کی جائے بلکہ صرف اسے سیدھے راستے پر چلانے کی خاطر کی جائے۔

۴۔ عوام کو حق طلب کرتے وقت فرض ادا کرنے کی بھی تعلیم دی جائے۔

۵۔ اپنا وقت اور اپنے وسائل ایجی ٹیشن اور ہنگامہ پروری پر صرف کرنے کے بجائے ملک کے مسائل کو بدقت نظر سمجھنے اور ان کا حل دریافت کرنے پر اور ان مسائل کو حل کرنے کے لئے متبادل قیادت تیار کرنے پر صرف کیا جائے تاکہ اگر کبھی حکومت ہاتھ میں آجائے تو اسے عمدگی کے ساتھ چلایا جا سکے اور نہ آسکے تو ایک تعمیری حزب اختلاف کا کردار انجام دیا جا سکے۔

۶۔ حزب اختلاف کی دوسری ہم عصر جماعتوں کو گوارہ کرنے کا حوصلہ پیدا کیا جائے۔ انہیں گوارہ کرنے کا کم سے کم اتنا حوصلہ ضرور ہو جتنا کسی دکاندار میں کسی پڑوسی دکاندار کے لئے ہوتا ہے اور ان پر دشنام طرازی سے گریز کیا جائے۔

۷۔ اور سب سے آخری مگر نہایت اہم کام یہ ہے کہ صحیح و غلط اور حق و ناحق کا معیار خدا کی کتاب اور رسول کی سنت کو مانا جائے دست شماری کو معیار حق نہ مانا جائے۔

وطن عزیز کی حقیقی خدمت کے لئے ان شرائط کی تکمیل از حد ضروری ہے۔

Marfat.com

باب چہارم

پاکستان ناگزیر تھا

مشرقی پاکستان کے سقوط کا سانحہ رونما ہونے کے بعد یکایک قیام پاکستان کے جواز کے بارے میں دلوں میں اشتباہ کے کانٹے چبھنے لگے اور اس سوال پر جگہ جگہ مجلسی بحثیں چھڑنے لگیں کہ کیا پاکستان کا قیام ایک سیاسی غلطی تھا؟ یہ ملک مسلمانوں کے ایک عاجلانہ یا جذباتی فیصلے کے نتیجے میں وجود میں آیا؟ دو قومی نظریہ ایک فاسد و باطل نظریہ تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس بحث میں بڑھ چڑھ کر ایسے لوگ بھی حصہ لینے لگے جنہیں پاکستان سے کبھی کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا تھا جنہوں نے اس ملک کے طفیل ایسی ایسی نعمتیں اور سرافرازیاں حاصل کی تھیں جنکا اس سے قبل وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مہاجر بجا طور پر وساوس و تشویش میں مبتلا ہوئے کیونکہ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔ مشرقی پاکستان میں، اس کے سقوط کے نتیجے میں برباد ہونے والے مسلمان زیادہ تر مہاجر ہی تھے لہٰذا ملک کے اس حصے میں رہنے والے مہاجروں کو بھی اپنا انجام بھیانک نظر آنے لگا۔ جو لوگ علاقائی قومیتوں کے نظریئے سے مسحور تھے یا جو بالعقیدہ پاکستان کے مخالف تھے، انہیں اس ملک کے اساسی نظریات کے خلاف شبہات پیدا کرنے کا عدیم النظیر موقع ہاتھ آگیا اور انہوں نے اس کے خلاف بے اعتمادی کو خوب خوب پھیلایا۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟

اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرقی پاکستان کے "سقوط کی جنگ" میں پاکستان، اپنے اکابر کی بدخواہیوں اور بے تدبیریوں کی وجہ سے ہار گیا۔ اس ہار سے ملک کے باشندے سخت دل شکستہ ہوئے۔ دل شکستہ انسان پر ہر مخالفانہ پروپیگنڈے کا بہت جلد اثر ہو جایا کرتا ہے لہٰذا دشمن کے ذرائع ابلاغ نے اس زمانے میں پاکستان اور اس کے نظریہ اساسی کے خلاف جو کچھ ہرزہ سرائی کی وہ ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ افراد کے دلوں میں بھی اترتی چلی گئی۔ اس کے لئے پہلے سے بڑی منظم تیاری کی گئی تھی۔ پاکستان کو دولخت کرنے کے لئے "دو قومی نظریئے" کے خلاف دنیا بھر میں پرزور

Marfat.com

پروپیگنڈا کرکے پاکستان کے نظریاتی جواز کے خلاف نہایت مسموم عالمی فضا پیدا کی گئی۔ پاکستان کا امیج اتنا خراب کیا گیا کہ یہ ملک نفرت کی علامت بن گیا اور پاکستانی ہونا گالی سمجھا جانے لگا۔ جب اس قسم کی فضا تیار کر لی گئی تو اس ملک کو بزورِ قوت دو ٹکڑے کر دیا گیا۔ اسے دو ٹکڑے کرنے والوں نے بزعمِ خود دعویٰ کیا کہ "دو قومی نظریئے کو خلیج بنگال میں دفن کر دیا گیا ہے"[۱]۔ پاکستان کی شکست خوردہ اور مضمحل رائے عامہ اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور اس کے دلوں میں دو قومی نظریئے کے خلاف شبہات کے کانٹے چبھنے لگے۔

سقوط کے بعد اس ملک میں قائم ہونے والی حکومت نے بھی پاکستان کے نظریۂ اساسی کے علی الرغم کچھ انوکھی قسم کی باتیں کہنی اور کچھ انوکھے قسم کے کام کرنے شروع کر دیئے۔ کہا جانے لگا کہ پاکستان چار صوبوں کا وفاق ہے۔ یہاں چار قومیں بستی ہیں۔ ہماری تہذیب کے ماخذ یہاں کے کھنڈرات ہیں وغیرہ وغیرہ۔ کالجوں، یونیورسٹیوں اور جہازوں کے نام زمانہ جاہلیت کی اقوام اور آثار کے نام پر رکھے جانے لگے اور قوم کا ذہنی تعلق دھرتی پرستی کے نظریات سے جوڑا جانے لگا یعنی اس نظریئے کے ساتھ جو نظریۂ پاکستان کی عین ضد ہے اور جس کا رخ اکھنڈ بھارت کی منزل کی طرف ہے۔

اگر ۱۹۷۱ء کی جنگ پاکستان نے ہاری نہ ہوتی تو اس قسم کی ذہنی شکست خوردگی ہرگز پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ قبل ازیں ۱۹۶۵ء کی جنگ کے اثرات مابعد کی نظیر موجود ہے۔ اس جنگ میں پاکستان نے بھارت کو فتح حاصل نہ ہونے دی تھی بلکہ اس کا پامردی سے مقابلہ کرکے اسے مصالحت پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کا اثر پاکستانی قوم پر جذبۂ فتح مندی کی صورت میں نمودار ہوا تھا۔ اپنی پاکستانیت پر فخر کیا جانے لگا تھا اور احساسِ فتحمندی اس قدر طاری رہا کہ ۱۹۷۱ء میں جنگ کے آثار نمودار ہوتے تو قوم نے "دلی چلو" کا جراتمندانہ نعرہ بلند کیا تھا مگر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں پاکستان کی شکست نے قوم کو ذہنی طور پر بھی شکست خوردہ بنا دیا۔

اب پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کا طوفان تھم چکا ہے مگر اس طوفان نے ذہنی سلامت روی اور نظریۂ پاکستان پر ایقان کی چولیں ہلا ڈالی ہیں۔ اس کی درستگی اور استحکام از حد ضروری ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟

---

[۱] مشرقی پاکستان کو پاکستان سے بزورِ قوت علیحدہ کر دینے کے بعد یہ دعویٰ بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے کیا۔

Marfat.com

اس کے لئے ہمیں پاکستان کے قیام کو اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھنا ہوگا۔ اگر ہم برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کے پس منظر میں قیام پاکستان کے واقعے کو دیکھیں تو ہمیں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا۔

برصغیر میں جب تک مسلمان حکمران رہے، مسلمانوں کو کسی قسم کا خوف و اندیشہ لاحق نہ ہوا مگر انگریزوں کی حکمرانی قائم ہوتے ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین نہایت شدید قسم کی آویزش شروع ہو گئی جو انگریزوں کے پورے ڈیڑھ سو سالہ دور حکومت میں جاری رہی۔ یہ اس قدر ہمہ جہت اور شدید تھی کہ ان دونوں اقوام کے مابین بقائے باہمی ناممکن بن گئی۔ پاکستان کا مطالبہ اسی آویزش کے بطن سے نمودار ہوا۔

اس پس منظر میں پاکستان کا مطالبہ اپنی اصل اور روح کے اعتبار سے ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ نہ تھا بلکہ بحیثیت قوم برصغیر کے مسلمانوں کے تشخص کو ہندوؤں کی دست برد سے بچانے کی ایک تدبیر تھا۔ ہندوؤں کی دست برد سے بچانے کا مسئلہ اس وجہ سے پیدا ہوا کہ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی جملہ اقلیتوں کے حقوق ان کی مرضی کے تابع ہوں۔ یہ نہایت خطرناک خواہش تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں اور دیگر اقلیتی اقوام کے قومی تشخصات ہندوؤں کی مرضی پر منحصر ہو کر رہ جائیں۔ مسلمان چونکہ ہندوستان کی سب سے عظیم الشان اقلیت تھے اور ان کا جداگانہ قومی تشخص خالص مذہبی کے علاوہ تہذیبی بھی تھا اس لئے ہندوؤں کے اس نوع کے عزائم کے خلاف سب سے زیادہ بے اطمینانی انہی کے دلوں میں پیدا ہوئی۔

تاہم ہندوؤں کے ان عزائم کے خلاف بے اطمینانی کے باوجود مسلمانوں نے تقریباً ایک صدی تک کوشش کی کہ ان کے ساتھ مفاہمت کی کوئی ایسی صورت نکل آئے جس سے دونوں قومیں ہندوستان میں امن و عافیت کے ساتھ زندگی گزار سکیں اور دونوں کا جداگانہ قومی تشخص بھی برقرار رہ سکے۔ یہ کوشش سر سید احمد خان سے لے کر قائداعظم تک اپنے اپنے وقت کے تمام مسلمان اکابر نے جاری رکھی مگر اس پورے عرصے میں ہندوؤں کے رویئے نے ثابت کر دیا کہ ہندو مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کو برقرار رہنے دینے پر تیار نہیں۔ وہ انہیں شدھی بنا کر مٹا ڈالنا یا ایک اچھوت قوم بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ انگریزوں نے بھی مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی طرفداری کی پالیسی

Marfat.com

اختیار کی اور کوشش اس امر کی جانے لگی کہ خوشحالی اور معاشی ترقی کے راستے مسلمانوں پر تنگ کر دیئے جائیں۔ چنانچہ تعلیم، تجارت اور دیگر معاملات میں مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ نظرانداز کیا جانے لگا۔

مسلمانوں نے ان شعبوں میں اپنے تحفظ کے لئے خود اپنے وسائل سے جدوجہد شروع کر دی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ اس کے قیام کا مقصد ایک طرف مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخص کی حفاظت اور دوسری طرف معیشت کے میدان میں ہندوؤں کی مسابقت کرنا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی اپنی روح کے اعتبار سے ایک قسم کی تحریک پاکستان تھی۔ اسی طرح سے ہندوستان بھر میں مسلمانوں کے اسلامیہ کالجوں اور اسلامیہ اسکولوں کا قیام اپنی اصل اور روح کے اعتبار سے پاکستان کی تحریکیں تھا۔ زیادہ بڑے پیمانے پر اس نوع کی کوششیں بنگال اور سندھ میں دیکھنے میں آئیں جہاں مسلمانوں نے ہندوؤں کے تسلط کے خلاف تحفظ حاصل کرنے کی غرض سے بنگال کو مسلم اکثریتی بنگال (موسوم بہ مشرقی بنگال) اور ہندو اکثریتی بنگال میں منقسم کرایا اور سندھ کے مسلمانوں نے اپنے صوبے کو بمبئی سے علیحدہ کرایا۔

اس پورے عرصے میں آزادی کی جنگ جاری رہی جس میں مسلمان بھی برابر شریک رہے مگر آزادی کی منزل جیوں جیوں قریب آتی گئی مسلمانوں کو ہندوؤں کی طرف سے خطرہ بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ایسے اہم واقعات رونما ہوئے جنہوں نے ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کی مفاہمت کے تمام امکانات معدوم کر دیئے اور مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کے تحفظ کے لئے ملک کی تقسیم کو واحد اور آخری چارۂ کار بنا دیا۔

ان اہم واقعات میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ مستقبل میں آزاد ہونے والے ہندوستان کے سیاسی نظام کے لئے انڈین نیشنل کانگریس نے اس امر کے باوجود کہ اس وقت تک ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت تھی، جب اپنا دستوری خاکہ موسوم بہ نہرو رپورٹ پیش کیا تو اس میں وحدانی طرز حکومت کا نقشہ پیش کیا گیا جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ ہندو مستقل بالذات سیاسی اکثریت ہوں گے اس کے برعکس مسلمان اور دیگر اقوام مستقل بالذات اقلیتیں ہوں گی اور یہ اقلیتیں اپنے جملہ معاملات میں ہمیشہ ہندوؤں کی مرضی کے تابع رہیں گی یہاں تک کہ ان کا جداگانہ قومی وجود بھی ہندوؤں کی مرضی پر منحصر ہوگا۔

دوسرا اہم واقعہ یہ ہوا کہ آزاد ہندوستان کے لئے جو تعلیمی نظام بنایا گیا اور جو وارد ھا اسکیم کے نام سے مشہور رہے، اس میں ایک ایسا تعلیمی نظام تجویز کیا گیا جو اقلیتی مذاہب کی جداگانہ قومی حیثیت کو بتدریج تحلیل کر کے انہیں ایک دھرتی پرست قوم بنا دیتا۔

ان واقعات کے دوران مسلمانوں کو زبردست شدھی کرنے کی، مذہب اسلام کی صورت مسخ کرنے کی، آنحضرت کی توہین کرنے کی، مسلمانوں کی عبادات میں خلل ڈالنے کی اور مذہبی آزادی میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی جو منظم تحریکیں چلائی جاتی رہیں، وہ ان کے علاوہ تھیں مگر مذکورہ بالا دونوں باتیں ایک ایسی جماعت کے ارادوں کا عکاس بن کر سامنے آئی تھیں جو انگریزوں کے جانے کے بعد تخت و تاج کی وارث بننے والی تھی لہذا اس امر میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ گیا تھا کہ آزاد ہندوستان میں مسلمان بحیثیت مسلمان پھل پھول نہیں سکیں گے۔ یہی وہ تلخ حقیقت تھی جس کے بطن سے تقسیم ہند کا نظریہ تولد ہوا اور جس نے پاکستان کو مسلمانوں کا ماعد چارہ کار بنا دیا۔

پاکستان مسلمانوں کی اتنی ٹھوس ضرورت بن گیا کہ ہر صوبے کے مسلمان اس کے لئے اپنے اپنے مقدور کے مطابق قربانیاں دینے اور ایثار کرنے پر تیار ہو گئے یہاں تک کہ ہر قسم کے گروہی مفاد کو اس ضرورت کے تابع کر دیا۔ اسی ضرورت کی خاطر پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں نے اپنے اپنے صوبوں کو کٹوایا، اسی ضرورت کی خاطر سندھ کے مسلمانوں نے لاکھوں مہاجروں کو اپنے ہاں جگہ دی، اسی پاکستان کی خاطر سرحد کے مسلمانوں نے اپنی نمائندہ حکومت کو تخت سے اتارا اور اسی ضرورت کے تحت ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں نے یہ جاننے کے باوجود کہ انہیں ہندوستان میں ہی رہنا ہے، پاکستان بنانے میں حصہ لیا۔

اس نوع کی آویزش اور اس کے بطن سے جنم لینے والا دو قومی نظریہ کچھ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہی تخصیص نہیں۔ اگر ہم اقوام عالم پر نگاہ ڈالیں تو دیکھیں گے کہ جہاں جہاں بھی اقلیتیں اکثریت کی نگاہ میں اعدادی قوت رکھتی ہیں وہاں دو قومی کشمکش نمایاں ہے۔ آپ اس بات کو سمجھنے کے لئے مثال کے طور پر صرف ایسے ممالک پر نگاہ ڈالیں جہاں مسلمان اعدادی قوت رکھنے والی اقلیت ہیں مثلاً اریٹیریا (ایتھوپیا) فلپائن، برما، قبرص اور نائیجیریا وغیرہ میں۔ ان میں سے ہر جگہ دو قومی کشمکش جاری ہے اور ان تمام ممالک میں اپنے قومی تشخصات کے تحفظ کی خاطر مسلمانوں کے لئے ناگزیر ہو گیا ہے کہ وہ جداگانہ ریاست قائم کریں۔

Marfat.com

اسی کا نام دو قومی نظریہ اور اسی کا نام تحریک پاکستان ہے۔

مختصر یہ کہ یہ تھے، وہ حالات جنہوں نے پاکستان کا قیام ناگزیر بنا دیا۔ پاکستان کا قیام برصغیر کے مسلمانوں کے علاوہ عالم اسلام کی بھی ایک ضرورت تھا کیونکہ گزشتہ دو صدیوں سے بحیثیت قوم مسلمان سخت یاسیت اور شکست خوردگی میں مبتلا تھے۔ پاکستان دنیا بھر کے مسلمانوں اور مسلمان ملکوں کے لئے ایک سہارا، ایک اخلاقی تائید اور ایک رہنما بن کر نمودار ہوا اور جس سے تمام عالم اسلام نے حوصلہ حاصل کیا۔ پاکستان نے عرب ممالک کو عرب قوم پرستی کے حصار سے نکالا اور پورے عالم اسلام سے انہیں بغل گیر کیا۔ یہ پاکستان کے وجود کی برکت ہے کہ آج مسلم ممالک اپنا ایک مضبوط و متحد سیاسی وجود رکھتے ہیں۔

عالم اسلام میں یاسیت کی وہ کیفیت کیا تھی جس کے دوران پاکستان وجود میں آیا؟ اسے دقیق النظر محقق ڈاکٹر ظفر اسحق انصاری نے بڑی جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"گزشتہ صدی کے اوائل میں اگر ہم عالم اسلامی کا جائزہ لیں تو ہمیں پوری اسلامی دنیا بے بسی، پس ماندگی، زبوں حالی اور اخلاقی پستی کا ایک دردناک مرقع نظر آتی ہے۔ اٹھارھویں صدی سے اسلامی دنیا کے بعض حصوں میں دینی بنیادوں پر مسلمانوں کی اصلاح کی بعض بڑی جاندار تحریکیں اٹھیں لیکن ان تحریکوں کے باوجود مسلمان برابر انحطاط اور زوال کی طرف لڑھکتے رہے۔ انیسویں صدی میں یورپی ممالک نے اسلامی ممالک پر تسلط حاصل کرنا شروع کر دیا اور یکے بعد دیگرے مسلمان ممالک یورپی ممالک کے محکوم بننے لگے۔ ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی ٹمٹماتی ہوئی شمع گل ہو گئی۔ اسلامی تہذیب کے مصر جیسے مضبوط قلعے پر دشمن کا قبضہ ہو گیا۔ الجزائر اور تیونس پہلے ہی غیروں کے قبضے میں جا چکے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے علاقوں پر قبضے کا عمل تیز ہو گیا۔ غرضیکہ جس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھئے مسلمانوں کی حالت ابتر اور زبوں نظر آتی ہے اور مستقبل پر ایک ہولناک تاریکی چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔"

بیسویں صدی کے آغاز میں یہ صورت حال اور بھی زیادہ افسوسناک ہو گئی تھی۔ مسلمانوں کی ملی شیرازہ بندی کا ایک نشان باقی تھا۔ سلطنت عثمانیہ — لیکن اس کی حالت بھی بستر مرگ پر پڑے ہوئے ایک بیمار کی سی تھی جس کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ سلطنت عثمانیہ میں طرح طرح کے رخنے پڑ چکے تھے اور اس کا نظام اندر سے مختل ہو چکا تھا۔ اپنے دشمن کے مقابلے میں طاقت کی کمی اور نظم ونسق کی ابتری کے علاوہ سلطنت کے متعدد اہم عناصر میں نیشنلزم نے سلطنت کے بین الملی نظام کے خلاف بغاوت کا جذبہ بیدار

Marfat.com

کر دیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم اس مرد بیمار کے لئے پیغام مرگ ثابت ہوئی اور جب یہ جنگ ختم ہو گئی تو مسلمانوں نے خود کو انتہائی المناک بے بسی کی حالت میں پایا۔ سلطنت عثمانیہ کے ہاتھ سے تمام غیر ترکی علاقے نکل گئے اور خود ترکی علاقے کا ایک مختصر سا حصہ ترکوں کے پاس رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب خدا کی اس زمین پر اس آسمان کے نیچے مسلمانوں کے لئے آزادی اور عزت کی زندگی بسر کرنے کا کہیں موقع نہیں رہا۔"

ایسے نازک دور میں مصطفےٰ کمال ترکوں کی قیادت اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں۔ اس تاریک ترین دور میں ترکوں کا جذبۂ غیرت بیدار ہوتا ہے۔ ان کی ملی زندگی میں صدیوں تک اسلامی حمیت کا جو ذخیرہ جمع ہوتا رہا ہے وہ ان کی مدد کرتا ہے اور ترکوں کی شجاعت نہ صرف ان کی سیاسی آزادی کا موجب بنتی ہے بلکہ عالم اسلامی میں ایک نئی اور زبردست حرکت کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد آزادی کا جذبہ پوری دنیا میں شدت سے منفعل ہو جاتا ہے اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ تقریباً پوری دنیا مغرب کے سیاسی اقتدار سے چھٹکارا پا چکی ہے[1]

"لیکن ایک طرف اگر مصطفےٰ کمال کی قیادت میں ترکوں نے سیاسی آزادی کی جنگ جیت کر ساری دنیا کے مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کر دیا تو دوسری طرف وہ مسلمانوں کے لئے ایک زبردست فہنی خسارے کا باعث بھی بنے۔ مصطفےٰ کمال بلاشبہ ایک بہادر سپاہی تھے مگر دوسری طرف وہ نہایت معمولی اور سطحی ذہن کے آدمی تھے...... ان میں اجتہادی بصیرت نہ تھی لہٰذا انہوں نے اپنی قوم کے مسائل کا حل اجتہاد کے بجائے تقلید قرار دیا۔ وہ یورپ کی قوموں اور ان کی تہذیب سے اس درجہ متاثر اور مرعوب تھے کہ ان کے نزدیک ترکوں کی نجات کا راستہ صرف ایک تھا۔ یورپ کی ترقی یافتہ اقوام کی کورانہ نقالی اور ان کی اندھی تقلید..."

"فکر و نگاہ کی اس سطحیت کی بنا پر اس صدی کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے دور کے آغاز میں مسلمانوں نے ایک ایسی منزل کی طرف لپکنا شروع کر دیا جو ان کی منزل نہ تھی اور ایک ایسا راستہ اختیار کیا جس کے بعد ان کی امتیازی حیثیت، ان کی قومی خودی اور ثقافتی خوداعتمادی ختم ہو جاتی ہے اور ان کے

---

[1] پہلی جنگ عظیم کے بعد مسلمانوں کی سیاسی زبوں حالی کی کیفیت یہ تھی کہ تمام کے تمام مسلمان ممالک اہل مغرب کی غلامی میں جا چکے تھے۔ صرف دو مسلمان ممالک غلامی کے تسلط میں جانے سے رہ گئے تھے اور وہ سعودی عرب اور افغانستان تھے۔ بحمد اللہ آج آزاد اسلامی ممالک کی تعداد ۴۲ ہے۔ مصنف

Marfat.com

لیے، دنیا میں کسی تخلیقی کارنامے کا امکان باقی نہیں رہتا کیونکہ تقلید، تخلیق کی عین ضد ہے اس کوتاہ بینی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی میں یورپ کے سیاسی تصورات کو اندھا دھند اپنایا جانے لگا۔ چونکہ یورپ دین اور سیاست کی علیحدگی کا قائل ہے لہٰذا ترکی کے نام نہاد مصلحین نے قوم کی شدید ناراضگی اور مخالفت کے باوجود خلافت کو ختم کر دیا اور ترکی کو ایک لادینی ریاست قرار دے دیا۔۔۔۔۔"

"ترکوں کی تلوار صدیوں تک عالم اسلام کی مدافعت کرتی رہی ہے۔ سلطنت عثمانیہ جو خلافت عباسیہ کے سقوط کے بعد مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت اور ان کے اتحاد اور شیرازہ بندی کا نشان تھی، اس کا مرکز بھی ترکی ہی تھا لہٰذا مغربی تہذیب کے آگے ترکوں کے سرنگوں ہو جانے سے پوری اسلامی دنیا پر بڑے اہم اثرات پڑے۔۔۔۔۔۔ اگر انقلاب ترکی کے بعد سے دوسری عالمگیر جنگ کے اختتام تک اسلامی دنیا کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں یہ صاف نظر آ جائے گا کہ بعض دوسرے عوامل کے ساتھ مل جل کر ترکی کی قائم کردہ مثال نے اکثر مسلمان ممالک کو اجتہاد کے بجائے مغرب کا راستہ اختیار کرنے پر ابھارا۔ ایران میں جو ترکی کی طرح یورپ کی سیاسی محکومی سے محفوظ رہا یہی ہوا۔ مصر میں بھی الدین للہ والوطن للجمیع (دین اللہ کے لئے ہے اور وطن سب کے لئے) کا نعرہ بلند ہوا اور بعض لوگوں نے حالات کو سازگار پاکر فرعونی تہذیب کے احیاء کی کوشش کی۔ غرضیکہ جوں جوں اسلامی ممالک اپنی سیاسی آزادی کی منزل سے قریب آتے جا رہے تھے، ان کی فکر و نظر کا سانچہ بدلتا جا رہا تھا اور ان کے سامنے اپنی زندگی کی تعمیر کا کوئی ایسا نقشہ نہ رہ گیا تھا جسے وہ فی الواقعی اپنا کہہ سکیں، جو دوسروں سے مستعار نہ لیا گیا ہو۔ مسلمان قوموں کے سامنے اگر کوئی راہ تھی بھی تو وہی ایک پٹی پٹائی راہ تھی۔ یورپ کی تقلید کی راہ۔ اپنے جوہر کے تخلیقی اظہار کی تمنا ان میں سے اکثر لوگوں کے ذہن سے محو ہو چکی تھی۔۔۔۔۔۔ ہمتیں پست، ذہن مفلوج اور نگاہیں تقلید کی وجہ سے بصیرت کے نور سے محروم ہو چکی تھیں۔"

"اس پس منظر میں پاکستان کی تحریک پر ذرا غور فرمائیے۔ سارے اسلامی ممالک اپنی قومی جدوجہد میں مشغول ہیں۔ وہ اپنی گردن کو بیرونی سامراج کے طوق وسلاسل سے آزاد کرانے کے لیے جہاد کر رہے ہیں لیکن اس ساری جدوجہد کی فکری بنیاد کیا ہے؟ "مصر مصریوں کے لیے" ایران ایرانیوں کے لئے وغیرہ۔ یہ جدوجہد ظاہر ہے کہ اسلام کے خلاف نہ تھی لیکن ایجابی طور پر اس جدوجہد میں اسلام کو بنیادی حیثیت حاصل نہ تھی۔۔۔۔۔"

Marfat.com

"ان حالات میں اسلامیانِ ہند کی قومی تحریک ایک واضح نصب العین مقرر کرکے اس کے لئے جدوجہد شروع کرتی ہے۔ یہ نصب العین کیا تھا؟ آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام۔ مسلمانانِ ہند کے لئے" اس بنیاد پر کہ وہ مسلمان ہیں، ایک آزاد قومی وطن کا قیام کیوں؟ اس لئے کہ ہماری قومیت کی اساس نہ اتحادِ نسل پر ہے، نہ اتحادِ مولد و مسکن پر نہ اشتراکِ زبان پر۔ ہماری قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے۔ ہماری قوم اور اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی اسلام نے کی ہے اور اسلام چونکہ پوری زندگی سے دلچسپی لیتا ہے لہٰذا مسلمانوں کے قومی امنگوں کی تکمیل اس وقت ہو سکتی ہے جب کہ ان کے پاس ایک ایسا وطن موجود ہو جہاں وہ انفرادی زندگی کے بارے میں اسلام کے انفرادی پروگرام ہی کو نہیں اس کے اجتماعی پروگرام کو بھی عملی جامہ پہنا سکیں۔ آج سے تیس بتیس سال قبل جبکہ اسلامی دنیا میں خود مغربی سامراج کے خلاف سخت ترین جنگ کرنے والے بھی مغربی تہذیب کی بنیادوں اور مغرب کے پیش کردہ سیاسی تصورات کو چیلنج کرنے کی جرأت نہ رکھتے تھے، اس برصغیر کے مسلمانوں نے پوری خود اعتمادی، پورے ایمان اور شرح صدر کے ساتھ ان اصولوں کو کھلا قرار دے کر حقارت کے ساتھ رد کر دیا اور زندگی کے ہر گوشے میں اسلامی تعلیمات کے نفاذ کے لئے ایک علیحدہ ریاست کا قیام ناگزیر سمجھا۔ اس طرح دین و سیاست کی علیحدگی اور سیکولرزم و نیشنلزم ان دونوں پر ایک ساتھ ضرب لگائی۔ ان کے بجائے اسلامی ریاست اور امتِ مسلمہ کے تصورات کو رہنمائی کا اصول قرار دیا گیا اور یہ خدا کی تائید اور توفیق کا کرشمہ ہے کہ حالات کی نامساعدت کے باوجود یہ تحریک کامیاب ہوئی اور ان اصولوں پر ایک عظیم ملک وجود میں آگیا۔......"

قیامِ پاکستان کے ان تمام اسباب و عوامل کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ اس ملک کے قیام کی جنگ روٹی کی خاطر یا مادی ترقیوں کی خاطر نہ تھی بلکہ یہ اصلاً ایک تہذیبی جنگ تھی جو ہندوؤں کے خلاف لڑی گئی۔ بلاشبہ اس جنگ میں اپنی تہذیب کے تحفظ کے علاوہ روٹی اور مادی ترقیوں کے حصول کو بھی دخل تھا کیونکہ یہ چیزیں بھی انسانی زندگی کے لوازم میں شامل ہیں مگر ان کا دخل ثانوی حیثیت میں تھا۔ روٹی اور مادی ترقیوں کے تحفظ کا عنصر بھی اس بنا پر شامل تھا کہ مسلمانوں کو ان لوازم کے حصول میں ہندوؤں سے خطرہ اپنے مسلمان ہونے کی بنا پر لاحق تھا ورنہ مستقبل میں آزاد ہونے والے ہندوستان میں روٹی کا خطرہ تو اچھوتوں کو لاحق نہ تھا، مسلمانوں میں کون سا کمی تھی

Marfat.com

جو انہیں لاحق ہوتا۔ ان میں کمی صرف اس اعتبار سے تھی کہ مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ ایک تہذیبی طبقہ تھے جن کا وجود ہندو گوارہ کرنے کو تیار نہ تھے، جنہیں وہ فنا کر دینا چاہتے تھے یا اپنا تابع مہمل بنا کے رکھنا چاہتے تھے۔ یہ صورت حال مسلمانوں کے ملّی وجود کے لئے ایک چیلنج تھی جس کے بارے میں ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ——— خیبر سے چاٹگام تک ——— مسلمان زعماء کی سوچ ایک تھی۔ وہ سوچ یہ تھی کہ مسلمانوں کے تحفّظ کی تدبیر کیا ہو؟ اس مسئلے میں قیام پاکستان کے علاوہ دوسرے حل بھی زیرِ غور آئے۔ یہ حل عرصے تک زیرِ غور رہا کہ ملک ایک ہی رہے۔ اس میں مسلمانوں کے لئے آئینی تحفظات حاصل کئے جائیں مگر کسی نے بھی اس مسئلے میں علاقائی نقطۂ نظر اپنانے کی نہیں سوچی۔ وجہ یہ تھی کہ سب کا نقطۂ نظریہ تھا کہ مسلمان ایک ملّتِ واحدہ ہیں۔ مختلف علاقائی منطقوں یا صوبوں میں منقسم ہونے کے باوجود ان کی تہذیب ایک ہے۔ وہ سب کے سب ایک مذہب کے ماننے والے ہیں۔ ان کے جینے اور مرنے کا طریقہ ایک ہے۔ وہ حرام و حلال کا ایک سا معیار رکھتے ہیں۔ سود خوری، جوئے، سوّر کے گوشت، مردار خوری اور غیر ذبیحہ کو یکساں طور پر حرام سمجھتے ہیں۔ عدل گستری، صلہ رحمی، ایثار و قربانی اور ہمسایہ نوازی کو عبادت سمجھتے ہیں۔ جھوٹی گواہی، یتیم کا مال غصب کرنا، فساد انگیزی، کنبہ پروری، بغض و حسد کو گناہ سمجھتے ہیں۔ تقسیمِ اموال، وراثت، عدّت اور رضاعت کے امور میں ایک سے قانون پر عمل کرتے ہیں۔ ماں باپ کی اطاعت، بزرگوں کی فرمانبرداری، بچوں کے ساتھ شفقت کو عبادت سمجھتے ہیں۔ سلام و کلام کے ایک سے آداب رکھتے ہیں۔ مہمان نوازی کو مذہبی فریضہ گردانتے ہیں۔ چوری، ڈاکہ زنی، اغوا، آبروریزی، تہمت، غیبت اور عیب جوئی کو گناہ سمجھتے ہیں۔ یہی سب کسی تہذیب کے بنیادی لوازم شمار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ جو لوازم و ارکان ہیں وہ فروعات میں شمار ہوتے ہیں۔ فکر و عمل کی اسی یکسانیت کی برکت ہے کہ اسلام کے خلاف کوئی بری بات سننے پر دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہر مسلمان کا دل ایک سے انداز میں تڑپتا اور کسی اچھی خبر پر ایک انداز میں انبساط و فرحت محسوس کرتا ہے۔ جنگ بلقان میں ترکوں کے ہارنے پر یا ترکی خلافت کے خاتمے پر یا بیت المقدس کے ہاتھ سے نکل جانے پر یا خانہ کعبہ پر گمراہوں کے قبضے کی خبر پر خیبر سے چاٹگام تک ہر مسلمان کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اسلام مسلمانوں کا صرف فکر و عقیدہ نہیں بلکہ ان کا اجتماعی مرکزِ عشق بھی ہے۔ حقیقی مرکزِ عشق جس سے وابستگی تمام قسم کے احساس سود و

Marfat.com

زیاں سے بے نیاز ہوتی ہے جس سے وابستگی کے شوقِ اظہار میں دنیاوی زیاں و خسران کا امکان زیادہ اور نفع کا امکان بعید تر ہوتا ہے۔ مسلمان اس کے لئے اپنی گردنیں کٹوانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جسے ہر شخص، بشرطیکہ اس ملک کا کوئی دھرتی پرست دانشور نہ ہو[1]، بہ چشمِ سر دیکھ سکتا ہے۔

یہ کسے معلوم نہیں کہ سید احمد شہید نے ہندوستان بھر کے مسلمانوں کو اسلام کے لئے جان دینے کی خاطر اکٹھا کیا تھا، مالی منفعتوں کی خاطر نہیں۔ اور اپنے گھروں سے ہزاروں میل دور سرحد کے کہساروں میں پہنچ کے انہوں نے اسلام کی خاطر گردنیں کٹوائی تھیں۔ ریشمی رومال کی پُرخطر تحریک اسلام کی خاطر ہی چلائی گئی۔ غازی علم الدین شہید نے اسلام کی سربلندی کی خاطر دار و رسن کا استقبال کیا ورنہ شردھانند کے قتل کا ارتکاب اس نے اس کا مال و زر چھیننے کی خاطر نہ کیا تھا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران البدر اور الشمس کے بنگالی رضاکار اسلام کی سربلندی کی خاطر بنگلہ دیش کے قیام کے خلاف سینہ سپر ہوئے ورنہ ان پر کیا افتاد پڑی تھی کہ وہ اپنے لئے ایک علیحدہ مملکت کے قیام کی مخالفت کریں اور مکتی باہنی کی گولیوں سے اپنے سینے چھلنی کرائیں، اور آج افغانستان کے جیالے مسلمان دنیا کی سب سے بڑی ہمالیائی قوت سے اسلام کی سربلندی کی ہی خاطر لڑ رہے ہیں۔ اسلام عزیز نہ ہوتا تو وہ اپنی بستیوں کو روسی بمباروں کا نشانہ بننے کیوں دیتے؟

بہرکیف! اسلام کے ساتھ مسلمانوں کی اس نوع کی دلی وابستگی بلا لحاظ تفریقِ مسلک ہے۔ ان کے مابین فرق جتنا کچھ بھی ہے وہ اس وابستگی سے بالاتر نہیں بلکہ اس سے فروتر ہے۔ وہ فرق ضمنی اور ذیلی نوعیت کا اور وقتی و ماحولی ضروریات کا تابع ہے۔ یہ فرق بس اسی قسم کا ہے جیسے اس ملک کا کوئی باشندہ اگر افریقہ کے کسی ملک میں چلا جائے تو وہاں کا بود و باش اختیار کر لیتا ہے مگر اپنے مذہب اور

---

[1] حال ہی میں ایک دھرتی پرست دانشور نے جو ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں یہ انکشاف کیا ہے کہ مسلمان اسلام کا نام مالی منفعتیں حاصل کرنے کی خاطر لیتے ہیں اور مہاجرین پر طعنہ زنی کی ہے کہ اسلام سے ان کا لگاؤ مالی مفاد کی خاطر ہے۔ اس نوع کی عامیانہ طعنہ زنی کرتے وقت وہ بھول گئے کہ کلکتہ، بہار، دہلی اور مشرقی پنجاب کے مسلمانوں نے ۴۷-۱۹۴۶ء میں ہندوؤں سے جب سرفروشی کی تو ان کے پاس پاکستان سے وزارتوں اور افسریوں کے تقرر نامے یا مکانوں کے الاٹمنٹ لیٹر نہیں بھیجے گئے تھے۔ وہ سرفروشی صرف اسلام کی سربلندی کی خاطر تھی۔

عقیدے کو تبدیل نہیں کرتا یا اپنی تہذیب کے مذکورہ بالا اساسی لوازم کو تبدیل نہیں کرتا۔ ضمنی و ذیلی نوعیت کا فرق ایک گھرانے کے مختلف افراد کے مابین بھی ہوا کرتا ہے یا کسی قبیلے کے مختلف گھرانوں کے مابین بھی یا کسی نسل کے مختلف قبیلوں کے مابین بھی۔ اس فرق کی بنا پر جدا جدا سیاسی وحدتیں قائم نہیں کی جاتیں۔ اگر ایسا کرنے کی کوشش کی جائے تو باہمی تو ٹ ٹوٹ جاتی ہے۔

یہ تہذیبی وحدت آج بھی اسی طرح باقی ہے جیسی پہلے تھی۔ اس میں مطلقاً کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس دوران کوئی نئی متوازی تہذیب وجود میں نہیں آئی ہے صرف ایک فرق واقع ہوا ہے۔ ہمارے کم نگاہ لیڈروں نے ہماری تہذیبی یکسانیت کے آئینے پر تعصب کی گرد اچھال دی ہے۔ جس سے تہذیبی وحدت کا آئینہ پہلے جیسا مصفیٰ نظر نہیں آرہا ہے۔ اس گرد کو صاف کر دیجئے۔ آئینہ ویسا ہی مصفیٰ نظر آنے لگے گا جیسا ۱۹۴۷ء میں تھا

پاکستان بنا کر مسلمانوں نے اس تہذیب کو فنا ہونے سے بچا لیا جبکہ سرحد کے اس پار اسی دن سے مسلمانوں کی تہذیب کو فنا کرنے کا عمل شروع کر دیا گیا ہے۔ یہ وہاں کے مسلمانوں کی سخت جانی ہے جو اس تہذیب کو فنا کرنے میں مزاحم ہو رہی ہے ورنہ اب تک معلوم نہیں اسے کتنی حد تک مسخ کیا جا چکا ہوتا۔

جہاں تک روٹی کے تحفظ اور مادی ترقیوں کے حصول کا تعلق ہے، اس میں بھی قیام پاکستان کی برکتیں کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد مسلمانوں کی اس آبادی میں جو آج اس مملکت کی حدود میں بستی ہے، تعلیم کی سرح میں جس قدر اضافہ ہوا، صحافت میں، ریڈیو میں، ٹیلی ویژن میں، تجارتی اداروں میں، صنعتوں میں، مواصلات میں، ڈاک و تار میں، انشا پردازی میں، سیاست میں، طبابت میں، انجنیئرنگ میں، کھیل کود میں غرضیکہ ہر شعبہ زندگی میں مسلمانوں کو جتنا آگے بڑھنا نصیب ہوا وہ مسلمانوں کی تخیلاتی پرواز کی حدوں سے بھی زیادہ ہے ہم نے خود اپنا بینکاری نظام قائم کیا اور اس میں عدیم النظیر کامیابی اور وسعت حاصل کی۔ ہم نے اپنی صنعتیں قائم کیں اور اس میں بیشتر اقوام کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ہم نے اپنی ایک فوج بنائی اور اسے دنیا کی بہترین فوج ثابت کر دکھایا۔ ہم نے اپنی یونیورسٹیاں قائم کیں اور ان کے پایۂ علم کو ایک دنیا سے منوایا۔ ہم نے شہر بسائے اور دنیا کے بہت سے ترقی یافتہ ملکوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ہم نے ڈیم اور برج بنائے اور انہیں دنیا بھر کی

Marfat.com

تو مبہ اور کشش کا مرکز بنا دیا۔ ہم نے سائنس داں پیدا کیے اور ان کی علمیت کا دنیا بھر سے لوہا منوایا۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں میں ترقی کی جو رفتار رہی وہ اس کے خاک پا کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ یہ سب کامرانیاں قیام پاکستان کی برکات نہیں تو اور کیا ہیں؟

پاکستان ناگزیر ہے

ہم نے جو کچھ حاصل کیا اسے باقی رکھنے کے لئے اور مزید جو کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں اسے حاصل کرنے کے لئے پاکستان کا باقی رہنا ناگزیر ہے ورنہ جو کچھ ہم حاصل کر چکے ہیں اسے گنوا بھی دیں گے اور مزید خواری و بربادی سے بھی دوچار ہوں گے۔ اسے ایک تمثیل سے بھی بخوبی سمجھا جا سکتا ہے جب کوئی مکان تعمیر کیا جاتا ہے تو اس میں استعمال کی جانے والی لکڑی جنگل کے درختوں سے کاٹ کر لائی جاتی ہے، پتھر پہاڑوں سے توڑ کر لایا جاتا ہے، چونا زمین کے کانوں سے نکالا جاتا ہے اسی طرح سے دیگر لوازماتِ تعمیرات جدا جدا ماخذوں سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ عمارت کے اجزا بن جانے کے بعد ان میں سے ہر جزو اہمیت و سرفرازی حاصل کرتا ہے لیکن ایسی کسی عمارت کو اگر منہدم کر دیا جائے تو اس کے دروازوں کی لکڑی کو اپنے درخت کا دوبارہ جزو بننا نصیب نہیں ہوتا بلکہ وہ چولہے کا ایندھن بنا دی جاتی ہے۔ پتھر کو پہاڑ کی چٹانوں کا جزو بن جانا نصیب نہیں ہوتا بلکہ وہ راہگیروں کے پائے حقارت کی ٹھوکر بن جاتا ہے۔ چونا اپنی کان میں واپس نہیں چلا جاتا۔ بلکہ وہ نابود ہو جاتا ہے ٹھیک اس تمثیل کے بموجب ارضِ پاکستان کو بنانے کے لئے پنجاب، بنگال اور آسام کو تقسیم کیا گیا، لاکھوں ہندو یہاں سے نکالے گئے اور لاکھوں مسلمانوں نے ہندوستان میں آبائی گھروں کو خیرباد کہہ کر یہاں اپنا گھر بسایا، صدیوں پرانی مستبد اور مطلق العنان ریاستوں کو مٹا کر انہیں وجودِ پاکستان کے سیاسی نظام کے ساتھ مربوط کیا گیا۔ ان تمام اجزاء کو باہم ملا کر جسدِ پاکستان کی تشکیل کی گئی۔ اسے باقی رکھنے کے لئے ایک نیا معاشی ڈھانچہ بنایا گیا۔ ایک نیا دفاعی نظام کھڑا کیا گیا، ایک نیا مالیاتی نظام مدوّن کیا گیا، نیا برآمداتی و درآمداتی ڈھانچہ استوار کیا گیا، نئی تجارتی منڈیاں تلاش کی گئی، نئی تجارت گاہیں بنائی گئیں، نئے دوست پیدا کئے گئے اور یہ سب باہم دگر ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط ہیں جس طرح کسی عمارت کے دروازے، چھتیں، بنیاد کے پتھر اور دوسرے حصے مربوط ہوتے ہیں۔ اگر وجودِ پاکستان کو (خدا نہ کرے) توڑ دیا جائے تو منہدم کی جانے والی عمارت کی طرح اس کے اجزاء میں سے کسی کو بھی اپنی سابقہ

Marfat.com

حالت میں واپس جانا نصیب نہ ہوگا بلکہ وہ سب کے سب اسی قسم کے حشر سے دوچار ہوں گے جس طرح کے حشر سے منہدم کی جانے والی عمارت کے دروازے، چوکھٹیں، دیواریں اور اس کے اینٹ و پتھر ہوا کرتے ہیں۔

خدا ہمیں ان اندیشوں کو سمجھنے کی بصیرت عطا فرمائے اور عزیز از جان اس وطن کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ آمین۔

Marfat.com

کتابیات

1. THE CONSTITUTIONAL PROBLEMS OF PAKISTAN.
   SIR IVOR JENNINGS.
2. THE CONTITUTIONS OF THE NATIONS. VOL II.
   PEASLEE.
3. THE BASIC PRINCIPLES COMMITTEE'S REPORT, 1950.
4. THE BASIC PPINCIPLES COMMITTEE'S REPORT, 1952.
5. THE GOVERNMENT OF INDIA ACT, 1935.
6. THE PAKISTAN CONTITUTION, 1956.
7. THE PAKISTAN CONTITUTION, 1962.
8. THE PAKITAN CONSTITUTION, 1972.
9. THE MARTIAL LAW REGULATIONS 1-119, 1969.
10. THE PAKISTAN CONSTITUTION, 1973.
11. THE LEGAL FRAME WORK ORDER, 1970.
12. SELECT MODERN GOVERNMENTS.
    V.D. MOHAJAN & R.R. SETHI, CHAND & CO, NEW DELHI, 1960.
13. THE UNIQUE TRIAL, ABBAS HUSSAIN FAROOQUI (ADVOCATE)

DR. WAHEEDUZ ZAMAN.

15. TOWARDS PAKISTAN.

14. THE STRUGGLE FOR PAKISTAN. DR. I. H. QURESHI.

١٦۔ اکتیس علما کے مرتب کردہ بائیس نکات

١٧۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل۔ مولانا امین احسن اصلاحی

١٨۔ اسلامی ریاست۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ

١٩۔ پاکستان میں آئین کی تدوین اور جمہوریت۔ پروفیسر خورشید احمد

٢٠۔ پاکستان پیپلز پارٹی کا منشور۔ ہفت روزہ نصرت۔ لاہور

٢١۔ تحریک اسلامی نمبر چراغ راہ۔ کراچی

٢٢۔ خلافت و ملوکیت۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

٢٣۔ ١٩٥٢ کی دستوری سفارشات پر اکابر علماء کا متفقہ تبصرہ اور ترمیمات

٢٤۔ فقہ الاسلام۔ علامہ حسین احمد الخطیب المصری

٢٥۔ مارشل لا سے مارشل لا تک۔ سید نور احمد

٢٦۔ میں نے ڈھاکہ کو ڈوبتے دیکھا۔ (کرنل) صدیق سالک

٢٧۔ مخلوط انتخاب کیوں اور کیوں نہیں؟ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مضامین

٢٨۔ جناب اے۔ کے بروہی۔ "اسلام سے مکمل وابستگی کے بغیر پاکستان....." روزنامہ جسارت ٩-١٠-٧٨

٢٩۔ جناب جسٹس (ریٹائرڈ) بی۔ زیڈ۔ کیکاؤس۔ آئین کی دفعہ ٢٤٨ پر تبصرہ۔

روزنامہ جسارت۔ ٢٤-٧-٧٩

٣٠۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔ تحریک پاکستان پر ایک انٹرویو مطبوعہ "تحریک پاکستان"۔

مطبوعہ گورنمنٹ نیشنل کالج۔ کراچی

Marfat.com

۳۱۔ جناب الطاف حسن قریشی ۔ بھٹو کا عہدِ ستم (آئین میں ترمیمات پر تبصرہ) مکتبہ اردو ڈائجسٹ ۔ لاہور

۳۲۔ پروفیسر محمد ایوب قادری ۔ مقدمہ برائے "پاکستان میں آئین کی تدوین اور جمہوریت"۔ مصنفہ پروفیسر خورشید احمد

۳۳۔ ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی ۔ چھ نکات میں کیا ہے ۔ (چار اقساط) جسارت ۲۷ اپریل تا ۳۰ اپریل ۱۹۷۰ء

۳۴۔ ایضاً انتخابات میں اسلام پسندوں کی ناکامی ۔ ایک تجزیہ ۔ جنگ کراچی ۔ ۱۷-۱-۷۱

۳۵۔ ایضاً پیپلز پارٹی کے منشور پر تبصرہ ۔ جسارت ۔ ۲۲-۲-۷۱

۳۶۔ ایضاً نئے دستور میں چھ نکات کا مقام ؟ جنگ کراچی ۔ ۲۷-۲-۷۱

۳۷۔ ایضاً اصل تنازعہ چھ نکات پر نہیں عہدوں کی تقسیم پر ہے ۔ جسارت ۔ ۹-۳-۷۱

۳۸۔ ایضاً پاکستان کو تباہ کرنے کے لئے "بھٹو صاحب کا منصوبہ ۔ جسارت ۔ ۱۲-۳-۷۱

۳۹۔ ایضاً پاکستان کی پیٹھ اور یحییٰ خاں کا خنجر (۲ اقساط) جسارت ۔ ۲۸-۲-۷۱

۴۰۔ ایضاً عبوری آئین بابت ۱۹۷۲ء پر تبصرہ ۔ جسارت ۔ ۲۲-۵-۷۲

۴۱۔ ایضاً مارشل لاء اٹھا لیا جائے گا ؟ جسارت ۱۴-۴-۷۲

۴۲۔ ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری ۔ قیام پاکستان کا تاریخی پس منظر ۔ جسارت ۔ ۲۳-۳-۷۹

۴۳۔ ڈاکٹر ایس معین الحق ۔ تحریک پاکستان پر ایک انٹرویو "تحریک پاکستان" مطبوعہ گورنمنٹ نیشنل کالج ۔ کراچی ۔

۴۴۔ پیر علی محمد راشدی ۔ قرار دادِ لاہور کی توجیہہ ۔ جنگ کراچی ۔ ۸-۵-۷۲

۴۵۔ جناب عبدالشکور اختر ۔ راشدی صاحب نئی نسل پر رحم کھائیں ۔ جسارت ۔ ۲۹-۵-۷۲

Marfat.com

۴۶۔ جناب عبدالباقی بلوچ۔ بلوچستان کے حالات۔ ہفت روزہ لیل و نہار لاہور۔ ۲۸-۱-۷۳ء

۴۷۔ جناب جسٹس (ریٹائرڈ) قدیرالدین احمد کا انٹرویو۔ "تحریک پاکستان" مطبوعہ گورنمنٹ نیشنل کالج۔ کراچی۔

۴۸۔ کرنل ایس۔ جی مہدی   پاکستان ٹائمز لاہور۔

۴۹۔ جناب زیڈ اے سلیری۔ DEATH OF A TRAITOR پاکستان ٹائمز ۲۱-۳-۷۳ء

۵۰۔ جناب محمد صلاح الدین۔ روس کے نئے عزائم۔ ہفت روزہ لیل و نہار۔ لاہور ۲۱-۳-۷۳ء

خصوصی انٹرویو

۵۱۔ وائس ایڈمرل ایس۔ ایم۔ احسن۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کا پس منظر۔ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ۔ لاہور۔ جون ۱۹۷۹ء

۵۲۔ (نواب) اکبر بگٹی۔ بلوچستان کے حالات۔ ہفت روزہ لیل و نہار۔ لاہور۔ ۲۴-۱۲-۷۲ء

۵۳۔ (نواب) اکبر بگٹی۔ بلوچستان کے حالات۔ ہفت روزہ لیل و نہار۔ لاہور۔ ۱۷-۶-۷۳ء

۵۴۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ سقوط مشرقی پاکستان کا پس منظر۔ جسارت۔ ۹-۱۲-۷۲ء

۵۵۔ خان عبدالولی خاں۔ بھٹو کی جمہوریت کشی۔ دی آؤٹ لک۔ ۶-۷-۷۲ء

۵۶۔ نواب خیر بخش مری۔ بلوچستان کے حالات۔ لیل و نہار لاہور۔ ۳-۶-۷۳ء

۵۷۔ میجر جنرل راؤ فرمان علی۔ سقوط مشرقی پاکستان کا پس منظر۔ اردو ڈائجسٹ لاہور۔ مارچ ۱۹۷۸ء

۵۸۔ سردار عطاء اللہ مینگل۔ بلوچستان کے حالات۔ لیل و نہار لاہور۔ ۱۱-۲-۷۳ء

۵۹۔ جنرل یحییٰ خاں۔ سقوط مشرقی کا پس منظر۔ اردو ڈائجسٹ۔ لاہور۔ جنوری ۱۹۷۹ء

۶۰۔ جناب نورالامین۔ سقوط مشرقی پاکستان کا پس منظر۔ روزنامہ جاوداں لاہور۔ ۴-۱۲-۷۱ء

۶۱۔ جناب خالد۔ ایم۔ اسحق ایڈووکیٹ۔ اسلامی حکومت میں اظہار رائے کی آزادی۔ جسارت ۱۱-۷-۸۰ء

Marfat.com

بیانات وانکشافات

۶۲۔ جناب جسٹس (ریٹائرڈ) حمود الرحمٰن ہفت روزہ اداکار۔ لاہور۔ ۲۸۔ ۸۔ ۷۲

۶۳۔ نوابزادہ نصراللہ خاں ۔ ہفت روزہ اداکار۔ لاہور۔ ۱۱۔ ۹۔ ۷۲

۶۴۔ خان عبدالولی خاں ۔ ہفت روزہ اداکار۔ لاہور۔ ۲۸ ۔ ۸ ۔ ۷۲

۶۵۔ چیف الکشن کمشنر جسٹس سجاد احمد جان ۔ روزنامہ ملت گجراتی۔ کراچی

Marfat.com

قرارداد مقاصد سے اسلامی قانون تک

ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی

طاہر سنز

Marfat.com